اُردو غزل کے بدلتے زاویے

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ

اُردو غزل کے بدلتے زاویے

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ



ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصر کی مطبوعہ کتابیں

اذفر کون ہے؟	1993ء
گلشنِ عقیدت	2001ء
ہندسوں کے درمیاں	2016ء
ادبی جمالیات	2018ء
اربابِ قرطاس وقلم	2019ء
امید سہارا دیتی ہے	2019ء
مری جستجو مدینہ (حمد ونعت)	2021ء
ہجرِ ناتمام	2021ء
آگہی	2021ء
حسن حمیدی: احوال وآثار بحوالہ ترقی پسند تحریک | (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	2021ء

تخلیقِ حمد ونعت کی تعمیری تنقید (۱۰۱ مجموعہ ہائے حمد ونعت کا تنقیدی مطالعہ)	2023ء
عصری ادب اور تنقیدی رویّے	2023ء
نگاہِ صداقت	2023ء
پرکار	2023ء
عکسِ اذہان	2023ء
منزلیں اُداس ہیں	2025ء
ستارے رقص کرتے ہیں	2025ء
اُردو غزل کے بدلتے زاویے	2025ء
عروضی قاعدہ	2025ء
سچل میرا	زیرِ طبع

الحمد پبلیکیشنز کراچی

اُردوغزل کے بدلتے زاویے

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

تصنیف : اردوغزل کے بدلتے زاویے

مصنف : ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ

کمپوزنگ : الحمد گرافکس، کراچی

اشاعت : 2025ء

تعداد : 500

قیمت : 2000روپے

طباعت : الحمد پبلیکشنز، کراچی

رابطہ:

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ

CA-35/A شاہ فیصل ٹاؤن شپ

بالمقابل سیکوریٹی پیپر، ملیر ہالٹ، کراچی

فون نمبر 34594673 -021

واٹس اپ: 0305-3426334

انتساب

ممتاز شاعر، خلائی سائنسدان اور پاکستان کے خلائی اِدارے

''سُپارکو'' کراچی کے سابق جنرل مینیجر

خیّامُ الپاک ظفر محمّد خان ظفرؔ

کے نام

جن کی محبتوں اور رہنمائی کا مَیں تہہِ دل سے ممنون ہُوں!

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصرؔ

فہرست

☆...... رومانی تحریک اور اردو غزل

☆ اُردو شاعری میں ایک نیا زاویہ: ترقی پسند

4

☆......اُردو غزل۔جدید دور

☆......اردو غزل۔معاصرین

☆......☆

اُردوغزل کے بدلتے زاویے

اُردو شاعری کا سفر قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر عصرِ حاضر تک مختلف ادوار اور بے شمار تجربات سے گذر رہا ہے اور یہ مشق ہنوز جاری ہے کیونکہ یہ ایک زندہ زبان کی خصوصیت ہوتی ہے۔اردو شاعری کے ان بدلتے زاویوں میں زبان کے نکھرنے کے مدارج، فنی و تخلیقی تجربات و مشاہدات، مختلف ادوار میں زبانوں کے رجحانات، مضامین و موضوعات جن سے متعدد اسالیب سامنے آئے ان میں کلاسیکی روایت، داخلی وخارجی تجربات، ابہام گوئی، رومانوی شاعر، قومی و ملی، شاعری، ترقی پسندیت، جدید خیالات اور مابعد جدیدیت شامل ہیں۔ یہ سفر مابعد جدیدیت دور میں بغیر کسی خطِ فاصل کے جاری تھا کہ ایک عالمی وبا ''کورونا'' کا سامنا کرنا پڑ گیا لہذا ایک دور کورونا اور مابعد کورونا کا بھی اضافہ ضرور ہوگا گو کہ کورونا عہد قدرتی آفات، مصائب و آلام، دکھ درد پر مشتمل ہوگا مگر کورونا عہد میں اردو شاعری ایک دعا، ایک آس اور ایک امید کے مابین اپنا سفر جاری رکھے گی۔اس دور میں بھی نئے موضوعات اور نئے لفظیات سامنے آئیں گے اور اردو شاعری کا حصہ بنتے چلے جائیں گے، یہاں بھی انسانی زندگی اور روزمرّہ کے عوامل پر داخلیت اور خارجیت کا عنصر اثر انداز ہوگا جس کے نتیجے میں زبان وشعر کے پیچیدہ تجربات بھی سامنے آسکتے ہیں۔ یہ تنقیدی، تجزیاتی اور احساساتی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک اور اردو شاعری کا بدلتا ہوا زاویہ ہوسکتا ہے، اس عہد میں بھی اردو شاعری وشعری لفظیات میں نئے تجربات زبان و بیان کی شائستگی، ملائمیت، فریاد و گذارشات اور رحم کی دعا جیسے مضامین در آئیں گے۔

اردوغزل کے بدلتے زاویے، ایک طالب علم کی کاوش تصور کی جائے نہ مورخ اور عالم و

فاضل کی تحریر۔ اس کاوش میں دورِ اوّلیں سے عصرِ رواں تک کے شعراء کی زندگی‘ کلام اور شعری اثاثہ نیز اندازِ سخن پر اپنی بساط کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کا تعارف‘ تاریخِ پیدائش‘ تاریخِ وفات‘ شعری و نثری تصانیف نیز اسلوب شامل کیا گیا ہے۔

اردو شاعری اپنے آغاز سے تادمِ تحریر نت نئے تجربات اور تشکیل کے مراحل سے گذرتی آ رہی ہے جس سے اردو شاعری مقبولیت کے لحاظ سے مقبول عوام وخواص کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو شاعری اپنا یہ سفر معاشرتی رسم و رواج‘ معاشرتی ناہمواریوں‘ سچے‘ جھوٹے انسانی رویوں‘ مصنوعی اور سچی آسودگی و آسائش‘ زندگی کے منفی و مثبت رجحانات‘ عشق و محبت اور ان کے نتیجے میں رقم ہونے والی داستانوں‘ عشقیہ جمالیات‘ حسنِ جمالِ یار کی باتیں‘ ہجر و فراق‘ پیاس‘ صحرا‘ جام و سبو‘ میکدہ و ساقی‘ انقلابی‘ احتجاجی و مزاحمتی رویے‘ سامراجی رویے‘ جبر و تشدد‘ استحصال‘ حالات کی نوحہ گری اور شہرِ آشوب۔ اقدار کی پامالی‘ داخلیت‘ خارجیت اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رنگ لیے مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

اب اردو شاعری تشبیب یا نسیب‘ قصیدہ یا مثنوی کے عہد سے نکل کر نئے دور میں داخل ہوچکی ہے جہاں کوشش کے باوجود غزل میں روایتی و کلاسیکی نیز رومانوی جھلک بدرجۂ اتم موجود ہے۔ غزل میں جہاں لطافتِ خیال، حسن وعشق کی باریکیاں، غنایت، نغمگی و نزاکتِ لفظی ہنوز جاری ہیں وہاں سرکشی، جوشِ خطابت، مزاحمتی و انقلابی انداز و آہنگ‘ تصوف آمیز چاشنی، رومانی جذبات مع عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی‘ وحدت الوجود‘ فنا اور بقا‘ فلسفیانہ سوچ‘ جبر و قدر جیسے مضامین اپنے خوبصورت وجود کے ساتھ اردو شاعری کا حصہ ہیں۔

اردو شاعری کے اسالیب الطاف حسین حالی‘ محمد حسین آزاد، حسرت موہانی نے غزل کے الفاظ و معانی‘ وسعتِ بیاں، اور زبان کی ندرت کو نئی شاہراہ پر گامزن کیا، غزل کے اس بدلتے زاویے میں زبان وفکر کو نئی جہت عطا کی اور کچھ لفظیات اور اصول وضع کیے مگر دوام انہی کو ملا جن کو عصرِ لسانیات وشعر وادب نے قبول کیا۔ حالی کا مقدمہ شعر وشاعری اردو شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ اصلاحِ غزل کا پہلا زینہ ثابت ہوا۔ حالی کا یہ

اعتراض تھا کہ ’’اردو شاعری صرف حسن وعشق کی شاعری ہے۔‘‘ آج کے مضامین اپنا وجود تو رکھتے ہیں مگر موضوعات اس قدر وسعت اختیار کر چکے ہیں کہ اب غزل ہر ایک موضوع‘ انداز کو اپنے دامن میں جگہ دے دیتی ہے اور خود میں سمو لیتی ہے۔

اردو شاعری موسیقی کا وہ ساز ہے کہ جس کے ہر ایک انداز میں ایک نئی معنویت ہے اور یہ معنویت تخلیق کار کے عہد سے تعلق رکھتی ہے جہاں اس کی معنویت‘ اثر گیری ماحول کے مطابق ہے۔ غزل کے ہر ایک شعر میں ایک ربط و آہنگ‘ ایک مسلسل مزاج کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ سب مربوط ہو کر فضاؤں میں ایک ایسی جلترنگ پیدا کرتے ہیں کہ عاشق و معشوق اپنے ہجر و فراق‘ لذتِ وصال‘ حرماں نصیبی کی فریاد، مایوسی کی لے‘ طربیہ والمیہ صدائیں یوں ابھرتی ہیں کہ فضائیں جھوم اٹھتی ہیں، ماحول اور اس کے انداز میں اپنے حقوق کی فریاد‘ ظلم و جبر تشدد کے خلاف مزاحمتی فریاد‘ دادرسی اس موثر انداز میں بیان ہوئیں کہ عصرِ رواں کے افراد خود کو اس مضمون اور لے کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ اردو شاعری کی زندہ دلی ہے‘ کشادہ دلی ہے جو اسے زوال پذیر ہونے نہیں دیتی۔ اردو غزل کی اس وسعت پذیری نے تخلیق کاروں کو روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کی طرف مائل کر دیا ہے اس میں روایتی مضامین کے ساتھ معاشرتی‘ سماجی‘ سیاسی و عمرانی شعور‘ ملک وملت کے نظریہ کی پاسداری نے الف لیلوی داستانوں کو پس پشت ڈال دیا ہے کہ عقلی‘ شعوری وفنی زندگی میں ان کی حیثیت ثانوی بھی نہیں رہی۔ اب غزل میں سماجی‘ سیاسی‘ انقلابی‘ سائنسی‘ خلائی‘ ایٹمی شعور نظر آتا ہے لیکن اردو غزل کے اس سفر میں تہذیبی، ثقافتی‘ تاریخی رجحانات کو اب بھی اہمیت حاصل ہے۔

میرا تعلق بینکنگ کے شعبہ سے ہے یہاں شبانہ روز کے فرائضِ منصبی کی انجام دہی کے ساتھ ’’ادبی مشقّت‘‘ بھی جاری رہتی ہے ان میں شعری کاوشیں، نثری نگارشات‘ مضامین، تبصرے، طبع زاد مضامین اور تاریخی حوالے سے تحقیقی کاوشیں اور ادبی و شعری تقاریب شامل ہیں۔

میری یہ ادنیٰ سی کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کس اہمیت کی حامل ہے‘ اس کی کوئی

وقعت ہے یا نہیں' کیا یہ اردو شاعری کے طالب علموں کے لیے مفید ہوگی' اس بات کا فیصلہ قارئین و ماہرِ انتقادیات فرمائیں گے۔اس نگارش کے حوالے سے جن احباب نے حوصلہ افزائی فرمائی میں ان کا احسان مند رہوں گا۔ان اکابرین میں محترم ڈاکٹر شاداب احسانی، ڈاکٹر تنظیم الفردوس، ڈاکٹر زکیہ رانی، ڈاکٹر فرحت عباس، خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی' رونق حیات' سحر تاب رومانی، سلمان صدیقی، مسلم شمیم' اکرم کنجاہی' پروفیسر سعید حسن قادری صاحبان شامل ہیں۔میرے انتخاب میں اہم شعراء رہ بھی گئے ہیں، طوالت سے بچنے کے لیے یہ ضروری تھا۔انشاء اللہ کسی دوسری جلد میں احاطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہاں میں الائیڈ بینک کے گروپ چیف محترم آصف بشیر' گروپ ہیڈ عدنان کمال' گروپ ہیڈ منور رضا شاہ کا ممنون ہوں جو میری ہر مرحلے پر سرپرستی کرتے رہے ہیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عالمی وبا کورونا سے محفوظ فرمائے اور اس وبا کا خاتمہ فرمادے۔

بخش دے اے خدا بخش دے
ہوگئی جو خطا ہوگئی

ڈاکٹر رانا خالد محمود قیصر

اُردو غزل بدلتے تناظر میں

ماضی' حال و مستقبل میں ہم جو کررہے تھے' کررہے ہیں اور کریں گے وہ چاہے بذریعہ صوت ہو' اشارات و کنایات ہوں یا بذریعہ گفتار ہو' یہ سب ادب کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کو مزید نکھار سنوار کر جب آپ پیش کریں گے تو جمالیاتی عناصر اور نکھر کر سامنے آئیں گے پھر لہجے میں سنجیدگی' معنویت اور موزونیت در آئے تو ہم اسے شستہ و شائستہ کہہ دیتے ہیں۔ کلاسیکیت' ایہامیت و روایتی' رومانوی' روشن خیالی یا ترقی پسند تحاریک اپنے اپنے دور' عصری اقدار سے جڑے رہنے کے باوجود تازہ اور نئے خیالات کے متلاشی رہے۔یہ شعور و فکر اور سوچ کی بالیدگی' تخلیق کار کو جدّت تک لے آئی۔تخلیق کاروں نے اس جدّت کو اپنے وجود' اپنی سوچ سے تراشا اور قارئین کے سامنے ایک پیکر پیش کیا۔نئی سوچ و فکر معاشرے میں جگہ بنانے میں گو کہ کامیاب رہی مگر بقول اکبر الٰہ آبادی

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یہ جدّت اور جدیدیت اپنے اپنے انداز میں ہمارے اردگرد بکھری ہوئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ شعور و ادراک کی نظر میں کب آئے۔۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک سے منظر عام پر آنے والی روشن خیال سوچ اپنا ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے کم و بیش ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کی اصطلاح میں ڈھلنے لگی۔ یہ جدیدیت اپنے عہد کے مسائل اور حسن کو قرطاس ادب پر منتقل کرنے کا نام ٹھہرا۔ یہ تحریک اپنا شروعاتی سفر سجاد ظہیر سے شروع کرنے کے بعد بدلتے ہوئے مناظر میں ڈھلتی رہی۔ یہ ایک فکر اور شعور کی تحریک تھی جو سیاسی، سماجی و معاشی بنیادوں پر ترقی پسند تحریک کے ساتھ چلتے چلتے اپنی لائن بدلنے میں کامیاب ہوئی اور ترقی پسند و

رومانوی اسلوب سے متصادم تو نہیں مگر سوچ اور فکری اعتبار سے مدغم بھی نہیں ہوئی اور تصادم گریز بھی نہ رہ سکی۔ مدغم اس طرح سے کہ ہر ایک سوچ کا محور انسان اور اس کے مسائل ہیں یہ تمام ادبی تحاریک میں تقریباً مماثلت رکھتا ہے۔ فرق صرف اور صرف فنی، فکری وشعوری اپچ کا ہے، اس کی بنیادی سوچ اور محرّک علی گڑھ تحریک کو قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے ارتقائی دور ترقی پسند تحریک، تقسیم ہند اور حلقۂ اربابِ ذوق سے ہوتا ہوا جدیدیت کے منظر نامے کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ یوں سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کو ادب میں جدیدیت اور جدید رجحان کا موجد و بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے افکار کی روشنی میں جلال و جمال کا حسن جمالیات کے روپ میں احساس وادراک کو نئے زاویے عطا کرتا ہے۔ اپنے ارد گرد معاشرے میں بکھرے ہوئے مسائل و محرومیت، کلاسیکیت میں بھی بیان کی گئی وہ لہجہ رومانی ہے۔ زلف، گیسو، فراق و وصال سے عبارت ہے مگر جدیدیت میں یہ روپ فطرت کے تقاضوں سے محروم افراد اور ان کی محروم زندگی کے اشارات و کنایات ان کے خواب اور خوابوں کا شکستہ ہونا اور ان جیسے حالات و مسائل سے باتیں کرنا ہے، جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہے:

سر پہ آشوب کی چادر سی تنی رکھتے ہیں
اے وطن! ہم بھی غریب الوطنی رکھتے ہیں (حسن عابدی)
بند پانی کے بھنور میں کھوگئی کشتی مری
آنکھ جل تھل تھی مگر آنسو کوئی ٹپکا نہ تھا (عارف عبدالمتین)
آئے تھے یہاں جن کے تصور کے سہارے
وہ چاند، وہ سورج، وہ شب و روز کدھر ہیں (حبیب جالب)
یہ دھوپ تو ہر رُخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ (اطہر نفیس)
ہر آنکھ کہہ رہی ہے اک درد کا فسانہ
ہر اشک لکھ رہا ہے اک قصۂ جدائی (صہبا اختر)
خوار ہوئے بدنام ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے

تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے (خلیل الرحمٰن اعظمی)
عمر کو کرتی ہیں پامال برابر یادیں
مرنے دیتی ہیں نہ جینے یہ ستم گر یادیں (وحید اختر)
سینے میں جلن آنکھ میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے (شہر یار)
میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدوں نہ دینا صدا مجھے (کشور ناہید)
موت سے کھیلے ہیں لیکن
غیر کی بندگی سے ڈرتے ہیں (پروین فنا سید)
خود آپ اپنے خوں میں نہایا نہ جائے گا
ان بستیوں کو ہم سے مٹایا نہ جائے گا (شاہدہ حسن)

اگر کلاسیکیت کی جانب نظر ڈالیں تو عشق و محبت کا جذبہ ہر ایک مصرع میں ملتا ہے۔ ہر ایک شاعر نے اس گوہرِ نایاب کو اپنی غزل میں بیان کیا ہے۔ عشقِ مجازی میں بھی عشقِ حقیقی کا گماں ہوتا ہے۔ اسے یا تو شعر کہنے والا ہی سمجھا سکتا ہے یا پھر قاری کے اپنے جذبات، فی الحقیقت عشق، رنج والم ہر ایک کی کہانی سے اس کے بغیر زندگانی کا جام خالی محسوس ہوگا

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے (میر تقی میر)

عشقِ حقیقی میں درد کا رنگ ملاحظہ ہو

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

درد و میر کے رنگِ سخن میں عشقِ مجازی بھی عشقِ حقیقی معلوم ہوتا ہے یہ دونوں شعراء حقیقی عشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ درد و میر نے اپنے رنگِ تخیل کے ذریعے

اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے ان کی شاعری میں ان کی زندگی کے نقوش اور تخیل کی فراوانی حقیقت سے قریب تر ہے۔ میر و درد کی شاعری میں نازک خیالی، سلاست، ندرتِ خیال، لفظوں کا برتاؤ، انسانی خواہشات، جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں حقیقی جذبات کی ترجمانی، موسیقیت و غنایت کے تابع رہتی ہے اس میں نہ تو کوئی تصنع ہے نہ کوئی بناوٹ بس سیدھی سادی جذبات کی ترجمانی ہے۔

آرنلڈ نے کہا تھا ”شاعری کا مستقبل بے پایاں ہے آنے والے زمانوں میں ہماری نسل شاعری سے زیادہ سے زیادہ سہارا پائے گی“ جبکہ دوسری جگہ آرنلڈ یوں گویا ہوتے ہیں ”آنے والے زمانوں میں شاعری مذہب کی جگہ لے لے گی۔“ یہ مغربی سوچ انسانی دماغ میں پیدا ہونے والی سوچ کی پیداوار ہے جو اس کی اپنے شعور و فکر کے تابع ہے۔

ایلیٹ نے روایت کے تصور کو ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کی اور وہ ماضی کی ماضیت کی موجودگی کا متحرک شعور پر ہے، اس میں شک نہیں کہ آج کی بنیاد گزرے ہوئے کل پر تھی اور آنے والے کل کی بنیاد آج پر ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل گہرا اور اٹوٹ انگ ہے اس ربط اور اس کے شعور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پھر ٹی ایس ایلیٹ یہ بھی کہتے ہیں کہ ”ہر زمانے کا ادب ہم عصر سمجھا جا سکتا ہے“ اور بقول ایلیٹ ”وہ فنکار اس لمحے میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحۂ موجود کہتے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ اس کا عرفان بھی رکھتا ہو کہ کون کون سی چیزیں مردہ اور کون کون سی چیزیں زندہ ہیں“ جبکہ ۱۹۱۹ء میں ٹی ایس ایلیٹ نے کہا کہ ”شاعری ذات کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ اس کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔“

ذرا دیکھیے شیخ ایاز کیا کہتے ہیں ”میں زندہ ہوں اس لیے شعر کہتا ہوں۔ میں شعر کہتا ہوں اسی لیے زندہ ہوں۔ میں شعر کبھی کبھار کہتا ہوں اور جب کبھی شعر کہتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میری روح ایک اُمڈتے ہوئے دریا کی مانند ہے۔ الفاظ ستاروں کی طرح میرے دل کے آنسو کے سامنے رقص کرتے ہیں۔“ یہی افکار پاسکل کے ہاں بھی ملتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ”میں موجود ہوں اس لیے سوچتا ہوں۔“

عصرِ حاضر اور ماضیٔ قریب کا تخلیق کار روایت پسندی کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی طرف مائل ہے۔ زندہ رہنے والے ادب میں مشہور نقاد کلیم الدین احمد کہتے ہیں ”اردو شاعری کو اس قدر بلند کر دیا جائے کہ یہ دنیا کی بہترین شاعری کے دوش بدوش چل سکے۔ اگر اردو شاعری کی خامیوں، اس کی تنگ دامانی پر تنقید کی روشنی ڈالی جاتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو شعراء ان خامیوں، ان تنگ دامانیوں سے واقف ہو جائیں اور ایک بہتر شاعری تخلیق کر سکیں۔ اس بات سے کسی سمجھ دار اور دیانت دار شخص کو مجال انکار نہیں کہ اردو شاعری کی موجودہ کائنات اطمینان کے قابل نہیں۔“

روایتی شاعری کے حوالے سے میر تقی میر، خواجہ میر درد، ذوق، سودا، مومن، غالب، شیفتہ، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر، ناصر کاظمی، نازش حیدری، جوہر سعیدی، اذفر زیدی اور دیگر نے جہاں روایت پسندی کو آگے بڑھایا وہیں پر اگر ہم عظمتِ خیال پر نظر ڈالیں تو غالب اپنے عہد کے روشن خیال اور جدّت پسند شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اگر غالب کے کلام کو بغور پڑھا جائے تو عصرِ غالب کے اشعار آج کے جدید دور کے نقیب معلوم ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی، آزاد، اکبر، اقبال، سیماب، چکبست، اختر شیرانی کے ساتھ ترقی پسندیت و روشن خیالی کے حوالے سے مجاز، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، خالد علیگ، سحر انصاری، حسن حمیدی جیسے شعراء نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے شعبہ جات میں ادب میں گراں قدر اضافہ فرمایا ہے، سحر انصاری کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

کسی بھی زخم کا دل پر اثر نہ تھا کوئی
یہ بات جب کی ہے جب چارہ گر نہ تھا کوئی

سحر انصاری کے یہ خیالات روشن خیالی و جدّت پسندی کی ایک روشن مثال ہیں۔ جہاں وہ اپنی تنہائی کا ذکر تو کرتے ہیں مگر مداوا نہیں سوچتے ہاں ہے تو بس عشق کی بے کسی و بے چارگی ہے کہ جب کوئی چارہ گر نہ تھا۔ یہاں ایک اور شعر کا ذکر جو میں نے اکثر مشاعروں میں بزبان سحر انصاری سنا۔ ان کا بیان کرنے کا انداز ان کی داستان کا منظر نامہ ہے جو اردو ادب میں تلاش

کرنے کے باوجود بھی شاید نہ مل سکے۔

عجب ہوتے ہیں آدابِ رخصتِ محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

اردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادب میں رومان کی فسوں کاری اتنی پرانی اور مضبوط ہے کہ جسے عالمی ادب کی بنیاد ہی رومان پر ہے۔ ہندوستان میں رومانوی تحریک گو کہ ایک عرصے تک حکمران رہی مگر ترقی پسند تحریک کے احیاء نے اسے ماند کر دیا اور ادباء و شعراء اسے نظر انداز نہ کر سکے' کہیں رومانوی تحریک کا بول بالا رہا' کہیں ترقی پسند تحریک چھائی رہی۔ یہ سفر بڑھتے بڑھتے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جدیدیت کی جانب مائل ہوتا چلا گیا، یہ ادب میں ایک حرکت کی نشانی ہے کیونکہ جب کوئی معاشرہ یا تخلیق ہونے والا ادب انحطاط کا شکار ہو جائے تو اسے ہم جمود کی حالت کہتے ہیں۔ یہ جمود ادب کے ساتھ ساتھ اقدار اور رویوں کی بھی موت ہے کیونکہ جس معاشرے میں جمود طاری ہو جاتا ہے اس معاشرے میں انسان کی ذاتی دلچسپیاں، خواہشیں، رجحانات اور احساسات دم توڑ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں تخلیق اور تخلیق کار اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کلاسیکی تحریک' رومانی تحریک' وجودیت کی تحریک' علامت نگاری کی تحریک' مارکسی تحریک' ریختہ کی تحریک' صوفی ازم کی تحریک' ابہام کی تحریک' علی گڑھ تحریک' انجمن پنجاب کی تحریک، اقبال کی تحریک، ترقی پسند تحریک' حلقہ ارباب ذوق کی تحریک' تحریکِ ادبِ اسلامی، پاکستانی ادب کی تحریک، اور ارضی و ثقافتی تحاریک، ادب کے زندہ رہنے کی روشن مثال ہیں۔ کلاسیکیت سے عصرِ حاضر تک ہمارا ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ہر ایک تحریک نے معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں اور تمام بیرونی عوامل کے اثرات کو اردو ادب نے اپنے اندر سمو لیا ہے۔

اردو شاعری نے اپنا سفر فارسی شاعری کے سائے میں شروع کیا اور رنگ و روپ کی یہ شہزادی ریختہ کی دونوں تحریکوں کے درمیان ارتقائی منازل طے کرتی رہی کبھی تھکی نہیں' کبھی ہاری نہیں۔ کلاسیکیت و روایتی تحریک سے روشن خیالی و ترقی پسندیت' رومانوی' تجریدیت'

علامت نگاری' صوفی ازم میں ڈھلتی رہی اور اپنا مقام بناتی رہی ہے روایتی شاعری سے عصرِ حاضر تک جو اسلوب نمایاں ہیں، ان میں نظریہ ارتقا' فہم و ادراک' پرانی وضع کی شاعری' نئے خیالات' نئے رویے کے ساتھ ساتھ تشدد' دنگا فساد' آمرانہ سوچ' جبر و استبداد' سیاسی قبضے اور غیر جمہوری رویے اور معاشی ناہمواری شامل ہیں۔ روایتی کے مقابلے میں ترقی پسند شاعری ایک متحرک شاعری ہے، روایتی شاعری میں خوبصورتی جمالیاتی حسن کے ساتھ موجود ہے جبکہ ترقی پسند شاعری اور جدیدیت میں بیانیہ حقیقت پر مبنی اور سائنسی اساس سے مشتق ہے حقیقت لکھنے پر یہ بھی ہوا کہ ترقی پسند شعراء و ادباء کو پابندِ سلاسل ہونا پڑا کیونکہ انہوں نے معاشی ناہمواری' تنگ نظری' غیر جمہوری رویوں' نسلی و مذہبی بے راہروی اور پیش آنے والے سانحات پر لکھا اور نئی سوچ اور غور و فکر کو اپنایا۔

ان ترقی پسند ادباء میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، رابندر ناتھ ٹیگور' احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، احمد فراز، کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد علی، سبطِ حسن، جوش' فراق، مظہر جمیل، مسلم شمیم اور حسن حمیدی جیسے گراں قدر لوگ شامل تھے۔

فیض احمد فیض کا ایک شعر ان کے اسلوب کو نمایاں کرتا ہے:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض احمد فیض کے طرزِ فغاں میں گو کہ جدّت نگاری ہے مگر فیض نے اپنا رشتہ روایتی شاعری سے کبھی نہیں توڑا اور نہ ہی عصری تقاضوں کو نظر انداز کیا۔

اردو روایتی شاعری کا محور دکن کے ساتھ دبستان دہلی' دبستانِ لکھنؤ اور ایک حد تک اودھ' فرخ آباد' اورنگ آباد کو مانا جاتا ہے۔ دبستان دہلی کے شعراء جو فارسی میں عبور رکھتے تھے وہ فارسی میں شعر کہتے تھے' ان ہی فارسی گو شعرا نے اردو میں شعر گوئی شروع کر دی۔ خان آرزو، مظہر جاناں، فائز، حاتم، آبرو اور نامی اس دور کی یادگار ہیں۔

جب دہلی کی مرکزیت کمزور پڑ گئی اور بدامنی کا دور دورہ بڑھنے لگا تو شعراء دیگر علاقوں

میں کوچ کر گئے۔ اردو شاعری میں ۱۷۵۰ء کے بعد جن شعراء نے کمال حاصل کیا ان میں خواجہ میر درد، میر تقی میر، کے دور کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں مصحفی، جرأت اور انشا کے نام سامنے آتے ہیں۔ لکھنؤ کے دیگر معتبر شعراء میں ناسخ اور آتش کے ناموں کو شہرت ملی۔

۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی کے کچھ سال گذرنے کے بعد دہلی دوبارہ آباد ہونا شروع ہوگئی اور لاتعداد شعراء کے نام سامنے آئے جن میں ذوق، مومن، غالب، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ شامل ہیں اس روایت کو حالی نے آگے بڑھایا اور مقدمہ شعر و شاعری اردو اب کو عطا کیا جس نے اردو شاعری کو ایک نیا انداز عطا کیا۔ حالی کے بعد روایت پسندوں میں شبلی، اسماعیل میرٹھی، آزاد، فانی، اصغر جیسے شعراء نے اپنی فکر انگیزی سے تہلکہ مچایا۔

جوش ملیح آبادی جیسے شاعر نے بھی غزل کی مخالفت کی ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر عبارت بریلوی کی رائے ملاحظہ ہو ''جوش صاحب نے صنف غزل کی جو مخالفت کی ہے وہ ہماری زندگی کے ایک عام باغیانہ رجحان کا نتیجہ بھی ہے جس کے زیر اثر ماضی کی ہر چیز کو لایعنی سمجھ لیا گیا ہے۔ جوش صاحب کے نزدیک بھی غزل ایک ایسی ہی صنف سخن ہے جوش صاحب کی مخالفت میں یہ جذبہ شامل ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ان کی اس مخالفت کا محرک ہوا ہے کہ غزل کی صنف شاعری کو تقلید اور نقالی کی سرحدوں میں داخل کر دیتی ہے۔ اس میں شاعر قافیہ پیمائی کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں شاعری کا بنیادی مقصد پورا نہیں ہوتا اس لیے ان کے خیال میں ایسی صنف کو ختم کر دینا چاہیے۔''

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی نظر میں ''غزل ہماری ثقافتی نسب نامہ ہے۔''

کلیم الدین احمد کے مطابق ''غزل مغربی ادب میں پھل پھول نہ سکی اس کی خاص وجہ وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جسے غزل کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔'' ایک اور جگہ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں ''غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے۔ یہی ربط اتفاق اور تکمیل تہذیب کا سنگِ بنیاد ہیں اور انہی چیزوں کی کمی کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ غزل نیم وحشی صنفِ شاعری ہے۔''

پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق ''غزل کا آرٹ اشاروں کا آرٹ ہے اور یہ اشارے

بڑی بڑی داستانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔''

جبکہ شمیم احمد کی رائے کے مطابق ''میرا دعویٰ ہے کہ غزل سے صرف وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو نہ صرف خود آگاہ ہو بلکہ تہذیبِ نفس کی بہترین سطح پر فائز ہو۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے: ''غزل نے جس انداز سے شعر کے مختصر پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے شاعری کی کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں۔''

نظیر صدیقی کی رائے ''غزل اردو شاعری کی سب سے جاندار اور سخت صنف ثابت ہوئی ہے۔ اس ''نیم وحشی صنفِ سخن'' میں تہذیب اور شائستگی کے جو نقوش ملتے ہیں وہ اردو شاعری کی کسی اور صنف میں موجود نہیں۔''

ہم اس شعری سفر کا رشتہ سماج اور اس کے مختلف عوامل سے جوڑتے ہیں کیونکہ زندہ معاشرے میں قلم اور ذہن کا رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ انسانی ذہن پیش آنے والے واقعات سے براہ راست متاثر ہوتا ہے جس کا اظہار قلم کے ذریعے کیا گیا۔ ذیل میں کلاسیکیت و روایتی شعری انداز کا جائزہ پیش خدمت ہے۔ انجم رومانی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو ترقی پسند روایت سے بھرپور لہجہ رکھتے ہیں مگر کلاسیکی روایت سے بغاوت بھی نہیں کی:

کہنے کی ہے جو بات وہ آتی نہیں لب تک
یہ صورتِ حالات رہے دیکھیے کب تک
کیا کچھ نہ گزر جائے گی تا صبح دلوں پر
یہ رنگ ہے گو شام سے تاریکیٔ شب تک

اختر شیرانی: شاعر رومان ہیں۔ وہ تمام عمر محبت کی خیالی محبوباؤں عذرا، سلمیٰ کی تلاش میں سرگرداں رہے:

محبت ابتدا میری محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے بقا میری فنا میری
محبت آرزو میری محبت جستجو میری
محبت خامشی میری محبت گفتگو میری

☆

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں جب شاعری' قصہ گوئی اور قصیدہ گوئی پر مبنی تھی' یہی تشبیب کی علامت تھی ۔عربی و فارسی سے متاثر ہو کر ہندوستانی شعراء نے جو عربی و فارسی زبانوں سے خاصی دوستی رکھتے تھے، فارسی و مقامی زبان کی آمیزش سے کلام کہنا شروع کیا۔ سو ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان میں گو کہ قصیدہ نہیں تھا کہ جو عربی زبان سے در آیا ہے، اسی مناسبت سے قصیدہ ہجرت کرتا ہوا عربی سے فارسی میں وارد ہوا ہے بس یہ بات درست ہے کہ غزل فارسی اور اردو زبان کی زینت ہے ۔فارسی اور ہندوی کی آمیزش ریختہ کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے یہی وجہ ہے کہ ولؔی اور دیگر دکنی شعراء کی تخلیقات میں ہندوی اور فارسی کی آمیزش غزل کے ابتدائی خدوخال کی بنیادی دستاویز ہے۔

اردو غزل کا یہ سفر اپنے آغاز و ارتقاء میں کئی ایک ثقافتوں اور تہذیبوں کے اقدار و انسانی رویوں سے نبرد آزما رہا ہے جن میں سماجی و معاشی عوامل باہم پیوست نظر آتے ہیں ۔فارسی اور ہندوی کی آمیزش سے بھرپور سفر جب اورنگزیب عالمگیر کے دور میں داخل ہوتا ہے تو فارسی و ہندوی کے زیرِ سایہ رہ کر نئی راہیں اپناتا ہوا دکنی ادب کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور یہ آمیزہ ریختہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے، یوں غزل کی بنیاد میں ایک طلائی اینٹ کا اضافہ قرار پاتا ہے اور اردو غزل کا سفر کچی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا نسبتاً ہموار رہ گزر تک آ جاتا ہے اور یہ رنگ ہی بعد میں آنے والے شعراء کے رنگِ سخن میں بھی نظر آتا ہے، یہ وہی دور ہے جہاں عبدالرحیم خان خاناں کی طرح کئی ایک شعرائے کرام نے اپنی طبع آزمائی کو نئے میلان کی جانب مائل کیا غرضیکہ اردو زبان کی ترقی' ارتقاء' ترویج و اشاعت میں دلّی کا اہم کردار رہا ہے ۔جب ہم مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور سے راج مان سنگھ کا کردار اور مغل محلات میں راجپوت رانیوں کا دور دیکھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دہلی کے قرب و جوار میں بسنے والے اور محلات اور بادشاہی امور میں حصہ لینے والے بھی اس نئی زبان کی تشکیل کا باعث بنے۔

زبانوں کی تشکیل' ٹوٹ پھوٹ اور نئی زبانوں میں ڈھلنا ایک تاریخی عمل ہے ۔اگر مسلمان ہندوستان کو فتح نہ بھی کرتے تو بھی ہندوستان میں کسی نہ کسی زبان کو جنم لینا تھا۔ مسلمان فاتحین کے دور میں زبانوں کی تشکیل کا کام ذرا تیز ہوا۔ پروفیسر محمود شیرانی کے مطابق ''مسلمان اقوام نے ہندوستان میں اپنے لیے ایک زبان مخصوص کر لی ہے اور جوں جوں ان کے مقبوضات فتوحات کے ذریعے سے وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں' یہ زبان بھی ان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیلتی جاتی ہے۔'' شہنشاہ جلال الدین اکبر نے جب راجپوتوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس کے نتیجے میں مغل اور راجپوت خاندانوں میں قربتیں بڑھیں اور بات شادیوں تک آن پہنچی ۔یوں مختلف مناصب راجپوتوں کو عطا کیے گئے ۔جلال الدین اکبر نے اس دور اندیشی کو بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے راجپوتوں کا ساتھ از حد ضروری ہوگا۔ اگر جائزہ لیا جائے تو یہ سامنے آتا ہے کہ سلاطین دہلی کے ادوار میں فوجی لشکر کے لیے لوگ انبالہ' کرنال' رہتک' حصار اور میوات کے علاقوں سے بھرتی کیے جاتے تھے جو راجپوتوں کا مسکن تھا سو ہم راجہ مان سنگھ کے دور سے شروع ہونے والی کاوش بشمول اکبر کے زریں دور کو نئی لسانی تشکیل کا تسلسل قرار دے سکتے ہیں ۔اگر ہم اسی بیانیہ میں چلتے رہے تو یہ بات '' تاریخِ اردو ادب'' رام بابو سکسینہ یا '' تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کے کتابچہ میں ڈھلنا شروع ہو جائے گی' یہاں مقصد صرف اور صرف اردو غزل کا جائزہ' بدلتے تناظر میں ہے ۔زبانوں کی تشکیل اور خصوصیات ایک الگ موضوع ہے یہاں ہم اردو غزل کو درج ذیل تناظر میں دیکھیں گے۔

۱۔ابتدائی عہد بشمول شمالی ہند
۲۔برصغیر پاک و ہند میں غزل اور صوفیائے عظام
۳۔ایہام گوئی کا دور اور ردِ ایہام گوئی
☆......میر و سودا کی شاعری۔☆......رومانوی تحریک۔☆......ترقی پسند تحریک
☆......دورِ جدیدیت ۔☆...... مابعد جدیدیت
☆......عصرِ حاضر کی غزل

غزل کا ابتدائی دور۔شمالی ہند

اُردو کی پیش رفت سترھویں صدی کی ابتدا سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ جب گجرات کو شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر نے فتح کیا تو اس وقت کے گوجری لکھاری قریبی ریاستوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کا پڑاؤ قریبی دکن کی ریاستیں تھیں، وہاں کے حکمرانوں نے ان ادباء کی سرپرستی کی اور نئی زبان کی تشکیل کی مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اس دور میں شیخ احمد گجراتی کا نام سامنے آیا جس نے محمد علی قطب شاہ کے حضور اپنی طویل مثنویاں، یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں پیش کیں۔ یہ اردو کے لیے مضبوط پیش رفت تھی اور شاہانِ بہمنی اور قطب شاہی دور میں اردو نے مختلف مدارج طے کیے ذیل میں ہم اس دور کے شعراء کا جائزہ مرتب کرتے ہیں۔

☆...... قطب الدین قادری فیروز (فیروز بیدری)

اردو شاعری کی آبیاری کرنے والے فیروز بیدری کا تعلق بیدر سے ہے، وہ ہجرت کر کے گولکنڈہ گئے۔ یہاں انہوں نے بطور شاعر بہت شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے ان کی مدحیہ مثنوی ''پرت نامہ'' دریافت کی۔ فیروز بیدری کے کلام میں ابتدائی عہد کا رنگ نمایاں ہے۔ اس مدحیہ مثنوی سے چند اشعار:

بڑا پیر مخدوم جی جگ منے (جگ منے: جگ مانے)
منگیں نعمتاں معتقد اِس کنے (منگیں۔ مانگیں اور اس کنے: اس سے)

☆

محبت کے دریا میں غوّاص توں
کہ سب موتیاں میں رتن خاص توں (دکنی رنگ)

☆

سو مخدوم جی پیر فیروز کا
نگہباں فرداوامروز کا (فارسی کا رنگ غالب ہے)

فیروز بیدری کی ایک غزل سے چند اشعار

یاقوت تے سرنگی دو لعل ہر ادھر تجہ
کیوں کر عقیق ہوں گے اس رنگ کے یمن میں
تیری کمر کی ہادی سِکھ سِکھ ہوا جو دبلا
جئوں تار پیرہن کا ' یہ تار پیرہن بن

☆

جس بزم میں بھی جھمکے میرا جو چاند سب نس
روتا اچھوں و جلتا جئوں شمع انجمن میں
(اچھوں۔ ایسے اور جیوں۔ جیسے)

یہی انداز آگے چل کر اردو کی بنیاد بنا اور ارتقا پذیر ہوا۔

ملا خیالی:

ملا خیالی فیروز بیدری کے ہم عصر تھے۔ ان کی طبع آزمائی میں فیروز سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ خیالی دور کی شاعری اردو کی بنیادی شاعری کا درجہ رکھتی ہے:

نمونہ کلام:

سنسار کے چتارے لکھنے ملیں ہیں سارے
مکھ دیکھ سارے گم ہو رہے ہیں اپن میں

☆

فارسی میں ہے ہلالی' ترکی میں ہے جمالی
دکھن میں ہے خیالی ہے شاعری کے فن میں

عصرِ حاضر کی طرح خیالی کو بھی اپنی شاعری پر ناز تھا' وہ خود کو استادِ سخن سمجھتے تھے۔

☆...... **محمد قلی قطب شاہ (۱۵۶۵ء۔۱۶۱۱ء بمطابق ہجری ۹۷۳ھ تا ۱۰۲۰ھ)**

ہندوستان میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کا دورِ دورہ تھا جبکہ گولکنڈہ میں والئ ریاست محمد قلی قطب شاہ براجمان تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور کو اردو غزل کا سنہری دور کہا گیا ہے۔ ان کا اردو شاعری کا ضخیم دیوان تقریباً پچاس (۵۰) ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار
دھرے وصف اپس سو کہن ہوت عار

محمد قلی قطب شاہ غزل کے ساتھ ساتھ نظم بھی لکھتے تھے جس میں عام آدمی سے باتیں اور قدرت کے مظاہر کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے:

تن ٹھنڈت لرزت ' جوبن گرجت
پیا مکھ دیکھت کنچکی کس بکسے آج
ناری مکھ جھمکے جیسے بجلی
انجل پاوک میں تیسے اُس لاج

قطب شاہ کی شاعری کے مضامین میں مذہبی عنصر بھی نمایاں ہے وہ اپنے اشعار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، اقدس کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جبکہ ہندوستان میں دیگر تہوار' ہندو مسلم رسومات کا بیان بھی کرتے ہیں ملاحظہ ہو

صدقے نبیؐ کے قطب شہ جم جم کرو مولود تم
حیدر کی برکت تھی سدا جگ اُپر فرمان کرو

☆

نبیؐ صدقے قطب شاہ تانیں جم جم
سہاویں رنگ بھرے حسناں سہاتی

ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادبِ اردو میں فرماتے ہیں کہ '' محمد قلی قطب شاہ حسن کا شاعر ہے۔ وہ روایتی پابندی جو تخیّل کے لیے ضروری ہے' اس کے ہاں نہیں ہے مگر غزلوں میں وہ فارسی اور حافظ کے زیرِ اثر روایت کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ اس کے عشق میں دردو غم' آہ و بکا' اضطراب و ناکامی نہیں ہے۔ اس کا عشق طرب آمیز ہے۔ طلبِ وصل کی خواہش بھی چونکہ جلد ہی پوری ہو جاتی ہے اس لیے اس میں وہ گہرائی نہیں ملتی جو فراق سے پیدا ہوتی ہے۔'' قطب شاہ چونکہ والی گولکنڈہ تھے لہٰذا ہجر و فراق کی صورت سامنے نہیں آئی۔ محفلِ طرب و نشاط میں ڈوبے ہوئے حکمران کا ہجر و فراق سے کیا مطلب۔

قطب شاہ کے اشعار:

پاتاں کی نزاکت بن شاعراں نہ پوچھیں
دنیا فدا قطب کوں گفتار کا متاع

☆

تمہارا حسن سو قدرت تھی روشنی پایا
حوراں کا حسن ترے حسن انگے جیسے چراغ
شراب پھول کھلے تیرے باغِ نوخط میں
پلاتوں ساقی سرمست منج کوں یک دو ایاغ
برہ کا پاؤ منجے باورا کیا ہے اب
صبا کا پاؤ معطر کریں تو میرا دماغ
معانی شکر خدا کر' نہ کرتوں غم ہرگز
نبیؐ کے نانوں تھی آتا' تو مجھے خوشی کا سراغ

☆...... **ملا اسد اللہ وجہی (۱۰۷۰ھ۔متوفی ۱۰۸۹ھ)**

ملک الشعراء دربارِ قطب شاہی ملا اسد اللہ وجہی گولکنڈا کے ادبی افق پر وہ روشن ستارہ ہے جس نے فارسی اور اردو شاعری میں نمایاں خدمات انجام دیں اور نثر نگاری میں بھی اپنا لوہا

منوایا۔ان کی تصانیف میں قطب مشتری‘ سب رس اور مرثیہ یادگار ہیں۔وجہی کی نثر میں غزل کی آمیزش ملتی ہے:

تج مکھ کے درس کا یوسورج سودرسنی ہے
تج نور جھمکنے تھے سب جگ میں روشنی ہے

قطب مشتری سے چند اشعار:

جداں تے جو پیدا ہوا ہے یو جگ
پرت کوئی چھپا نہیں سکیا آج لگ
محبت لگیا ہے جیسے پیو کا
نیں کوچ پروا اسے جیو کا
یہاں بادشاہی غلامی رہے
یو بدنامی نیں نیک نامی رہے
سوہانی ہے رسوائی یاری منے
کہ عاشق کوں عزت ہے خواری منے
محبت میں ہوتا جہاں جگ امیر
برابر ہے واں بادشاہ ہور فقیر

ملاوجہی کی تخلیق کردہ سب رس اردو نثر میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے لہجے میں کھڑا پن ہے یہ لہجہ ہریانوی زبان سے بھی مماثلت رکھتا ہے۔اسی لہجے میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

تیرا ہور میرا سو یک حال ہے
دو مچھلیاں کوں یک جال ہے

ملاوجہی کی تخلیق ''سب رس'' لسانی تشکیل وارتقاء کی ایک اہم کڑی ہے۔وہ ہندوستانی اردو کی بنیاد میں شمار ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملاوجہی کی اردو کو اردو نثر کا بانی مانا گیا ہے۔ملاوجہی

نے سب رس اور قطب مشتری جیسی مایہ ناز تصانیف تخلیق کر کے آنے والے ادباء کے لیے طبع آزمائی کی راہ کو وسیع کیا اور اردو زبان کا اسلوبی رنگ وآہنگ نکھرتا چلا گیا۔

☆...... علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ۔۱۰۸۳ھ......۱۶۵۶ء۔۱۶۷۲ء)

یہ دکنی شہزادہ سلطان محمد عادل شاہ کی اکلوتی اولاد تھی ان کی پیدائش اس دور میں ہوئی جب حسن وعشق کی شاعری کا چرچا پورے دکن میں پھیلا ہوا تھا۔اس دور کا ہر ایک شاعر اس میدان میں نت نئے مضامین کے ساتھ غزلیں کہہ رہا تھا۔ان کا ایک لقب ''استادِ عالم'' بھی تھا۔یہ فارسی میں بھی کلام کہتے تھے اور شاعری میں تخلص شاہی کرتے تھے۔غزل کے ساتھ ساتھ قصیدے مثنویاں‘ مراثی‘ گیت‘ کبت اور دوہرے (دوہے) بھی کہتے تھے۔نصرتی چونکہ درباری ملازم بھی تھا اور ایک اچھا شاعر بھی لہٰذا امکان غالب ہے کہ وہ اتنی اصلاح کر دیا کرتے تھے جیسا کہ اصلی کلام کو قلم زد کر کے اپنا رنگ شاملِ کلام کر دیا ہو۔شاہی کا ایک انداز ملاحظہ ہو:

پریت کی ریت سوں موہن کیے نیل ہنس سو شاہی
عجب شہرت ہوئی جگ میں ہماری عشق بازی کی

ان کی شاعری میں جمالیات ولمسیات کا عکس نظر آتا ہے جس میں وہ تشبیہات میں عورت کے جسم کے نشیب وفراز اور حسن دل کش کی منظر نگاری کرتا نظر آتا ہے ملاحظہ ہو:

سیشا شراب کا یوں دِستا ہے سرخ رنگ میں
گویا شفق میانے خورشید ہے ضیا کا
دسے سج نینن میں اس حوض پہ چند نالو نچھل
دھریا ہے چاند نیں جیوں ٹپک آپس مک کے اکل
فوارہ حوض میں نادر سہاوے روپ میں
گویا جیون نال کے اوپر کھلا ہے جل میں کنول
جنے اس نیر کو چاکھیا سو اٹھا بول کہ یوں
گویا جوں شہد و لبن نے پھریا ہے حوض کا نل

شاہی کے دور میں اردو شاعری نے بہت ترقی کی۔اس کی سب سے بڑی وجہ خود بادشاہ کا صاحبِ سخن و شاعر ہونا تھا۔نصرتی بھی اسی دور کا شاعر گزرا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہی بذاتِ خود ایک صاحبِ دیوان شاعر تھا۔

☆...... محمد نصرت نصرتی (وفات ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء)

بیجاپور کے عظیم المرتبت شاعر محمد نصرت نصرتی دکنی ادب کے ایک روح رواں تھے۔یہ ایک زود گو اور کثیر الجہتی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔قصیدہ نگاری اور مثنوی پر کمال رکھتے تھے۔شاہی کے دربار میں اثر ورسوخ ورسائی کی اصل وجہ ان کی شاعری اور فن حرب سے تعلق تھا۔

نصرتی نے گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخِ اسکندری جیسی مثنویاں لکھ کر خود کو تاریخ مثنوی گویان میں امر کر لیا۔تاریخ اسکندری کا دوسرا نام ''فتح نامہ بہلول خان'' بھی ہے۔نصرتی کے اسلوب میں عورتوں کی زبان میں بات کرنا بھی شامل ہے جو ریختی کی بنیاد بنی بعد میں یہ صنف وقت کے ساتھ ساتھ خوب پھلی پھولی۔نصرتی کے کلام کا انداز ملاحظہ ہو:

حیات بخش لیا بوسہ تجھ کو شکر لب کا
کہ تجھ ادھر نے میرے جیوں کوں بھر کے دان کیا
پکڑے پہ دل الگ سوں کو چپ بھواں کو تان
سہڑے شکار پر تو چڑانی کمان کیا

☆

یوں تا تیاں کا بار ہے تجھ ناف پر ڈھلک
زم زم کے جوں کوئے پہ لگی رہٹ کی گھڑی

☆

وہیں قبض کرنے شتابی کیا
ہور یک پل منے فتح یابی کیا

☆

قلم ہے میرا مست ہائی نے چڑ
جدھر رخ کیا فتح کیتا نگر

نصرتی کی رنگین مزاج شاعری کی جھلک ملاحظہ ہو:

تیرے او نار پھل پر ہت دھریا تو توڑ لیوں نا
منجے اتنا بھی حاصل کیا نہ ہوتا تجھ جوانی کا

محولہ بالا شعر سے نصرتی کی رنگین مزاجی اور خیالی رنگ رلیاں منانے کا تصور سامنے آیا ہے یا پھر یہ شاعری بادشاہ وقت سے داد وتحسین بٹورنے کے لیے کی گئی ہو۔

☆...... سید میراں میاں خان ہاشمی (متوفی ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء)

ہاشمی کا تعلق علی عادل شاہ ثانی المتخلص شاہی کے عہد سے ہے۔وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے غزل۔مثنوی اور قصیدہ تصانیف میں شامل ہیں تخلیقات میں ذیل کی نگارشات شامل ہیں:

☆مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوی
☆معراج نامہ
☆مثنوی عشقیہ
☆مثنوی یوسف زلیخا
☆دیوانِ ہاشمی (دیوان غزلیات طبع ہوا ہے)

ہاشمی کا لہجہ اپنے وقت سے ہم آہنگ ہے جو کہ اردو غزل کا ارتقائی مرحلہ ہے:

سکت کاں ہے اتنی بیادار میں
کروں وصف ہاشم کے اظہار میں
اس کیچ گھر کا میں سرفراز
اونے ہاشمی مجہ کو بولیا نواز

ہاشمی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو بیان کرتے ہیں روانی سے بیان

کرتے ہیں۔ ہاشمی کے ہاں بھی رنگینیت کو ایک خاص مقام دیا گیا ہے۔عورتوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ان کے پہناوے' اداؤں اور جسمانی نشیب وفراز کا ذکر کرتے ہوئے وہ ریختی کے نقیب لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہاشمی نابینا تھا مگر انداز کلام اور بیانیہ یہ بتاتا ہے کہ وہ صاحبِ بصارت تھے:

تعجب یہی ہوئے گا ٹھار ٹھار
انکھیاں نیں پرویا ہے موتیاں کا ہار
تعجب بھی ہوئے گا یوں چار دہر
انکھیاں میں کیا کیوں سو دریا کون نہر

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ''ہاشمی بیجاپور کا آخری بڑا شاعر ہے جس نے دکھنی زبان کو اظہار کی نئی سطح دے کر اپنی شاعری میں محفوظ اور ساتھ ساتھ اسے جدید اسلوب سے قریب تر بھی کر دیا۔'' ہاشمی نے اپنی شاعری میں وہی لہجہ اپنایا جو اس وقت کے معاشرے کا تقاضا تھا ابھی بھی اگر یہ کلام محفل میں پڑھا جائے تو ماحول کی رنگینی کا احساس ہوتا ہے کہ معاشرے میں اخلاقی باختگی کس حد تک گر چکی تھی۔ ذیل کا بند ملاحظہ ہو:

گوری کا رنگ گورا چولی بنفشی زر کی
لگتی ہے ال چولی کیا خوب پر تہ بند پر
دکھلا کے سب زرینہ کیا جانے کیا کرے گی
دیکھت اڑنے ہلنا نتھ کی تری لڑی کا

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ''ان اشعار میں بھی جنبش وحرکت کے جو احساس رنگوں کی جو تمیز' جسمانی خطوط کے تیکھے پن کا جو اظہار اور دیکھنے کا جو شعور ملتا ہے وہ کسی مادرزاد اندھے کی شاعری میں بار نہیں پا سکتا۔'' اسی مناسبت سے ہاشمی کی ریختی کا بے باکانہ رنگ ملاحظہ ہو:

پیا ایسے میں آئے تو گلے لگ کر گرم ہوں گی
گرم میں اب کے ہوؤں گی دو دانا دان ٹھنڈ کالا

☆...... ولی دکنی (۱۶۶۸ء......۷اکتوبر ۱۷۰۷)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے (ولی)

ستر ہویں صدی عیسوی میں ولی دکنی کا نام اردو ادب کے زرین عہد کی یادگار ہے۔ اردو شاعری تقریباً دو سو سال کا سفر طے کر چکی تھی اور دن بہ دن سنور رہی تھی' پسند کی جا رہی تھی کیونکہ ڈرائیڈن حالات حاضرہ پر شاعری کر رہے تھے جبکہ برصغیر ہند میں ولی دکنی اُس دور کے تہذیب وتمدن کے تحت اپنی فطری طبع آزمائی کے ذریعے اردو غزل کو سنوار رہے تھے۔ ولی نے غزل کے کینوس کو بہت وسیع کیا اور غزل کے لہجے کو عوام الناس کی زبان بنا دیا۔ ملاحظہ ہو:

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین' غزالاں سوں کہوں گا

فارسی اور ہندوی کی آمیزش سے ولی نے غزل کو ایک نیا اسلوب دیا اس اسلوب کو ریختہ کے نام سے موسوم کیا گیا اور شعراء نے فارسی کو رفتہ رفتہ ترک کرتے ہوئے اردو غزل کو قدیم دور سے جدا کرتے ہوئے نئی غزل کے در وا کر دیئے۔

ولی کے اسلوب میں جہاں مروج غزلیہ مضامین شامل ہیں یعنی عورت سے باتیں، وصل وانکار' حسن وجسم جیسے موضوعات مگر ولی نے ان مضامین کو ترک نہیں کیا بلکہ ولی کی شاعری میں عشقیہ انداز میں ایک شائستگی کا عنصر شامل ہے سنجیدگی ہے ضبط ہے ٹھہراؤ ہے۔ حسن وعشق میں کھو کر محبوب کے جسم وجاں کو زیر بحث لانا ولی سے قبل کے شعراء میں محبوب مشغلہ تھا مگر ولی نے اپنی عاشقانہ روش اور حسن وعشق کے سلسلۂ بیان کو ایک کیفیت میں ڈھال کر بیان کیا ہے کہ بوالہوسی کا عنصر پس پشت چلا گیا۔

''ولی کا عشق خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس نے ''عشق مجاز'' کے ان تمام پہلوؤں کا تجربہ حاصل کیا ہے جو ہند ایرانی روایت کے مطابق عشق کی پہلی منزل ہے

درِ وادیٔ حقیقت من نے قدم رکھا ہے
اوّل قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

اوراس کے بعداس عشق کے سرے عشقِ حقیقی سے ملا دیئے:

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے
کہ فن عاشقی عجب فن ہے

(ڈاکٹر جمیل جالبی۔تاریخ ادبِ اردو)

ولی کی شعری کاوشوں نے اردو شاعری کے مستقبل کے امکانات کا وسیع راستہ عطا کیا۔
نمونہ کلام:

زندگی جام عیش ہے لیکن
فائدہ کیا اگر مدام نہیں

اب جدائی نہ کرٗ خدا سوں ڈر　　بے وفائی نہ کرٗ خدا سوں ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل　　آ جدائی نہ کر، خدا سوں ڈر

ایسا بسا ہے آ کر تیرا خیال جیو میں
مشکل سے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر یک بچن　　رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

اے نور جان و دیدہ، ترے انتظار میں
مدت ہوئی پلک سوں پلک آشنا نہیں

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کو
ہے مطالعہ مطلعٔ انوار کا

ولی دکنی کی شاعری سلاست وروانی کی جانب رواں دواں نظر آتی ہے۔آپ نے اپنی شاعری میں تشبیہات واستعارات استعمال کیے ہیں۔اردو شاعری میں ولی دکنی کا ایک مقام

20

ہے جس طرح مغربی ادب میں ڈرائیڈن کو حاصل ہے۔

☆......سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۸ھ۔۱۱۷۷ھ۱۷۱۵ا۔۱۷۶۳ء)

تصوف کی سرپرستی سے بے خود سید سراج الدین سراج اردو شاعری کا ایک بڑا نام اوردکنی غزل کے آخری سرخیل ہیں جن کی شاعری میں دکنی رنگ کا غلبہ ہے۔انہوں نے قصائد، ترجیع بند، مخمسات ورباعیات اورغزل کے ساتھ ساتھ مثنوی کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے جو دکن کی تاریخِ ادب میں امر ہو گئے۔

مثنوی بوستانِ خیال (۱۹۷۳ء) تخلیق کی۔کلام میں سادگی ہے۔شاعری کے مضامین میں حسن وعشق اورتوحید ومعرفت ملتے ہیں۔ریختہ کے اعتبار سے ولی کے مقلد ہیں۔سراج کی ایک مشہور غزل سے چند اشعار:

خبر تحیر و عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درسِ نسخۂ عشق کا
کہ کتابِ عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

سراج نے روایتی انداز میں عشقِ حقیقی وعشقِ مجاز میں کلام کہا مگر عشقِ حقیقی کا رنگ غالب ہے ان کے اظہاریہ میں جذبات واحساسات پر گرفت نظر آتی ہے اورانداز شگفتگی وتازگی لیے ہوئے ہے کہتے ہیں کہ

میں وقت پا کے اس کو سناؤں گا یہ غزل
دردِ دل سراج مگر کچھ اثر کرے

☆

جل گیا شوق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

☆

اے سراج ہر مصرع درد کا سمندر ہے
چاہیے سخن میرا آگ میں جلا دیجیے

☆

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

سراج کی شوخی، وارفتگی اور رنگینی بھرا مزاج ملاحظہ ہو:

یار کی وضع بے حجابی ہے
شوخ ہے مست ہے شرابی ہے
وہ زلفِ پر شکن لگتی نہیں ہے ہات
مجھے ساری پریشانی یہی ہے
عجب وو مو کمر خورشید رو ہے
نزاکت جس کے قدموں میں مو بہ مو ہے

عشق وحسن کے بعد تصوف سراج کا محبوب مضمون ہے ان کے ہاں حقیقی واردات قلبی کا غلبہ ہے کہتے ہیں کہ

کسی کو رازِ پنہاں کی خبر نہیں
ہماری بات کوں ہم جانتے ہیں
شرابِ معرفت پی کر جو کوئی مجذوب ہوتا ہے
در و دیوار اُس کو مظہرِ محبوب ہوتا ہے

سراج کی مشہور مثنوی بوستان خیال میں تصوف کا ایک انداز ملاحظہ ہو جہاں عشق کی

لہران کے کلام میں رواں دواں نظر آتی ہے

ارے ہم نشینو! مرا دکھ سنو — مرے دل کے گلشن کی کلیاں چنو
مرے پر عجب طرح کے درد ہیں — کہ سب درد اس درد کے گرد ہیں
کیوں کیا کلیجے میں سوراخ ہے — مری داستاں شاخ در شاخ ہے
اگر سنگ بھی حال میرا سنے — تو حیرت سے چکرت میں جا سر دھنے

محولہ بالا کلام کی روشنی میں سراج کی شاعری ولی کے بعد ایک واضح مثال بن گئی جس کی پیروی سالوں کی گئی۔

☆......☆

برصغیر پاک و ہند میں غزل اور صوفیائے عظام

غزل اپنے موضوعاتی ہیت کے اعتبار سے عرب و فارس کے صحراؤں اور مرغزاروں سے ہوتی ہوئی پاک و ہند میں وارد ہوئی۔غزل بنیادی طور پر قصائد کے گرد گھومتی رہی ہے عرب کی سرزمین سے شروع ہونے والی عشق اور معشوق کے جذبات،حالات اور واقعات سے اٹکھیلیاں کرتی رہی۔مطلب یہ کہ حسن،عشق اور معشوق کی صفات کا ذکر ہی غزل کی بنیاد ٹھہری۔

برصغیر میں ہند آریائی زبانوں کا ارتقاء ایک وقیع موضوع ہے۔عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، ریختی یا ریختہ کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی ایک زبان ۱۰۰۰ء تک آتے آتے اپنے خدوخال بنانے کی کوشش میں مصروف عمل رہی۔ یہ علاقہ فاتحین کی زد میں رہنے کی وجہ سے مختلف تجربات سے گزرتا رہا۔ یہاں کی مقامی زبانیں اپنا وجود کھونے لگیں اور ہندوستان میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ گئی۔حملہ آور اور فاتحین اپنے لشکر کے ساتھ کئی مخلوط زبانیں بھی لائے جن کا کوئی نام و نسب یا شناخت نہیں تھی۔ان حملہ آوروں اور حکمرانوں کے دور میں زبان کی داغ بیل میں کچھ الفاظ مقامی زبان میں داخل ہوئے اور کچھ کو ترک کر دیا گیا۔اور یوں ایک زبان کو ہندوی کی شناخت ملی۔

قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش، محمد غیاث الدین بلبن کے دور میں مسلم حکمرانی بہت وسیع ہو چکی تھی اور مسلم حکمرانوں کا پرچم شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں لہرانے لگا تھا۔اس دور میں مقامی زبانیں برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی اور راجھستانی بولیاں تھیں جو بعد میں نکھر کر اور ارتقائی مدارج طے کر کے اردو کی بنیاد بنیں مگر اس مسلم حکمرانی کے دور میں سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔

اسلامی سلطنت میں چونکہ دین کی طرف توجہ زیادہ رہتی تھی لہذا اس دور میں علماء و صوفیاء کرام کا کردار زبان کی ترویج و اشاعت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔وہ فارسی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کو بھی اہمیت دیتے تھے تا کہ اپنے دین کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں۔مولوی عبدالحق اس دور کی صوفیائے عظام کی خدمات کو ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' شائع شدہ انجمن ترقی اردو ۱۹۹۵ء میں صفحہ ۹۶ پر یوں احاطہ کرتے ہیں:

> ''ہندی یا اس نومولود زبان میں لکھنا اہل علم اپنے باعثِ عار سمجھتے تھے اور وہ اپنی عالمانہ تصانیف کو اس حقیر اور بازاری زبان کے استعمال سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ صوفی تھے جنہوں نے سب سے پہلے جرأت کی اور اس کفر کو توڑا۔اصل صوفی ظاہری رنگ و عار سے بالا ہوتا ہے اس نے پھر ایک بار یہ دکھایا کہ حقیر سے حقیر چیز سے بھی کیسے کیسے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ یہ صوفیوں ہی کی جرأت کا فیض تھا کہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی جو پہلے ہچکچاتے تھے، اس کا استعمال شعر و سخن، مذہب و تعلیم اور علم و حکمت کے اغراض کے لیے شروع کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ میں ان صوفیائے کرام کو اردو کا محسن خیال کرتا ہوں۔''

گیارہویں صدی عیسوی میں اردو نام کا کوئی خدوخال تو نہ تھا مگر ہندوستانی زبان ایک ارتقائی مراحل سے گذر رہی تھی جس میں دینی سوچ رکھنے والے صوفیائے عظام پیش پیش تھے۔ اس دور اور مستقبل میں تخلیق کیے جانے والے ادب پارے اس بات کے گواہ ہیں کہ پیش رفت جاری تھی اور فارسی اور ریختہ کی شکل میں اکا دُکا ادب پارے اردو غزل کے ابتدا کی نشاندہی کر رہے تھے اور یہ ادبی شہ پارے اردو شعری سفر کے اوّلین نقوش تھے۔اس دور میں جن صوفیائے کرام نے نئی زبان کی داغ بیل اور احیاء کے لیے کام کیا اس میں ذیل کے علماء شامل ہیں:

☆...... خواجہ مسعود سعد سلمان (۴۳۸ھ تا ۵۱۵ھ/ ۱۰۴۶ء تا ۱۱۲۱ء)

دستیاب حوالہ جات کی رو سے آپ کا شمار ہندوی اردو کے پہلے غزل گو شاعر کے طور پر ہوتا ہے۔آپ کا وطنِ مالوف لاہور تھا۔آپ نے غزل، قصیدہ، رباعی اور قطعات میں طبع

آزمائی کی نیز ایک ماہر خطاط بھی تھے۔ آپ کے جد امجد کا تعلق ہمدان سے تھا۔ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے مابین تقریباً دوسوسال کا عرصہ ہے مگر تاریخ خاموش ہے کہ اُس دور میں ہندوی ادب پر کیا کام ہوا؟

☆......شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (۵۶۹ھ تا ۵ محرم ۶۶۴ھ؍ ۱۹ جون ۱۱۸۳ء تا ۱۲۰ اکتوبر ۱۲۶۵ء)

بارہویں صدی عیسوی کے مشہور صوفی بزرگ ملتان سے دس کیلومیٹر دور کھترال میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ اور مرید تھے۔ آپ کے والد اس وقت انتقال کر گئے جب آپ کی عمر محض پانچ سال تھی۔ آپ کی تربیت آپ کی والدہ قدسم خاتونؒ نے کی۔ آپ روحانی سلسلہ چشتیہ کے تیسرے سربراہ تھے' پہلے سربراہ خواجہ معین الدین چشتی اور دوسرے خواجہ بختیار کاکی تھے) آپ کی شاعری کا دور ہندوی کا ابتدائی دور ہے۔ آپ پنجابی زبان کے قادرالکلام شاعر تھے۔

بابا فرید کے کلام کا انتخاب پاک عرب ریفائنری لمیٹڈ کے تعاون سے فضلی سنز' اردو بازار کراچی' نے دسمبر ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔

چند اشعار

دیکھ فریدا جوتھیا داڑھی ہوئی پھور
اگا نیڑے آیا پچھا ریہا دور

ترجمہ (تیری داڑھی سفید ہوگئی' موت قریب آ گئی' پچھلا زمانہ پیچھے رہ گیا)
(دیکھ فریدا جو ہوا داڑھی ہوئی سفید
اگلا نزدیک آیا اور پچھلا رہا دور)۔راقم الحروف

صبر اندر صابری تن ایویں جالیں
ہوں نجیک خداء سے بھیت نہ کسے دین

ترجمہ: صبر کرنے والوں کا صبر تن کو اس طرح جلاتا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک ہوجاتے ہیں مگر اس بھید کو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔

جالین: جلانا' ایویں: ایسے' نجیک: نزدیک' بھیت: راز

بولے شیخ فرید پیارے اللہ لگے
ایہ تن ہوسی خاک نمانی، گور گھرے

گرونانک نے شیخ فرید کا عارفانہ کلام محفوظ کیا تھا اور ان کے جانشینوں نے بھی شیخ فرید کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شیخ فرید کی شاعری تصوف کی پہچان کے لیے ایک زینہ ہے اس میں زہد وتقویٰ' معصیت کے پراسرار دل فریبی کا' موت کے خوف کا تذکرہ بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ اپنے کلام کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اللہ کی تعلیمات سے دور ہوکر انسان فلاح نہیں پا سکتا۔ شیخ فرید کی شاعری میں وطن' دھرتی سے بے پایاں محبت کا خزانہ موجود ہے۔

ترجمہ: سن سہیلی پریم کی باتا
یوں مل رہی جیوں دودھ بتاتا
دوست سوکھی روٹی کھا اور ٹھنڈا پانی پی
دوسروں کے لذیذ کھانوں پر رشک نہ کر

شیخ فرید حسین بابا فرید کے نام پاک پتن شریف میں مدفون ہیں آپ کی شاعری لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے اور سلوک کی منزل کا ایک آسان راستہ ہے۔

بابا فرید برجستگی سے جملہ کہہ دیا کرتے تھے جواب بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اور پنجابی زبان کے ادب میں ان کا اہم مقام ہے بابا فرید نے بھی اپنی ہی زبان میں عوام الناس سے گفتگو کی اور سمجھانے کے لیے اپنی فارسی شاعری میں مروجہ الفاظ کو جگہ دی بابا فرید کا یہ انداز مستقبل میں اردو (ہندوی) شاعری کی بنیاد ہے۔

نمونہ کلام:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے
خیز در آں وقت کے برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

☆......امیر ابوالحسن سخن الدولہ خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۹ اکتوبر ۱۳۲۵ء)

۹۹ کتابوں کے مصنف اور خاص طور پر خالق باری کے مصنف امیر خسرو پیٹالی ضلع ایٹہ یو پی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا شمار برصغیر کے تصوف کے اہم اکابر میں ہوتا ہے۔ آپ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کے خاص اور محبوب مرید تھے۔ آپ کے کلام میں جو اس وقت دستیاب ہے بقول ماہر انتقادیات امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں کہ دستیاب کلام کو مستند نہیں مانا جا سکتا۔ شاعری کے ساتھ امیر خسرو نے ایرانی موسیقی کو ہندوی موسیقی کے ساتھ ملا کر نئے راگ اور راگنیاں ایجاد کیں۔ خسرو کی شاعری کا یہ وصف کہ ایک مصرع فارسی اور دوسرا اردو (ہندوی) میں لکھا جبکہ دیگر انداز میں آدھا مصرع فارسی اور آدھا مصرع اردو میں لکھا۔ عام مقبول موضوعات کو پہیلیوں کے انداز میں بیان کیا۔ کہہ مکرنی، دو سخنے' دوہرے' گیت اور انملیاں بھی ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ امیر خسرو کا ایک شعر جو ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر درج ہے:

گوری سووے سیج پہ اور مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چھوں دیس

امیر خسرو کے دور سے دکن کے اردو شعراء کے دور تک تقریباً تین صدیوں کا فاصلہ ہے مگر اس دور کی نگارشات و تخلیقات کا ذکر کہیں نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ خسرو کے بعد شعری سفر میں ایک خلا ملتا ہے جس زبان کی ترویج و اشاعت کا پتہ لگانا ہنوز ایک مشکل اور تحقیق طلب کام ہے۔

امیر خسرو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ زمانے کی شکست و ریخت' تہذیب کے بدلتے تیور ان کے سامنے تھے جس سے انہوں نے اکتساب فیض بھی کیا۔ امیر خسرو ایک سکہ بند اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہل زبان بھی ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ ان کے کلام کی مٹھاس آج بھی سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ امیر خسرو کا سدا بہار کلام آج بھی گلوکار اور قوال اپنی ریاضت کا حصہ بنائے ہوئے ہیں اور

مقبول عام کی سند پر فائز ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
بحقِ روز وصال دلبر کہ داد مارا قریب خسرو
پسیت من کہ در اے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

اردو دوہے:

خسرو دریا پریم کا الٹی وا کی دھار
جو اترا سوڈوب گیا جو ڈوبا سو پار
سیج وہ سونی دیکھ کے رووؤں میں دن رین
پیا پیا میں کرت ہوں پہروں پل بھر سکھ نہ چین

ایک تصوف کا رنگ

سب سکھیوں میں چادر میری میلی دیکھیں ہنس ہنس ناری
اب کے بہار چادر میری رنگ دے پیار کھ لے لاج ہماری
صدقہ بابا گنج شکر کا رکھ لے لاج ہماری
قطب فرید مل آئے براتی خسرو راج دلاری
کوئی ساس کوئی نند سے جھگڑے ہم کو آس تمہاری
رکھ لے لاج ہماری نظام رکھ لے لاج ہماری

موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے
تو تو صاحب! میرا محبوب الٰہی
سوہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے

☆

ہماری چندریا -- پیا کی پگڑیا
وہ تو دونوں بسنتی رنگ دے
جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی
مورا جوبن گروی رکھ لے
آج پڑی دربار تمہارے
موری لاج شرم سب رکھ لے
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے

☆

ماں! میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
اماں! میرے بابا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی! تیرا بابا تو بوڑھا ری کہ ساون آیا
اماں ! میرے بھائی کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی۔ تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں! میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی! تیرا ماموں تو بانکاری کہ ساون آیا

☆

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی
پانی بھرن کو میں جو گئی تھی
دوڑ جھپٹ، موری مٹکی پھٹکی

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
مورے اچھے نظام پیا جی

خسرو نے جو کلام تخلیق کیا وہ اردو شاعری کا بنیادی حصہ ہے بقول مولانا جامی کہنے کو تو ۹۹ تصانیف ہیں جن کا ذکر ملفوظات میں اور تذکروں میں ملتا ہے مگر ایک اندازے کے مطابق صرف ۲۴ دستیاب ہیں۔

☆...... شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی (۱۲۰۹ء تا (۱۳ رمضان ۱۳۲۴ء)

شیخ شرف الدین المعروف بوعلی قلندر پانی پتی ضلع کرنال (حالیہ) میں سید شاہ ابوحسن فخر الدین فخر عالم بابا کے گھر پیدا ہوئے آپ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نامور اولیا کرام میں ہوتا ہے آپ نے عالم جذب میں اپنی تمام کتابوں اور قلمی یادداشتوں کو دریا میں پھینک دیا۔ آپ کی وجہ شہرت تصوف ہے دیگر اولیاء کرام کی طرح آپ نے بھی شاعری پر توجہ کی آپ کی تخلیقات میں رباعیات و غزلیات اہم ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کے توسط سے ذیل کا دوہا تاریخ ادب اردو کی زینت بنا

سایرے نہ ماہتوں پیو کے نہیں تہانو
کنہ نہ بوجھی یات اویدھنی سہان نانو
جبکہ ایک اور دوہا جو آسان اور قابل فہم ہے
سجن سگارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کہ بھور کدھی نہ ہووے

☆...... امیر حسن، حسن دہلوی (۶۵۰ھ تا ۷۳۸ھ)

آپ امیر خسرو کے ہم عصر اور پیر بھائی تھے آپ کا شمار ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے اہم صوفی شعرا میں ہوتا تھا۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے آپ کو سعدیٔ ہندوستان کا خطاب دیا تھا حسن دہلوی نے بھی خسرو کی طرز پر فارسی اور ہندی کو ملا کر تخلیقی ہنر پیدا کیا۔

بسیار گفتم این سخن اے دل بکس زغبت مکن
ان کی تباہی اٹ کٹھن لہوتوں کیسے سمجھائے کر
بس حیلہ کردم اے حسن بے جاں شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر

☆...... مشتاق بیدری

تصوف کے رنگ میں رنگے ماحول اور طریقت کے پیروکاروں میں ایک نام مشتاق بیدری کا بھی آتا ہے۔ یہ ماحول اس دور میں شعراء کو میسر آیا تو وہ شروع ہی میں تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے یا پھر آخری عمر میں توبہ تائب ہو گئے تھے۔اس دور کے فارسی شعراء کا کلام تصوف آمیز تھا اور بعد میں اردو شاعری میں اس کی تقلید ہوئی۔

مشتاق کا کلام:

تجھ دیکھنے دل تو گیا ہور بیو اپر ہے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیوکے اوپر نہیں دیکھے تو کل گھڑی
آب حیات اور لب ترے جاں بخش و جاں پرورا ہے
مشتاق بوسے سوں پیا امرت اوکل گھڑی

مشتاق بیدری کو شہرت سلطان محمود شاہ بہنی کے دور میں ملی جب انہوں نے سید برہان الدین شاہ ولی کی شان میں ایک اردو قصیدہ لکھا تھا۔

لطفی: لطفی بھی مشتاق بیدری کا ہم عصر ہے محمد شاہ بہمنی کے دور میں اس نے بھی شاہ محمد کی مدح سرائی کی اور مقبولیت حاصل کی۔لطفی کے رنگ سخن میں دکنی رنگ غالب نظر آتا ہے اس دور میں تصوف آمیز شاعری کا فروغ ہوا۔

نمونہ کلام:

خلوت میں سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پانوٴ پہ کھڑی ہوں جلنے پر پتی ہوں

سب نس گھڑی چلوں گی جا گہ سونا پلوں گی
نا جل کو کیا کروں گی اول سوں ملامتی ہوں
☆
لطفی تیرے جلن کی پا کی کہاں ہے اس یں
جیوں پانچ پانڈواں کے کھتے سود پر پیہی ہوں

☆...... شیخ باجن (۷۹۰ھ تا ۹۱۲ھ/ ۱۳۸۸ تا ۱۵۰۶)

نویں صدی ہجری میں اردو شاعری میں مذکورہ ہونے والے شیخ باجن کا نام شیخ بہاالدین باجن تھا۔آپ کا دور اردو (ہندوی) شاعری کے اوّلین دور میں شمار ہوتا ہے آپ نے فارسی کے ساتھ ہندوی (اردو) میں اشعار کہے

سب بھول یاری تو ہیں بھونرا ہو بھر لیو باس
راول میرا راج کرے ری مندر کے پاس
☆
اللہ سئیں جے کوئی ہوئے اللہ اور جگ اس کا ہووے
من مراد گھر بیٹھے واو کےاس کو مار نہ سکے کوئے

باجن کا دوہا:

بھونرا لیوے پھول رسا سیا لیوے باس
مالی پہنچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

باجن کے اقوال:

جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے اداس
راول دیول ہے نہ جایئے پھاٹا پہنہ روکھا کھایئے

☆...... شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۸۵۲ھ۔۱۴۵۰ء وفات/ ۱۵۳۰ء)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی ولادت ردولی میں ہوئی آپ کے والد کا نام شیخ محمد اسماعیل تھا آپ کا شجرہ نسب امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے آپ کا تعلق سلاسل اربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ

نقشبندیہ اور قادریہ سے ہے۔ آپ کو محفل سماع سے خاص رغبت تھی آپ الکھ داس تخلص کرتے تھے وہ اپنے وقت کے بڑے عالم اور بزرگ تھے اور تبلیغی جماعت سے منسلک تھے' آپ کی تصنیف ''انوار العیون'' ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے جبکہ رشید نامہ بھی ہندوی کے اعتبار سے اہم ہے۔

فارسی کلام:

من غنی گویم انا الحق یار می گوید بگو
چوں نہ گویم چوں مرا دلدار می گوید بگو

ہندی شاعری:

یہ جگ وہ جگ دیو تن من ارتھ بھندار
سائیں کے رے سیں کا جود کھرا دے یار

رشید نامہ سے چند ہندوی نمونے

رینی کیوں نہیں ناچوں سکھی جو پا رنگ چڑھایا
تن من جیہ سبہ ایک رنگ دکھا تو میں آپ گنوایا
نہ کچھ نہ کچھ نہ کچھ جان
نہ کچھ میں نہ کچھ مدن کچھ پران
سید: روتی ساتی گیان لگائے
رات کیسے دن بسیر جائے

☆...... نام دیو (۱۲۷۰ء تا ۱۳۵۰ء)

مائے نہ ہوتی باپ نہ ہوتا کرم نہ ہوتی کائیا
ہم نہیں ہوتے تم نہیں ہوتے کون کہاں سے آیا
قاضی ملا کرہ سلام
ان ہندو میرا ملیا مان

☆

نامے کی کیرت رہی سنتار
بھگت جناں لے ادھر یاپا

☆...... کبیر داس (۱۵۱۸ء) کبیر کے دوہے اور شاعری آج بھی زندہ ہے۔

دوئی جگ دیش کہاں نے آئے کیو کون بھرمایا
اللہ' رام' کریم' کیشو بری حضرت نام دھرایا

☆

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

☆

کبیر سر پر سرائے ہے کیا سوئے سکھ چین
سوانس نگارا باج کا باجت ہے دن رین

☆...... گرو نانک (۱۴۶۹ء تا ۱۹۳۸ء)

گرو نانک بنیادی طور پر کبیر کے مسلک سے ہیں۔ گرو نانک کا دوہا

مویو پاس نانک لہو پانی
پیو سو رانڈ سہاگن ناؤں

گرو نانک کا ایک اور رنگ ملاحظہ ہو

نانک دنیا کیسی ہوئی
سالک مت نہ رھیو کوئی
بھائی بندھی ھیت چکایا
دنیا کا رن دین گنوایا

☆......☆

اردو غزل کے ایہام گو شعراء

اُردو شاعری کا یہ سفر فارسی‘ ہندوی سے ہوتا ہوا ریختہ گوئی کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی کی جانب مائل ہو گیا اور ایہام گوئی کو امتیاز سمجھا جانے لگا۔

ایہام گوئی: جب کوئی شاعر اپنے کلام میں کوئی ایسی بات نظم کرے جو ذو معنی ہو یعنی دو معنی نکلتے ہوں‘ ایک معنی قریب اور دوسرے بعید کے‘ ایہام کہلائے گا۔ ولی دکنی کی شاعری جب دہلی میں آورد ہوئی تو یہاں کے شعراء نے تتبع میں ایہام گوئی کا لہجہ اپنایا۔ یہ تحریک ہندی دوہے اور فارسی سے متاثر ہونے والے شعرا کے دور میں ایک صنف بن گئی ۔ اس دور میں جو ایہام گو شعراء مشہور ہوئے ہیں ان میں ایمن آبرو‘ شاکر ناجی‘ شرف الدین‘ مصطفیٰ خان یک رنگ اور شاہ حاتم شامل ہیں۔

☆...... آبرو (۱۰۹۴ـ۱۶۸۳ء تا ۱۱۴۶ھ ۱۶۸۳)

آپ کا نام شاہ مبارک آبرو تھا۔ آپ کی پیدائش گوالیار کی ہے مگر قیام و بود و باش دہلی کی ہے شاہی دربار سے وابستہ رہے مگر بعد میں درویشی اختیار کر لی‘ آپ مزاجاً حسن پرست تھے خوبصورت چیزوں اور مناظر کے دل دادہ تھے۔ ان کے کلام میں ہندی و فارسی کے اثرات ملتے ہیں۔ آبرو نے اپنی شاعری میں ہندوستان کی معاشرتی و مذہبی رسومات و روایتوں کو جگہ دی۔ دوہے کی روایت کو آگے بڑھایا، اس روش کو دیکھ کر دیگر شعراء نے بھی تقلید کی۔ آبرو کی ایہام گوئی کی مشہور زمانہ جھلک:

تمہاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے‘ کس طرح کی ہے‘ کدھر ہے

اُس دور کے معاشرے کی امرد پرستی کا منظر نامہ:

کسی سے پیار کی گرمی کیا چاہے تو آتش ہے
ملا چاہے تو کوئی رنگ ہو پانی ہے وہ لونڈا
مذاق شوق کوں دے ہے مٹھاس اس کی مزیداری
تمام عالم خوباں کے بیچ خوبانی ہے وہ لونڈا
ہوئی محکم بنا اس ریختے کی مدح اس کی سوں
کہ معشوق کے کارستان میں پانی ہے وہ لونڈا

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

جو لونڈا چھوڑ کر رنڈی کوں چاہے
وہ کوئی عاشق نہیں ہے‘ بوالہوس ہے

ایہام گوئی میں ذو معنی کے ساتھ ساتھ لفظوں میں باہمی ربط بھی اجاگر کرنا ہے ورنہ معنی معلق ہی رہیں گے۔

ہر ایک سبز ہے ہندوستان کا معشوق
بجا ہے نام کہ بالم رکھا ہے کھیروں کا

آبرو کی ایہام گوئی کا ایک اور انداز:

ملنے کے شوق میں ہم گھر یار سب گنوایا
مدت میں گھر ہمارے آیا تو گھر نہ پایا

☆

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بیقرار دیکھو آج پھر گیا

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں ’’آبرو ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ وہ مشکل سے مشکل زمینوں میں بھی اُس دور میں جبکہ روایت اپنی ابتدائی منزل میں ہے‘ مربوط و رواں شعر نکالتا اور مشکل قافیوں کو بامعنی انداز میں اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ محاورات و ضرب الامثال کو اس طور پر

اشعار میں لاتا ہے کہ اس کے بہت سے اشعار نہ صرف اس کے دور میں زبان پر چڑھ گئے بلکہ آج بھی زبان زدِ عام ہیں:

آج پھر ہمیں کردیا اداس
ان رقیبوں کا جائے ستیا ناس
کریں جو بندگی ہوویں گنہ گار
بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

اردو شاعری کے بدلتے تناظر میں آبرو کا کلام ایک سنجیدہ اور باشعور شاعر کے کلام کے طور پر سامنے آتا ہے۔ آبرو نے زبان کو سلیقے اور احتیاط سے استعمال کیا ہے۔

☆...... شاکر ناجی (۱۶۹۳ء۔۱۱۴۰ھ۔۱۷۴۷ھ)

فن سپاہ سے تعلق رکھنے والے شاکر کا تخلص ''ناجی'' تھا۔ آبرو کے ہم عصر تھے۔ ایہام گوئی ان کا شعار تی آپ ظرافت و مزاح کا بھی اچھا مزاج رکھتے تھے

نمکین حسن دیکھ کر کر پی کا
رنگ گل کا مجھے پھیکا لگا

☆

محبت سے علی کے دیکھ ناجی
ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ''اگر دیوان ناجی کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے کہ اس میں نہ ہجو ہے نہ مزاح ہے نہ ہزل بلکہ سارا دیوان شروع سے آخر تک ایہام میں ڈوبا ہوا ہے۔'' اس دور میں امرد بازی کے چرچے تھے اُس دور میں عشق بازی کے دو محور تھے ایک طوائف اور دوسرا لڑکا۔ اس ضمن میں ناجی کا کلام ملاحظہ ہو:

باغ ہو مینا ہو زر ہو اور ساقی شوخ
بہتر اس سے نہیں قسم ایماں کی ناجی کو مراد

قسم کیفی کی میں لڑکا نہیں پاؤں تو اے ناجی
کہاں جیوے برنگ ناگ جن کے جنم کھوئی ہے

ناجی کے دور میں محلات اور منصب داری پر عملاً عورتوں کی حکمرانی نظر آتی ہے ناجی کے کلام کا ایک اور رنگ:

جو سالا شاہ کا ہو کرے ظلم اس میں مت بولو
محل کی زینت اوس کی بہن وہ پیاری کا بھائی ہے
ہوا معلوم خم خانے میں تریا راج ہے بے شک
ہر ایک سجدے میں لیے یاں دختر زر کی خدائی ہے

آبرو سے مماثلت رکھتا ہوا ایہام گوئی کا ایک شعر:

دیکھ دلبر تری کمر کی طرف
پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف

ناجی کا شمار اس عہد کے اُن قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی بہتری و احیاء کے لیے اہم خدمات انجام دیں:

روانی طبع کی دریا سی کچھ کم نہیں ناجی
بھریں پانی ہم ایسی جو کوئی لاوے غزل کہہ

☆...... شیخ شرف الدین مضمون (پیدائش......متوفی ۳۵۔۱۷۳۴ء)

برصغیر میں ایہام گو شعراء میں ایک نام شیخ شرف الدین مضمون بھی ہے آپ کا تعلق مذہبی خانوادے سے تھا آپ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے ساری عمر مسجد میں گزاری۔ اپنی ایہام گوئی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

ہوا ہے جگ میں مضموں شہرہ تیرا......طرح ایہام کی جب میں نکالی

اردو ادب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مضموں کم گو تھے طبع آزمائی اس موقع پر کرتے تھے جب کوئی نئی صورت حال یا موضوع سامنے آتا ہو۔ آپ کا کوئی دیوان دستیاب

نہیں ہے البتہ تذکروں میں شاعری کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اپنے تخلص کا خوبصورت اور برمحل استعمال کرتے تھے ملاحظہ ہو:

گدا ہو کر کیا مت کر، اتی تعریف لڑکوں کی
کہ ان باتوں سے مضموں ترا اسلوب جاتا ہے

☆

اگر پاؤں تو مضموں کوں رکھوں باندھ
کروں کیا جو نہیں لگتا مرے ہات

☆

کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں
جانتا ہے خوب وہ مضموںؔ کو

ایک اور رنگ ملاحظہ ہو:

نہیں ہیں ہونٹ تیرے پانی سے سرخ
ہوا ہے خون میرا آ کے لبریز

☆...... مصطفیٰ خان یک رنگ (متوفی ۱۷۵۲ء)

مصطفیٰ خان، یک رنگ آبرو مضموں کے ہم عصر لگتے ہیں کیونکہ تاریخ اردو ادب کہتی ہے کہ ان شعراء کی وفیات میں دو چار سال کا فرق ہے۔ ان کا شمار بھی اس عہد کے ایہام گو شعراء میں ہوتا ہے۔ محمد شاہ منصب دار تھے اور خوشحال زندگی گزاری ہے ان کی شاعری کا بھی وہی مزاج ہے جو آبروؔ ناجی اور مضموںؔ کا تھا۔ آبروؔ ناجی سے گزرتا ہوا ایہام گوئی کا دور یکرنگ کے زمانے میں ماند نظر آتا ہے۔ شاید ماحول یکسوئی کا شکار ہو گیا تھا اور اس قدر ایہام گوئی سے کلام اپنی وقعت کم کر بیٹھا تھا۔ یک رنگ میں زبان کی بدلتی ہوئی سلاسلت نمایاں نظر آتی ہے:

تجھ زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یک رنگ کا سخن میں خلاف ایک مُو نہیں

☆

کیا جانیے وصال ترا ہو کسے نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

یک رنگ کے کلام میں سادگی اور بے ساختگی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے اور یہی ان کی شاعری کی شائستگی کا زاویہ ہے۔

نہ کہو یہ یار جاتا ہے ...... میرا صبر و قرار جاتا ہے
اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی......ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

☆...... میر محمد سجاد

ایہام گو اور ردِ ایہام گو دور کے درمیانی عرصے میں سجاد اکبر آبادی اردو شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی پیدائش اکبر آباد کی ہے جبکہ بود و باش و تربیت دہلی کی۔ آپ نے بھی ایہام گوئی کی صنعت اختیار کی مگر ایہام کے عدم رواج کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے تازہ گوئی کی تحریک کو عام کیا اور خود کو میر وسودا کے عہد میں اعتبار کے مقام پر فائز کیا۔ اگر جائزہ لیا جائے تو ایہام گو شعرا خود اپنی تخلیقات سے مطمئن نہیں تھے اور وہ ہر مقام اور ہر قدم پر نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے اور یہی رویہ اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں جاری رہا۔ یہ طبع آزمائی سنسکرت اور ہندی زبانوں کے دیومالائی قصوں سے متاثر ہو کر ہوئی ہوگی مگر اردو شاعری کی تاریخ میں یہ واضح نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور کے ایہام گو شعراء فارسی سے متاثر تھے:

آپنے ہے خدا سے پیری میں......بت پرستی ہے اور جوانی ہے
یار غصے میں ہے غیر پر سجاد......ہم پہ کیا آج مہربانی ہے

سجاد کی شاعری ظاہری حسن کی شاعری ہے۔ ان کے کلام میں اُس عہد کی رنگینیاں، رعنائیاں اور اداؤں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے

تیرے ہاتھ کی چوڑی کالی......ہے کوئی آستیں میں کالا سانپ

بت پرستی و مے کشی سے دل...... کب توبہ کرے، توبہ کر

دم بدم رکھتی ہے فتنے کے تئیں
نیچے دامن پہ اونچی چولیاں

☆

آ کھڑا تو ہوا جو کوٹھے پر
گھر کے گھر عاشقوں کے بیٹھ گئے

سجاد کی زندگی میں دکھ درد کا اظہار بھی ملتا ہے اور یہ اظہار ان کے ذاتی درد سے بڑھ کر آفاقی ہو جاتا ہے اور وہ سارے جہاں کے غم کو اپنا غم جانتے ہیں:

سبھی جلتے تھے شمع و پروانہ...... رات یہ دن تھا اہل محفل پر
یہ جلنا دل اپنے کا آتا ہے یاد...... جہاں جلتے دیکھوں ہوں مجلس میں شمع
دوستی وہ ہے جو ہو اخلاص سے...... روٹھنے لڑنے سے دل ملتا نہیں

سجاد نے ایہام گوئی کی روایت سے ہٹ کر اپنے کلام میں لطف و رنگینی پیدا کی۔ وہ خود کو اس دور کا اہم شاعر گردانتے ہوئے کہتے ہیں:

سجادؔ سب تلاش کریں اس زمین میں
کہہ کب سکے ہے کوئی اس ایہام کا تلاش

ایہام گوئی کا زوال:

ایہام گوئی کے مروج ہونے سے عروج و زوال یقینی تھا کہ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے۔ جس صنف یا تحریک کی کوئی مستحکم بنیاد نہ ہو اسے یا تو طاقِ نسیاں کر دیا جاتا ہے، یا پھر وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتے ہوئے زوال کی کھائی میں دفن ہو جاتی ہے۔ آبرو کے دور سے شروع ہونے والی ایہام گو تحریک بالآخر مرزا مظہر جان جاناں کی صورت میں ردِ ایہام گوئی کی بنیاد ٹھہری۔ ۱۷۳۹ء کے بعد اردو شاعری میں یہ کروٹ ''ردِ عمل کی تحریک'' سے پہچانی جاتی ہے اس دور میں شعراء نے ایہام گوئی ترک کر دی۔

☆...... مظہر جان جاناں، مرزا (۳ مارچ ۱۶۹۹ء تا ۷ جنوری ۱۷۸۱ء)

یہ وہ ابتدائی دور ہے جس میں مرزا نے فارسی کو ترک کر کے اردو میں خود بھی اشعار کہنا شروع کیے اور دیگر شعرا نے بھی ان کی تقلید کی۔ مرزا کالا باغ، مالوہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد دربار اورنگ زیب سے وابستہ تھے۔ اپنے ابتدائی ایام میں دینی اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ آپ ایک درویش صفت فقیر منش اور قناعت پسند نیز نازک مزاج شاعر تھے آپ کے مستند تلامذہ میں یقیںؔ، حزیں، اور احسن الدین بیاںؔ شامل ہیں۔ مرزا کی شعری زبان صاف، نکھری ہوئی اور سادہ ہے انداز بیاں، جذبات و احساسات کی ترجمانی اختیار کر گیا۔

اس ردِ ایہام گو تحریک میں مرزا مظہر جان جاناں نے شعری مضامین کو خیالی، مجازی سوچ اور فکر سے جدا کر کے، فطری عشقیہ سا شاعری کی جانب مائل کیا۔ اروارداتِ قلبیہ اور تجربات پر نئی شاعری کی بنیاد رکھی۔

مرزا نے زبان و بیان کو پر جوش انداز میں فارسی شاعری کی روایات و علامات، بندش و تراکیب کی مدد سے نیا آہنگ عطا کیا۔ انہوں نے خود اور اپنے شاگردوں کو ردِ عمل کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے پر مائل کیا۔ آپ کے کلام میں عشقیہ شاعری کا بھرپور رنگ شامل ہے:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

☆

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

☆

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

مرزا نے جو نئی روش اختیار کی اس دور کی نئی نسل نے اس میں اضافہ کیا اور صاف ستھری

اور نکھری ہوئی شاعری پڑھنے کو ملی:

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

☆...... انعام اللہ خان یقیؔن (۱۷۲۷ءتا۱۷۵۵ء)

یقین مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔رزا نے جو اصلاح زبان کے حوالے سے کام کیا تھا یقین نے اسے آگے بڑھایا اور اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اردو شاعری کو ایک نئے رنگ میں ڈھالا۔ان کی شاعری میں فارسی اور فارسی کا طرز عمل رد کے طور پر پردے سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزہ بھی ہے

یقین کے بارے میں مصحفی کی رائے:

''ایہام گویوں کے دور میں جس شخص نے صاف اور پاکیزہ ریختہ کہا وہ یہ نوجوان تھا۔''

یقین کی غزل میں فارسی سے ہٹ کر جو مضامین اختیار کیے گئے اُس طرز سے یقین کے کلام میں ''لطافت وشائستگی کے ساتھ شگفتگی وشیرنی کا احساس ہوتا ہے۔'' جمیل جالبی۔

یقین کی غزل کا رنگ:

مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی
دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا

☆

خفیف مجھ سے الجھ کر عبث ہوا واعظ
کہ میں تو مست تھا کیا اس کو بھی شعور نہ تھا

☆

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دوانہ ہوتا
آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

یقین کا شاعرانہ رنگ وجلال اس قدر زبان زدعام رہا کہ اُس دور میں ان کے سامنے کسی دوسرے شاعر کا جادو نہ چل سکا۔میر تقی میؔر بھی انہی متاثرین میں شامل تھے۔

☆...... میر عبدالحئی تاباں (پیدائش ۱۷۱۶ءمتوفی ۱۸۴۹ء۔یا ۱۸۵۰ء)

میر عبدالحئی تاباں کا تعلق دہلی سے تھا۔نہایت خوبصورت اور حسین وجمیل شخصیت کے مالک تھے۔تاباں کا کلام رد، ایہام گوئی کی ایک کڑی ہے آپ کا کلام سادہ، شستہ اور شیریں ہے۔بقول مولوی عبدالحق ''زبان اور بول چال کا لطف ضرور پایا جاتا ہے۔'' تاباں کا کلام سیدھی سادھی عام زبان پر مشتمل ہے۔وہ حاتم سے اکتساب فیض رکھتے تھے جس کا اظہار یوں کیا ہے:

ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو دکھاؤں تاباں
اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں
ہوتے ہیں مفت جان کے دشمن یہ خوبرو
اقرار سے اس عشق کے انکار ہی بھلا

حاتم کے بعد تاباں نے حشمت کی شاگردی اختیار کی۔حشمت کے ساتھ رفاقت کا ذکر تاباں کی ایک رباعی میں بھی ملتا ہے:

ہم کو تمہارے غم سے جینا ہے محال
تم ہم کو لکھو کہ ہے تمہارا کیا حال
دو سال جو ہم تم رہے یک جا حشمؔت
اب اس کے عوض ہجر کا ہے روز ہی سال

تاباں کی فکری طبع آزمائی میں واردات عشق کا اظہار ملتا ہے ان کے کلام میں محبت، عاشقی، سرور جیسے مضامین نمایاں ہیں جن کی مدد سے ہم ان کی شاعری کو عشقی شاعری کہتے ہیں۔

تاباں کے متعلق کہتے ہیں کہ بلانوش تھے۔اسی لت کی وجہ سے عالمِ شباب میں انتقال کر گئے نمونہ کلام:

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہوُ ہوا سوہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

☆

خزاں تک تو رہنے دے صیّاد ہم کو
کہاں یہ چمن پھر ' کہاں آشیانہ

☆

عالم میں تیرے عشق سے تاباںؔ ہوا خراب
کیا تجھ کو اس کے حال کی اب تک خبر نہیں

تاباں کے محولہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں فارسیت غالب ہے اور نہ ہی عربی و فارسی کے مشکل الفاظ مستعمل رہے۔ سیدھی سادی زبان استعمال کی اور مقبول رہے:

☆...... سید محمد باقر حزیںؔ (متوفی ۱۱۶۵ھ/۱۲۰۱ھ۔)

حزیں کا شمار ردِعمل تحریک کے شعراء میں ہوتا ہے آپ کی شاعری ترکِ ایہام گویاں میں اپنی صاف وشستہ زبان کی وجہ سے اہم مقام رکھتی ہے۔ یقین و تاباں کے شعری سلسلے کی کڑی ہیں۔ حزیں مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ آبا کا پیشہ فن سپاہ گری تھا مگر کسی جوان رعنا کے عشق میں مبتلا ہو کر جان سپردِ آفریں کی۔ آپ کے شاگردوں میں شورش عظیم آبادی، حسرت عظیم آبادی اور ظہور عظیم آبادی شامل ہیں۔ حزیں کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے:

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گل پیرہن باعث
کہ ہووے بلبلوں کی خوش صفیری کا چمن باعث
کوئی ہوتا ہے سنگ سینہ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپی کون باعث
جو ہوتا ہے کسی سے انس سب سے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

33

حزیںؔ ان شعلہ رخساروں سے جی کو مت لگا ہرگز
ہوئی آخر کو پروانے کی جلنے کی لگن باعث

حزیں کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو جس میں زبان کی سلاست واضح ہے:

راحت میں دل کے ہاتھوں نہ پاؤں گا ایک دم
جب تک کہ میرے ساتھ یہ خانہ خراب ہے

عشق اور کیفیاتِ عشق کا رنگ:

عاشقوں کے دل میں کب ہے صبر کی طاقت حزیںؔ
نوحہ کرنے میں نہیں ان بے قراروں کا گناہ

☆

میں چاہتا ہوں عشق کو چھپاؤں پہ کیا کروں
رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشم تر مجھے

☆...... شیخ ظہور الدین حاتم (۱۱۱۱ھ۔۱۱۹۷ھ/۱۷۰۰ء یا ۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۳ء)

حاتم کا تعلق دہلی سے تھا۔ والد بھی شاعر تھے۔ پیشہ سپاہ گری تھا۔ حاتم کو امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایہام گو شعراء میں بھی شامل رہے اور ترک ایہام کے دور میں اس تحریک میں بھی شامل رہے اور تازہ گوئی اختیار کی۔ فارسی شاعری میں مرزا صائب اور ریختہ میں ولی دکنی کو استاد مانتے تھے۔ بعد ازاں ریختہ گویاں میں آپ خود ہی استاد کی سند پر فائز ہو گئے۔ سودا کو حاتم کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ حاتم کی شاعری اٹھارویں صدی کے شعری سفر کا احاطہ کرتی ہے اس لحاظ سے حاتم نے اپنی آنکھوں سے سیاسی و سماجی حالات کا مطالعہ کیا اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی شعری فکر کو نکھارا۔ حاتم کی شاعری میں اُس دور کی زبوں حالی و افلاس کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ رنگ بعد میں ترقی پسند تحریک کے روپ میں سامنے آیا؛

محتاجگی سے مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

☆

گردشِ دوراں سے حاتم غم نہ کھا
حق نکالے گا تجھے افلاس سوں

شاہ حاتم نے پوری عمر شادی نہیں کی اور زندگی یونہی گزار دی وہ کہتے ہیں:

زندگی دردسر ہوئی حاتم...... کب ملے گا مجھے پیا میرا

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

حاتم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زلفوں کا بل بنانا، آنکھیں چرا کے چلنا
کیا کج ادائیاں ہیں، کیا کم نگاہیاں ہیں

☆

اس دُکھ میں ہائے یار بگانے کدھر گئے
سب چھوڑ ہم کو غم میں نہ جانے کدھر گئے

☆

جب ہوئے حاتم ہم اُس سے آشنا
دوست بھی دشمن ہمارے ہوگئے

☆

خدا کے واسطے اس سے نہ بولو
نشے کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

حاتم خرابات زندگی کو خیر باد کہہ کر نماز و شریعت کے پابند ہوگئے تھے۔ ایہام گوئی کے دور کی شاعری یا تو ترک کر دی یا پھر ترمیم و تنسیخ کر کے ایہام گوئی ترک کرنے کے بعد تازہ گوئی اختیار کی اور کلام کو ''دیوان زادہ'' کے نام سے پیش کیا۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

(ا) حاتم توقع چھوڑ کر سارے جہاں میں سب ستی
آ کر لگا حیدر کے در کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

(ا) پی کے نین کے جام میں دیوانہ ہوگیا
دل سے خیال سر سے رہا ہوش دور آج

دیوان زادہ میں مندرجہ بالا شعروں کا رنگ:

(ا) حاتم توقع چھوڑ کر عالم میں تا شاہ و گدا
آ کر لگا حیدر کے در کوئی کچھ کہو کوئی کچھ کہو

(۲) اس کی نگاہ مست نے دیوانہ کردیا
دل سے خیال سر سے رہا ہوش دور آج

محولہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے دیوان زادہ میں شامل کلام وہ ہے جس میں ہندی الفاظ کو ترک کرتے ہوئے فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ حاتم کی شاعری نے اردو غزل کو اعتبار بخشتے ہوئے زبان کو ایک نئی صورت عطا کی ہے۔ یہی صورت اردو شاعری میں میر و سودا کی شاعری کی بنیاد ہے۔

کیا ہوا حاتم تجھے جینے سے اکتایا ہے کیوں
دم غنیمت جان مشفق زندگانی پھر کہاں

حاتم نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور کئی یادگار نظمیں چھوڑی ہیں ان میں دروصف قہوہ، دروصف تما کو وحقہ اور سراپائے معشوق شامل ہیں۔ حاتم اپنے دور کے مستند قادر الکلام شاعر تھے۔ شاعری کے ساتھ حاتم نے اردو نثر اور فارسی میں نثر نگاری میں نگارشات تخلیق کیں جو اُس دور کی یادگار ہیں۔

☆......☆

اُردو شاعری کا زریں دور

☆......میر و سودا کا دور

☆...... میر تقی میر (۱۷۲۳ء۔۱۸۱۰ء بمطابق ۱۱۳۵ھ۔۱۲۲۵ھ)

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے جمع کیے تو دیوان کیا

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
بھری محفل میں بے دھڑکے یہ سب اسرار کہتے ہیں

ایہام گوئی اور ردِ ایہام گوئی کے بعد اردو غزل کی انگنائی میں جو تبدیلی آئی اس کا ارتقائی سفر سترھویں صدی سے شروع ہوا جو کہ دکنی، ہندوی، ریختی، ریختہ اور ایہام گوئی پر مشتمل ہے اٹھارویں صدی میں مسلم حکمران اورنگزیب عالمگیر کے زیرِ نگرانی تہذیبی و تمدنی سفر پر اپنے جھنڈے گاڑ رہی تھی وہیں اردو شاعری بھی اپنے بھرپور انداز سے ترقی کی جانب رواں دواں تھی مگر اس صدی میں سیاسی، معاشی سماجی اور حکمرانی حالت کوئی خاص ترقی نہ کرسکی۔ تخت نشینی کی جنگ سے مسلمانوں کی حکمرانی پر گرفت کمزور پڑتی چلی گئی اس کے برعکس اردو شاعری اور دیگر ادبی اصناف بتدریج ارتقائی منازل طے کرتی رہیں اردو شاعری فارسی کو ترک کرنے کا دور بھی ہے سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں اردو نے فارسی کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ اس دور کے حکمران بھی فارسی کے ساتھ اردو کو وقعت دیتے تھے۔ میر تقی میر تک آتے آتے حاتم کی ردِ ایہام گوئی اردو کے صاف اور شستہ لہجے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

میر تقی میر کے دور میں اردو غزل اپنی ایک نئی سج دھج اختیار کر چکی تھی یہ دور ایہام و

ابتذال سے پاک دور ہے۔ میر کے یہاں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجاز بہ انداز تصوف نے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میر تقی میر کا درج ذیل شعر ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری جدیدیت یا مابعد جدیدیت کی مضمون آفرینی چاہے کتنی ہی ترقی کر لے مگر میرا کا جواب نہیں:

میر ان نیم باز آنکھوں میں......ساری مستی شراب کی سی ہے

یا پھر ذیل کا شعر جس کی ہمسری شاید ہی ہو سکے:

سرھانے میر کے ذرا آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

محولہ بالا اشعار کو مدنظر رکھتے ہوئے میر تقی میر کو خدائے سخن کہا گیا۔ میر کے افکار میں ان کی نازک مزاجی، طبیعت کی حساسیت، ذاتی حالات اور زمانے کے ناروا سلوک اور المناک ماحول کی چھاپ گہری ہے چونکہ میر تقی میر کا تعلق ایک غریب اور درویش گھرانے سے تھا چنانچہ ان کے کلام میں اس ماحول کا اثر ایک لازمی امر تھا۔ میر کو اپنی نظر اندازی کا قلق تھا وہ خود کو ایک عظیم شاعر سمجھتے تھے مگر اپنے شعری قد کے مطابق پذیرائی نہ ملنے پر نالاں رہتے تھے:

ہوئی عید سب نے پہنے خوشی و طرب کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بدلتے یہ لباسِ سوگواراں

بچپن سے پیش آنے والے حالات جہاں بے کسی، رنج و ملال، ناکامی و نامرادی نے میر کو احساس کمتری میں مبتلا رکھا۔ نیز اس دور کے حالات حکمرانی جو سازش، دھوکہ بازی اور جنگ و جدال کے شکار تھے جس کا باعث کسی بھی حکمران کو دوام حاصل نہ ہوا جس کے نتیجے میں میر کو ان کے شعری قد کے مطابق ایوانوں میں امراء میں وہ جگہ نہ مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

☆

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ تھا
جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا
غلط تھا آپ سے غافل گذرنا
نہ سمجھا میں کہ اس قالب میں تو تھا

میر کی زندگی دکھ، درد، رنج والم سے عبارت ہے اسی لیے میر کو غم والم کا شاعر کہا گیا۔ میر کی شاعری میں مایوسی کا راج نظر آتا ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی میر تقی میر کی تخلیقی قوت اور رنج درد والم کو شاعری میں سمونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''میر کے کلام کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور حالات کو اپنے پر تاثیر، دل نشیں اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے اور یہ بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ذرا دہلی کی تباہی اور بربادی اور پیہم حملوں پر غور کیجیے اور پھر میرا کا یہ شعر پڑھیے:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرود و گل کے سائے تھے

میر کے ہاں عشق کا رنگ ملاحظہ ہو:

عشق معشوق عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

☆

ہم فقیروں سے بے آرائی کیا ہے
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

☆

زیرِ فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا

36

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ''دلی جس کا ذکر بار بار ان کی شاعری میں آتا ہے وہ صرف کسی شہر کا نام نہیں بلکہ ایک عظیم مرتی ہوئی تہذیب کی روح کا اشارہ ہے۔''

علامہ نیاز فتح پوری میر کے لیے رقم طراز ہیں کہ ''میر کا سا غزل گو نہ اس وقت تک پیدا ہوا نہ آگے اس کی امید ہے۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق ''اردو کے بہت کم شاعروں کے یہاں حقائق کی جستجو کے لیے اتنی تڑپ پائی جاتی ہے جتنی میر کے کلام میں ہے'' ڈاکٹر عبدالحق کی رائے میں ''اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں داخل کرنے پڑے گا'' اور پھر میر کا خود اپنے بارے میں انوکھا انداز ملاحظہ کریں:

جائے گا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

خدائے سخن میر تقی میر، ریختہ گویان ہند کے ایک استاد اعظم نیز اردو واسوخت کے موجد کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میؔر کا عجب ڈھب کا

☆

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

☆

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میؔر خرابات نشیں تھا

☆

وصیت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تُو عاشق نہ ہونا

☆

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

☆

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

☆

شام سے کچھ بجھا بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

☆

میر صاحب! زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

☆

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

☆

عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں برباد کہاں

☆

عشق کرنا نہیں آسان، بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے اُن کی، جو وفا کرتے ہیں

☆

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

☆

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میر تقی میر کی شعری زبان نہایت سلیس اور خاص وعام فہم ہے۔غم ذات اور غم کائنات کے مضامین دل میں اتر جاتے ہیں۔دبستان دہلی کے شعراء کے ہاں عشقیہ انداز تصوف کے رنگ کے زیر اثر رہا اس میں روح کی بیقراری اور واردات قلبی کی تڑپ ہے جسے سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے جبکہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کے رنگ میں عشق محض بوالہوسی ہے وہاں بکثرت حسین طرح دار عورتیں حسن وعشق کی انجمنیں روشن اور خلوتیں گرم کر رہی تھیں دہلی کے شعراء میں زندگی کی بے ثباتی، ہیچ مقداری کا احساس' جذبات کی گہرائی' زبان کی روانی اور شگفتگی دبستان دہلی کی خاص پہچان ہے جبکہ لکھنؤ کی شاعری میں لکھنؤ کی زندگی کا نشاطیہ عنصر غالب ہےاور وہاں کی پرامن زندگی اور خوشحالی کا عکس ملتا ہے:

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ ان کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

(جرات)

کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے
اس شوخ سے راہ ہم نے کرلی

(مصحفی)

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

(ناسخ)

روایت پسندی اور کلاسیکیت میں ایک عہد سے دوسرے عہد کی تقلید سامنے آتی ہے مضامین میں یکسانیت اور لفظوں کی تکرار یوں محسوس ہوتی ہے کہ نقل در نقل ایک دوسرے سے

سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں بقول آتش:

اپنے ہر شعر میں معنی تہ دار آتش
وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

اس دور میں کسی شاعر نے کچھ بھی کلام کہا مگر میر تقی میر کی برابری نہ کر سکے حتیٰ کہ مرزا غالب نے کہا کہ

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

☆...... مرزا محمد رفیع سودا (۴ رجب ۱۱۱۱ھ ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۰۶ء۔ ۲۷ جون ۱۷۸۱ء)

مرزا محمد رفیع سودا دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے جدامجد فن سپاہ گری سے وابستہ تھے۔ شعری سلسلے میں پہلے سلیمان علی خان وداؤد بعد میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ نیز خان آرزو سے بھی فیض یاب ہوتے رہے محمد شاہ بادشاہ کا دوران کی شاعری کا عروج کا دور تھا۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں نے جب دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تو یہ وہاں سے روانہ ہوگئے اور فرخ آباد میں قیام کیا۔ بعد ازاں فیض آباد چلے گئے پھر نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں ۲۷ جون ۱۹۸۱ء کو انتقال فرمایا اور آغا باقر کے امام باڑے (امام بارگاہ) میں مدفون ہوئے۔

سودا کا ذہن بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل تھا جیسے ہی انہوں نے فارسی سے اردو کی جانب توجہ کی ان کی شاعری میں ایک قدرتی نکھار آ گیا اور ان کی شاعری کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ میر نے سودا کو مکمل شاعر تسلیم کیا ہے۔ قصیدہ نگاری میں سودا کو وہ کمال حاصل تھا جو آج تک کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا سودا نے میر کی طرح کسمپرسی میں زندگی نہیں گزاری سودا کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا سو انہیں امرا کی صحبتوں کے ساتھ امراء اور روٴساء کی محافل بھی میسر آئیں۔ سودا نے اپنے عہد کے مستعمل شعری مضامین میں طبع آزمائی کی مگر اپنے انداز میں؛ انہوں نے غزل کو نیا انداز عطا کیا اور مشکل زمینوں، ردیف و قوافی میں اشعار کہے۔ ان کے ہاں عشق و حسن ہجر و وصل کا ایک حسین انداز بیان ہوا ہے:

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

اردو شاعری میں قصیدہ نگاری کا ذکر آتے ہی ذہن سودا اور ذوق کی جانب چلا جاتا ہے۔ دونوں نے خاصا وقیع کام کیا ہے مگر اس میدان میں سودا، ذوق سے سبقت لیے ہوئے ہیں بقول سودا:

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

سودا کی قصیدہ نگاری کے متعلق امام اثر لکھتے ہیں کہ ''اردو میں جو کچھ ہیں سودا ہیں اگر سودا نہ ہوتے تو اردو قصیدہ نگاری کو زیر بحث لانا فضول ہوتا۔''

☆...... خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ ۱۱۹۹ھ۔ پیدائش ۱۷۲۰ وفات ۷ جنوری ۱۷۸۵ء)

روندے ہے مثل نقش قدم یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ! چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

عہد میر اور سودا کے بعد خواجہ میر درد نے اردو شاعری میں رنگ تصوف میں عشق حقیقی کا منظر نامہ پیش کیا۔ درد اس عہد کے تیسرے بڑے شاعر ہیں آپ کا تعلق دہلی کے ایک معزز صوفی خانوادے سے تھا آپ کے والد محترم خواجہ محمد ناصر عندلیب فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ کم عمری سے ہی شعری شغف کے باعث اچھا کلام کہنے لگے۔ درد کے لیے یہ کہنا کہ درد خالصتاً تصوف کے شاعر ہیں مبالغہ آرائی نہ ہوگی اپنی غزل میں درد نے تصوف و معرفت کے مضامین نظم کیے ہیں۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ درد رنگینی کے شاعر نہیں مگر ان کا اندازِ سخن فقیر کی طرح سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے عبارت ہے اس سادگی کو اہل سخن نے سہل ممتنع کا نام دیا ہے ملاحظہ کیجیے:

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

شام بھی ہو چکی کہیں اب تو
آشتابی کہ رات جاتی ہے

خواجہ میر درد کا بے ساختہ انداز سخن گوئی جس میں ان کا جذباتی اثر بھی شامل ہے ہماری روزمرہ زندگی میں ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گیا ہے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

☆

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

دیگر اشعار میں درد کا سادہ مگر اثر انگیز رنگ ملاحظہ ہو

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
پیری چلی اور گئی جوانی اپنی — اے درد ! کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اس کو — کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی
تیرے دھوکے میں یہ دل ناداں — ہر کسی کو پکار اٹھتا ہے

درد کی شاعری تصوف اور عرفان سے بھر پور ہے۔ درد کی غزل کو ہم صوفیانہ غزل کہہ سکتے ہیں۔ نیز درد کی عشقیہ شاعری معرفت کی شاعری ہے جس میں عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجاز کا رنگ جھلکتا ہے جسے غزل کی مروجہ تعریف ''عورتوں سے باتیں کرنا'' سے مدغم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

☆...... میر حسن (۱۷۲۷ء تا ۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ء)

میر غلام حسن کا تخلص بھی حسن تھا۔ میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد میر غلام حسین اپنے زمانے کے مرثیہ گو شاعر تھے والد صاحب اور شعری گھوارے سے تعلق ہونے کی بنا پر بچپن ہی سے شعری مزاج تھا۔ فارسی میں بھی شاعری کی۔ اردو شاعری میں ضیاالدین ضیاؔ بعد

ازاں سودا سے اصلاح سخن لی۔ ان کی تصنیف ''سحر البیان'' جو کہ ایک مثنوی ہے اردو ادب میں ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میر حسن ایک رنگین اور عاشق مزاج شاعر تھے ان کی حسینوں کی طرف خاص رغبت تھی۔ عام زندگی تنگی و غربت میں گزری:

دل غم سے ترے لگا گئے ہم...... کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

میر حسن کے کلام میں لفظوں کا استعمال ایک آہنگ سے کیا گیا ہے۔ سبک، شیریں اور نرم الفاظ میں وہ صاف اور سادہ زبان کے پرچارک ہیں۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ '' کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو جواب ہم تم بول رہے ہیں۔'' جبکہ دوسری جگہ مزید لکھتے ہیں کہ '' ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی، مضامینِ عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر، سوز کا انداز بہت ملتا ہے:

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

☆

اس ادا کا ہوں میں دیوانہ کہ انگڑائی لے
مجھ سے کہتا ہے کہیں جایئے اور سو رہیے

☆

دیکھتی ہے یہ کس کی آنکھوں کو
کیوں کھلے ہیں یہ چشم نرگس کے

☆

آج دل بیقرار ہے کیا ہے
درد ہے انتظار ہے کیا ہے

☆

چشم بد دور تیری آنکھوں میں
نشہ ہے خمار ہے یا کیا ہے

☆...... خواجہ میر اثر (۱۱۴۸ھ تا ۱۲۰۹ھ/ ۳۶-۱۷۳۵-۱۷۹۴ء)

دلی چونکہ شعریت کا گہوارہ تھا لہذا یہاں کے رہنے والے بھی شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے خواجہ میر اثر، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی و مرید تھے۔ ان کی پرورش اور بود و باش میر درد کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ تصوف، موسیقی، علم ریاضی اور تاریخ گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ اردو شاعری کے حوالے سے آپ کا بنیادی حوالہ مثنوی ہے۔ اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور ریاضت میں گزارتے تھے تا مرگ دلی میں رہے دلی کی بربادی و بدحالی میں دلی کا دامن تھامے رکھا۔ دلی کا منظر نامہ ان کی شاعری میں غم، رنج ملال کی صورت میں ملتا ہے۔ نمونہ کلام ذیل میں متفرق اشعار میں ملاحظہ ہو

کیا کہوں میں اپنی پریشانی
دل کہیں، میں کہیں ہوں دھیان کہیں

ترے آنے کا احتمال رہا ‎ ‎ مرتے مرتے یہی خیال رہا
پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا ‎ ‎ جب تجھے ڈر کے ایک بار دیکھا
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن ‎ ‎ رات کٹتی نظر نہیں آتی
دل جو یوں بیقرار اپنا ہے ‎ ‎ اس میں کیا اختیار اپنا ہے
دل نے مجھ سے اثر کیا سو کیا ‎ ‎ کیا کہوں، مہربان نے اپنا
تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ ‎ ‎ ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں
بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر ‎ ‎ مجھ کو میری وفا راس نہیں
کون سنتا ہے یاں کسو کی بات ‎ ‎ بس اثر قصہ مختصر کیجیے

محولہ بالا اشعار اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل کے

میدان میں سہل ممتنع اور روانی زبان کے ساتھ خوب طبع آزمائی کی جو میر درد کی طرح سہل زبان اور آسان فہم ہے۔

☆...... جعفر علی حسرت (ولادت ۱۷۳۰ء وفات ۱۷۹۱ء)

آپ کا نام مرزا جعفری علی تھا جبکہ حسرت تخلص کرتے تھے آپ کا تعلق بھی دلی سے تھا پیدائش بھی دلی کی تھی۔ والد کا پیشہ عطاری تھا۔ حسرت نے بھی آبائی پیشہ اختیار رکھا، فارسی اور عربی پر قدرت حاصل تھی آپ کو ریختہ گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں رائے سدب سنگھ کے شاگرد تھے۔ زندگی کے آخری ایام لکھنؤ میں گزارے۔ آخری عمر میں ایک بزرگ کی صحبت اختیار کرتے ہوئے گوشہ نشین ہو گئے۔

اختر انصاری لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ میں سودا، سوز اور میر حسن کے دور میں جعفر علی خان ایک شاعر تھے وہ درحقیقت لکھنؤ اسکول کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنے دہلوی معاصرین کے رنگ سخن سے علیحدہ ایک ایسا رنگ اختیار کیا جو جذبات نگاری سے زیادہ واقعہ نویسی اور معاملہ بندی پر مبنی تھا۔''

حسرت کے کلام میں لکھنوی انداز و رجحانات نمایاں ہیں جسے بعد میں آنے والے شعرا نے بھی قبول کیا۔ حسرت کی کھل کھیلنے والی شاعری میں ہم کو خالص جذباتی رنگ کے اشعار بڑے پاکیزہ مل جاتے ہیں

رہنے دے مے کو ساقی، ہم تو چلے یہاں سے
قسمت میں جس کی ہوگی سو جام پی رہے گا

☆

دوپٹے کی بندھی گاتی کھلے تھے بال مکھڑے پر
نہ بھولے گی قیامت تک تمہاری رات والی سج

تیرا تو تب اعتبار کیجیے ‎ ‎ جب ہووے کچھ اعتبار اپنا
کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو ‎ ‎ جیسے تجھ بن کٹی ہماری رات

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دکھ سو بھر گئے ہم
کسی کا حال کوئی پوچھتا نہیں ہرگز — وفا کا رسم اٹھا حسرت اس زمانے سے

حسرت کی شاعری اپنے معاصرین میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہ کرسکی۔ بلکہ بعد میں آنے والے شعرا کی طبع آزمائی حسرت کی شاعری کی مانند معلوم ہوئی۔

☆...... شیخ قدرت اللہ قدرتؔ (۱۷۱۳ءتا۱۷۹۰ء)

شیخ قدرت اللہ قدرت جسے دنیائے ادب میں شاہ قدرت اللہ کے نام سے جانا جاتا ہے دہلی کے رہنے والے تھے آپ نے تمام عمر قلندرانہ روش میں بسر کی۔ میر شمس الدین فقیر سے اصلاح لیتے تھے۔ دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ چلے گئے اس کے بعد عظیم آباد ہجرت کی اور بعد میں مرشد آباد میں سکونت اختیار کی آپ فارسی اردو کے شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال ایک خاص حسن پیدا کرتا ہے:

رکھ نہ آنسو سے وصل کی امید...... کھارے پانی میں دال گلتی نہیں
گئے وہ دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے
درازیٔ شب غم کی مت پوچھ قدرت
کہ اک اک گھڑی اوس کو سو سو برس ہے

قدرت کا کلام معاصرین کے تقابل میں مختلف ہے ان کا اپنا انداز ہے وہ کسی ہم عصر کے مقلد نہیں ہیں انداز ملاحظہ ہو:

محبت کی جس آنکھوں میں نمی ہے...... جواہر کی اوسے پھر کیا کمی ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ''شاہ قدرت فکر وخیال کے شاعر ہیں ان کی شاعری کا رخ مابعد الطبعیاتی ہے جس میں شعور وادراک کے ساتھ جذبے کی گرمی شامل ہے۔ ان کے یہاں یہ گرمی تلاشِ حق کی بیتابی سے پیدا ہوئی ہے ان کی شاعری میں قرۃ العین طاہرہ کی سی آتشِ شوق وتلاشِ منزل کا احساس ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ قدرت کا دل باب آتش ہے

اوران کا سارا وجود ہجر کی آتش شوق سے جل رہا ہے۔ یہ ہجر وہ ہے جو ہر دم تلاش محبوب میں سفر جاری رکھنے پر آمادہ رکھتا ہے اور جب منزل آتی ہے تو یہ رشتہ سایہ وآفتاب کا رشتہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے شاہ قدرت کا عشق آگ اورسر ہے اور اسی لیے ان کے ہاں آتش، سوز، آگ، طپش (تپش)، شرار، تجلی شعلہ کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ داغ، اشک اور آنسو بھی آتش وسوز کی ایک صورت ہیں۔''

☆...... شیخ غلام علی راسخ (۱۱۷۰ھ۔۱۲۳۸ھ/ ۱۷۵۷ء۔۱۸۲۳ء)

شیخ غلام علی راسخ دہلوی روایت کے ممتاز شاعر ہیں آپ کے جد امجد دہلی سے عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے تھے راسخ کی پیدائش اور بود وباش عظیم آباد کی ہے۔ راسخ عشقیہ شاعری کے امین ہیں، مرزا علی فدوی کے شاگرد تھے۔ راسخ نے سلسلہ معاش میں کلکتہ، بنارس اور لکھنؤ کا سفر کیا آپ کی زندگی تنگدستی کا شکار رہی۔

ہم محنت کشوں کے دن نہ پھرے...... گو زمانے کو انقلاب رہا

امداد امام اثر لکھتے ہیں کہ ''حضرت راسخ مرحوم فقیر طبیعت اور فقیر دوست آدمی تھے۔ اکثر شاہ باقر کے تکیے پر قیام رکھتے تھے۔ اہلِ دولت سے کم ملتے تھے۔ صحبت فقرا میں ہمیشہ رہتے تھے''، جس کا اظہار اپنے کلام میں یوں کیا ہے:

امیرانِ جہاں سے قطع آمیزش کرو راسخ
فقیروں سے ملو صاحب اگر شوقِ فقیری ہے

راسخ اپنی عشقیہ کیفیت میں ڈوب کر جو آتش عشق کا الاؤ بھڑکاتے ہیں اس کے نتیجے میں جو کلام سامنے آیا ہے وہ ایک عام فہم آدمی سمجھ نہیں سکتا اسے سمجھنے کے لیے ایک مزاج چاہیے:

عبارت ہے فراق دوست دل کی بے حضوری سے
وصال دوست کیا ہے درمیاں سے اٹھنا غفلت کا
صحرائے عشق تھا عجب اک دشتِ ہولناک
واں شہر کے قدم پہ ہمارا قدم رہا

اس قلم رو سے خرد کے نکلو سیّاحی کرو
کب تلک شہری رہو گے جاؤ صحرائی بنو

ہے اسیرانِ محبت کی رہائی دشوار
ہائے ' یہ لوگ تو مر کر بھی گرفتار رہے

راسخ بنیادی طور پر عشقیہ شاعر ہیں لہٰذا تصوف کا رنگ ان کی شاعری کا ایک جز ہے جو ذیل کے شعر میں نمایاں ہے:

رفتہ سا میں اپنے ادراک حقیقت میں رہا
کون ہوں کیا ہوں نہ سمجھا بند حیرت میں رہا

☆...... سید انشاء اللہ خان انشاء (۱دسمبر۱۷۵۲ءتا۱۹مئی۱۸۱۷ء)

سید انشاء اللہ خان انشاء مرشد آباد میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم شاہی طبیب تھے انشاء کو کافی زبانوں پر عبور حاصل تھا اصلاح اپنے والد سے لیتے تھے نیز میر سوز اور درد اور مصحفی سے اصلاح لی۔ کارِ سخن نہ چل سکا اور ان بن ہوتی رہی۔ مصحفی کی تو ہجو تک لکھی دلی کے تمام شعراء سے ان بن رہتی تھی۔ انشا اردو، فارسی و عربی کے علاوہ ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، مارواڑی، مرہٹی، کشمیری اور ہندی زبانیں جانتے تھے۔ طنزِ لطیف میں ماہر تھے لطائف و چٹکلوں میں کمال حاصل تھا۔ اردو، فارسی، ریختی دیوان کے علاوہ دریائے لطافت (قواعد اردو) اور کئی مثنویاں ان کی یادگار ہیں، نیز ایک مثنوی غیر منقوط بھی ملتی ہے۔

نمونۂ کلام

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی ہیں جو تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

☆

جگر کی آگ بجھے جلد جس میں وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مئے لا

☆

گر یار مئے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

☆

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

☆

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو
ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

انشاء کے کلام میں ظرافت کے رنگ:

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

دل ستم زدہ بے تابیوں نے لوٹ لیا
ہمارے قبلے کو وہابیوں نے لوٹ لیا

کہانی ایک سنائی جو ہیر رانجھے کی
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

☆...... غلام ہمدانی مصحفی (۱۷۴۸ءتا۱۸۲۴ء)

غلام ہمدانی المتخلص مصحفی اردو شاعری کے وہ مضبوط شاعر ہیں کہ جو کلاسیکی اور عہد قدیم

میں میر تقی میر کے بعد صاحب سند و اعتبار شاعر ہیں۔ آپ کی پیدائش امروہہ کی ہے جب دلی آئے تو قائم چاند پوری سے اصلاح سخن لیتے رہے، بعد ازاں مالی پریشانی کے باعث لکھنؤ تشریف لے گئے اور مرزا سلمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو کر ان کے کام پر اصلاح دینے لگے۔ انشاء اور مصحفی میں زبردست ادبی معرکے ہوئے جو ہنگامہ آرائی تک جا پہنچے۔ مصحفی زود گو شاعر تھے ان کے کلام میں قلبی واردات' سوز و گداز اور شیرینی خصوصیت کے ساتھ ملتی ہے۔ ایک تذکرے کے مطابق مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کے مطابق ''مصحفی میں میر و سودا' فغاں و سوز' جرات و شاہ نصیر سب کا رنگ پایا جاتا ہے اور جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور استادی یکجا کر دیتی ہے تو ان کا شمار اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔''

مصحفی کا شمار دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے با کمال اور قادر الکلام شاعر تھے آپ چونکہ دہلوی شاعری کے امین بھی تھے لہذا دو دبستانوں کی شعری روایتوں اور خصوصیات کو ہم آہنگ کر کے غزل کے دامن کو مزید وسعت پذیر کیا۔

دلی کے حسن و جمال و اطوار پر مبنی ایک خیال:

اے مصحفی! تو اِن سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضیلی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

نمونۂ کلام:

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

☆

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

☆

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

☆

پھٹ چکا جب سے گریباں، تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں

☆

گھر کا دروازہ جو ہم صبح کو وا کرتے ہیں
شام تک تیری ہی بس راہ تکا کرتے ہیں

☆

ہزاروں حوادث ہیں' تازندگی ہے
یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

☆...... شیخ امام بخش ناسخ (۱۰ اپریل ۱۷۷۲ء تا ۱۵ اگست ۱۸۳۸ء)

دبستان لکھنؤ کے بانی شاعر' زبان دانی و زبان شناسی کے ماہر شیخ امام بخش ناسخ ۱۰ اپریل ۱۷۷۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے تمام عمر مجرد گزاری۔ اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب عطا کیا آپ قوی ہیکل آدمی تھے ورزش سے لگاؤ تھا نہایت وضع دار انسان تھے۔ اردو شاعری میں ناسخ کو استاد فن کا درجہ حاصل ہے۔ عبدالسلام ندوی کے مطابق ''ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا۔ آج تمام شعراء اسی زبان کے مقلد ہیں'' ممتاز نقاد رشید حسن خان ناسخ کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں ''ناسخ ان لوگوں میں سے تھے جن کے نزدیک پھول کے وجود سے زیاہ پھول کا لفظ اہمیت رکھتا ہے۔ چاندنی کے تاثرات کیا ہوں گے یہ ثانوی بات ہے چاندنی کے لفظ سے کون کون سے تلازمے فراہم کیے جا سکتے ہیں اور ان کی مدد سے کتنے استعاروں کی صورت تراشی جا سکتی ہے اوّلین اہمیت اس کی ہے۔ لفظ پرستی اور صورت شناسی کی یہ صفت جب مزاج پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے

تب معنویت کا پہلو دب جاتا ہے اور صورتوں کا جلوہ چھا جاتا ہے۔'' اس طرح سے انہوں نے اردو زبان کی اصلاح کی آپ نے غزل، قطعات، رباعی تاریخی قطعات میں طبع آزمائی کی نیز مثنوی میں بھی کمال حاصل کیا۔

ناسخ کا اندازِ سخن (غزل)

سو قصوں سے بہتر ہے کہانی مرے دل کی
سُن اس کو تو اے جان زبانی مرے دل کی
ہر نالے میں یاں ٹکڑے جگر ہوتا ہے بلبل
آسان نہیں طرز اڑانی مرے دل کی
ہونی ہے شہید ایک نہ اک روز تمنا
موقوف ہوگیا مرثیہ خوانی مرے دل کی
پیری میں بھی ملتا ہے جو کمسن کوئی محبوب
کرتی ہے وہیں عود جانی مرے دل کی
اک بات میں ہوجائے مسخر وہ پری رو
سنتا ہی نہیں سحر بیانی مرے دل کی
زلفوں میں کیا قید نہ ابرو سے کیا قتل
تو نے تو کوئی بات نہ مانی مرے دل کی
یہ بارِ غمِ عشق سمایا ہے کہ ناسخ
ہے کوہ سے وہ چند گرانی مرے دل کی

متفرق اشعار:

وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

☆

کب سے ناسخ کی جستجو تھی مجھے
آج وہ خانماں خراب ملا

☆

زندگی زندہ دلی کا نام ہے پیارے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

☆

وہ پری پیکر کہا کرتا ہے اکثر فخر سے
اب تو ناسخ بھی ہمارے چاہنے والے ہوئے

☆

شبِ فراق گئی، روزِ وصل آ پہنچا
طلوع صبح ہے، عالم تمام روشن ہے

☆ ...... خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۶۴ء تا ۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء)

اردو غزل کے مرصع ساز خواجہ حیدر علی آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد کا تعلق بغداد سے تھا۔ آپ کے والد محترم خواجہ علی بخش کا سایہ آتش کے سر سے بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا۔ آتش کے مزاج میں بانکپن اور شوریدہ سری تھی۔ آتش نے اصلاح سخن مصحفی سے لی آتش آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کی اور کسی دربار سے وابستگی نہیں رکھی اور نہ ہی کسی دربار کی شان میں مدح سرائی کی اور نہ کوئی قصیدہ لکھا۔

آتش کی غزل کے لیے خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں ''اردو غزل کی تاریخ میں آتش پہلا شاعر ہے جس کے یہاں زندگی کے بارے میں ہم اثباتی نقطہ نظر پاتے ہیں اور بجائے یاس و ناامیدی کے لذت و ہوس یا سکون و جمود سے نبرد آزمائی، صحت مند نشاط و سرشاری اور زندگی سے بھرپور امید اور رجائی انداز ملتا ہے۔'' نیز لکھتے ہیں کہ ''آتش ہی لکھنوی دبستان کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ناسخ کے پاس صرف

کرتب تھا۔ استادی اور زبان دانی کا دعویٰ تھا لیکن آتش اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ وہ وجدان اور احساس جمال کے مالک تھے' آتش کا کلام سونے پر سہاگہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناسخ تخلیقی قوت کے فقدان کی وجہ سے ذہنی ورزش کی طرف مائل رہے۔ اس لیے ان کا کلام زندگی سے دور جا پڑا اور اس میں کوئی رس پانی نہ رہا۔'' آتش کی غزل میں لکھنوی اور دہلوی سنگم ملتا ہے:

دہلوی اثرات:

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
بڑا شور سنتے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خوں نہ نکلا

لکھنوی اثرات:

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے
شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ جب آتش جواں تھا

آتش کے کلام میں تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال ایک حسن اور آہنگ پیدا کر دیتا ہے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

آتش کے لیے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ ''میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں'' ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مطابق ''آتش کے یہاں عام لکھنوی رنگ کے اشعار کافی ہیں لیکن اکثر اشعار میں درد و تاثر ہے۔''

آتش کی غزل:

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر اگر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے
یہ کعبہ سے نہیں ہے وجہ نسبت رخ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے
نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ' جو باراں کی آرزو کرتے

متفرق اشعار:

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہوگیا شبنم کو آفتاب آیا

☆

دو گھڑی بیٹھے' تکلیف جو کی ہے صاحب
بعد مدت کے تم آئے ہو ادھر آج کی رات

☆

سامنے آئینہ رکھتے تو غش آ جاتا
تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

☆

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے' ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے، چلیے سدھاریئے

خواجہ آتش کے کلام میں لطیف و نازک احساسات ملتے ہیں ان کے کلام میں روزمرہ کی بول چال نمایاں ہے۔

☆...... حکیم مومن خان مومن (۱۸۰۱ء تا ۱۴ مئی ۱۸۵۲ء)

مرزا غالب کے ہم عصر حکیم مومن خان مومن ۱۸۰۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق دبستان دہلی سے تھا۔ نام مومن خان اور تخلص مومن تھا موروثی پیشہ طب تھا لہٰذا حکیم مومن خان مومن کہلائے۔ مومن کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ فارسی' عربی' طب' نجوم اور موسیقی میں کمال حاصل کیا جبکہ شعری سفر میں قصیدہ' رباعی' واسوخت' غزل' ترکیب بند اور مثنوی میں کھل کر طبع آزمائی کی۔ مومن ایک خوددار انسان تھے رؤسا کی محفلوں سے دور رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ کسی دربار سے وابستہ نہ رہے۔ مشہور نقاد علامہ نیاز فتح پوری مومن سے یوں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں'' اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھے صرف ایک دیوان کو حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا کر لے جاؤ۔''

مومن کی شاعری میں عاشق مزاجی کا چرچا ملتا ہے۔ آپ خوش وضع رنگین مزاج خوددار اور غیرت مند تھے آپ کی شاعری میں محبت' عشق' عاشق' رقیب' ہجر و وصل کا چرچا ہے حسن و

عشق مومن کا محبوب موضوع ہے:

قیس کی دیوانگی میں عقل کیا حیران ہے
مجھ کو وحشت ہوگئی تصویرِ لیلیٰ دیکھ کر

مومن کے کلام میں شکوہ' شکایت کا ایک اپنا انداز ہے وہ وعدے بھی یاد دلاتے ہیں اور اپنی محرومی کا ذکر جب کرتے ہیں تو واسوخت کے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں:

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نبھاہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا
کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

ڈاکٹر سید عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ ''مومن کے یہاں نہ تو میر کا سوز ہے اور نہ جرات کی سی بے باکی۔ انہوں نے دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا ہے۔''

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

☆

بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی
مومن کو یاد کیا حجرالاسود آ گیا

مرزا غالب نے اپنے ہم عصر کے معترف ہوتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے بس یہ ایک شعر دے دو اور میرا پورا کلام لے لو:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

☆

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے ''مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرہ آفاق ہے۔''

شعلہ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

☆

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشہ کسی کا

کچھ ایسا پیرایہ اظہار اور روزمرہ کی زبان کا حصہ اور زبان زدِ عام ٹھہرا:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

☆

کل جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

☆

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ''اردو شاعری کی وہ شمع جو مومن کے ہاتھوں روشن ہوئی ہے تو اسے وقت کی آندھی نہیں بجھا سکے گی۔''

محمد حسین آزاد کی رائے میں ''غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین اعلیٰ ہیں الغرض مومن تغزل اور عاشقانہ رنگ کا امام ہے'' یہ درست ہے کہ مومن کے اسلوبِ

شاعری میں ہمیں کسی اور شاعر کی تقلید یا چھاپ نظر نہیں آتی۔

مومن کی ایک غزل:

آہ طولِ امل نے روز افزوں
گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ساتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنیں عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

☆ ...... شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (۲۲ اگست ۱۷۹۰ء۔ ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء)

شیخ محمد ابراہیم ذوق کا تعلق دبستان دہلی سے ہے۔ ذوق اپنے دور کے وہ شاعر ہیں جن کی شعر گوئی اور قادر الکلامی سے اُن کے استاد شاہ نصیر خائف ہوگئے تھے کہ کہیں شاگرد استاد سے آگے نہ مقام بنالے لیکن قسمت جن کا ساتھ دے۔ ذوق کی رسائی قلعہ معلیٰ تک ہوگئی اور ولی عہد شہزاد ظفر ان سے اصلاح لینے لگے اور خاقانی ہند کا خطاب حاصل کیا۔ بعد ازاں ظفر جب بادشاہ بنے تو انہیں ملک الشعراء کا منصب عطا کیا تھا ذوق کے کلام میں زبان کی سادگی'

سہل ممتنع کا رنگ لیے ہوئے مگر وہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیفوں میں کمال رکھتے تھے ذوق نے اپنے بل بوتے پر شعری کمال حاصل کیا وہ نہایت حلیم الطبع، خلیق، بامروت، رحم دل اور قناعت پسند انسان تھے۔ کافی کلام غدر دہلی میں تلف ہوگیا۔ آج کا کلام ان کے شاگرد محمد حسین آزاد نے ترتیب دیا اور شائع کیا ذوق نے اپنے انتقال سے کچھ دیر قبل ذیل کا شعر کہا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق کی شعری زبان دہلی کی زبان اور محاورہ کی سند مانی جاتی ہے آپ بہت زود گو شاعر تھے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کہتے ہیں کہ کسی شاگرد کی غزل واپس نہیں کرتے تھے اسی وقت اصلاح فرما دیا کرتے تھے۔ تنویر علوی کے مطابق ''ذوق اپنے عہد کے قدیمانہ فضا' کلاسیکی طرز فکر اور ماضی سے وابستہ تہذیبی اقدار کے نمائندہ شاعر ہیں'' اردو شاعری میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
پانی طبیب دے گا ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل ہے زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
ذوق اس صورت کدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں
خوب روکا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

☆

جاتا ہے بند آنکھیں کیے ذوق کیا کہ دیکھ
یہ راہ کوئے یار ہے، کوئے عدم نہیں

☆

کتنے مفلس ہوگئے کتنے تونگر ہوگئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہوگئے

ذوق کی ایک غزل:

خط بڑھا کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے بندو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے
چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی اس سے رسم و راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے
پیشوائی کو غم جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اس سے پیش تر آنسو بڑھے

☆...... بہادر شاہ ظفر (۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء تا ۷ نومبر ۱۸۶۲ء)

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

محولہ بالا شعر بہادر شاہ ظفر کی پوری زندگی کا نقشہ ہے یا یوں کہیے کہ ان کے آخری ایام کی کسمپرسی کا عکاس ہے۔ آپ مغلیہ شاہی خاندان کے آخری بادشاہ تھے جن کو انگریزوں نے معزول کر کے رنگون میں قید کیا۔ آپ نے وہیں انتقال کیا اور رنگون میں مدفون ہیں۔ ظفر کی بود و باش چونکہ شاہی انداز میں ہوئی تھی لہذا فنون لطیفہ/شعر گوئی سے شغف فطری تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو یہ فخر و اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شاہ نصیر، ذوق دہلوی اور مرزا غالب سے اکتساب

فیض کیا۔ظفر کے کلام میں سادگی اور برجستگی نمایاں ہے:

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیے دل کو مرے بہلائے کون

سید ضمیر حسن دہلوی، بہادر شاہ ظفر کے کلام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں ''ظفر بادشاہ تھا، صوفی تھا، شاعر تھا، اہل زبان تھا، پاک باز تھا اور دردمند تھا چنانچہ اس کے کلام میں اس کی شخصیت کے یہ تمام پہلو نمایاں ہیں۔'' بہادر شاہ ظفر کی شاعری سے چند انتخابات:

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا اپنے سر لیتے تو ہم لیتے
لگایا جام مئے ہونٹوں سے اس نے ہم کو رشک آیا
کہ بوسہ اس کے لب کا اے ظفر لیتے تو ہم لیتے

بہادر شاہ ظفر کے اندازِ سخن گوئی میں جہاں سادگی کا عنصر نمایاں ہے وہاں ان کے کلام میں معصومانہ سادگی، بے تکلفی میر کی مانند نشتر اور نغمگی و شگفتگی ان کے رنگ تغزل میں اضافہ لیے ہوئے ہے:

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
ہائے خوباں کوئی زنداں میں بنا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
خواب عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے
دیکھا نہ تجھ کو اور اسی حسرت میں سو گئے
تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں
ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

نہ پوچھ مجھ سے ظفر میری تو حقیقت حال
اگر کہوں گا، ابھی تجھ کو میں رُلا دوں گا
جو اس کی جاں پہ گذرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے
یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا ہے
کسی کو دیکھنا اتنا نہیں حقیقت میں
ظفؔر میں اپنی حقیقت کہوں تو کس سے کہوں

☆...... **مرزا اسداللہ خان غالب (۸رجب ۱۲۱۲ء/ ۲۷دسمبر ۱۷۹۷تا۱۲۸۵ھ/ ۱۵فروری ۱۸۹۶ء)**

مرزا غالب کو دہلوی ہونے پر بڑا فخر تھا آپ کے جدامجد سمرقند سے ہندوستان آئے تھے ان کی وابستگی شاہی دربار سے تھی غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان ریاست الور میں ملازمت کرتے تھے غالب کے شعری سفر کا آغاز ۱۸۵۷ سے ملتا ہے اولاً تخلص اسد تھا مگر بعد میں غالب رکھ لیا غالب کا شمار کلاسیکیت، رومان پرور اور جدّت نگار شعراء میں ہوتا ہے ۔ جدیدیت اس انداز سے کہ وہ اپنے دور میں جو افکار مشقِ سخن کیے وہ عصرِ حاضر میں بھی موجود ہیں بلکہ ایجاد ہوئے ہیں غالب کی شاعری میں دو سو سال پہلے بیان کیے گئے مضامین آج بھی ہماری زندگی کا لازمی جز ہیں۔ غالب کا شمار زندہ دل شگفتہ مزاج شعرا میں ہوتا ہے۔ غالب کو دلی سے عشق تھا دم آخر تک دلی میں مقیم رہے غالب کی ابتدائی شاعری میں فارسی کی آمیزش نمایاں ہے جو بعد ازاں کم ہوتی چلی گئی غالب کو اپنی فارسی دانی پر بہت ناز تھا۔ وہ خود کو صاحب فصاحت و بلاغت سمجھتے تھے۔ غالب کے مزاج میں فلسفیانہ انداز بہت واضح ہے روحانی لگاوٹ اور تصوف کی چاشنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے نیز کلام میں سرمستی، سرشاری اور جراتِ رندانہ بھی سر چڑھ کر بولتی ہے۔

رنگ ملاحظہ ہو:

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

☆

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

☆

ہے آدمی بجائے خود ایک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

☆

بات پر واں زباں کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

☆

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

☆

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

☆

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

☆

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

☆

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

☆

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

غالب کے کلام میں ان کا اپنا لہجہ ہے جو ان کو کلاسیکی شعرا میں ممتاز مقام دلاتا ہے کہ یہی غالب کی انفرادیت ہے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

☆

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

غالب کی زندگی مدوجزر کا شکار رہی۔ شاہی منصب بھی عطا ہوا اور پس زنداں بھی رہے۔ نیز در بہ در کی ٹھوکریں بھی کھائیں۔ ۱۸۵۰ء میں مرزا غالب کو بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کیا۔ غالب کے دور میں غزل میں نئے مضامین جدّت آمیز لہجے میں وارد ہوئے اور غزل کو ایک نئی جہت سے نوازا۔ ماہر انتقادیات کہتے ہیں کہ غالب نے غزل کے فن کو مکمل کر دیا۔ میری ناقص رائے کے مطابق یہ جملہ ادھورا ہے۔ غالب نے نثر نگاری میں وہ کارنامے انجام دیئے، وہ اردو نثر میں جدید اسلوب کے بانی ہیں۔ اردوئے معلیٰ ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اردو نثر میں ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر نعیم تقوی لکھتے ہیں کہ ''مرزا غالب نے بحیثیت شاعرِ امروز وفردا جو انداز اختیار کیا انہیں اس سلسلہ میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلہ

کی پروا کیے بغیر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے رہے۔''

غالب کی زندگی جرات رندانہ و بے باکی سے عبارت ہے وہ ہر ایک موضوع میں نیا موضوع تلاش کرتے تھے گویا جستجو گوہر نایاب میں گم رہتے تھے۔ وہ ہجر وفراق میں وصل اور دکھ درد غم اندوہ میں نشاط کے پہلو تلاش کرنے میں مصروف رہے زندگی میں شاہی طرز' در بہ در کی ٹھوکریں' پنشن کی بندش' کسمپرسی' آلام ومصائب نہ جانے کیا کیا غموں کے پہاڑ برداشت کیے مگر پھر بھی یوں کہتے رہے کہ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

پھر زندگی کے پرخار راستوں پر چلتے ہوئے گھبراتے نہیں بلکہ ان آبلہ پا کو مسرت و شادمانی کا حصول سمجھتے تھے

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

غالب کا تعلق ایک نواب خاندان سے تھا جس نے آسائشیں بھی دیکھی تھیں اور امارت کی جلوہ سامانیوں سے بھی لطف اندوز رہے۔ کہتے ہیں کہ وقت یکساں نہیں رہتا تو یہ حرماں نصیبی کا دور غالب پر بھی آیا وہ اکثر اچھے دنوں مہ رخ چہروں کو یاد کرتے تھے جو آخری عمر میں عنقا تھے ان حسین یادوں کے سہارے غالب کہتے ہیں کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

☆

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا وہ دل نہیں رہا

☆

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شبِ ماہتاب میں

محبوب کی یاد اس کا سراپا غالب کے دل ودماغ پر چھایا رہتا تھا وہ زلفوں کی چھاؤں میں مسرت جاوداں کے متلاشی رہتے تھے محبوب کا سراپا اور نشاط افزا لمحات کو ذیل کے شعر میں ایک منفرد انداز میں بیان کیا ہے جس کی مثال اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی غالب کا انداز:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہوگئیں

مرزا غالب کا اندازِ خودداری ملاحظہ ہو

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

غالب اپنی زندگی کے مدوجزر اور پریشانی کے عالم میں یوں گویا ہوئے

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

یہ غالب ہی کا خاصہ واعزاز ہے سرسید احمد خان نے مرزا غالب کو شہنشاہِ سخن مانا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ غالب کی طبع آزمائی تھی جس نے اردو شاعری میں یہ ایک وہ قلعہ تسخیر کیا جسے آج مشعل راہ مانا جاتا ہے اور اردو شاعری میں جس کی تقلید آج بھی جاری ہے۔ غالب نے شعری جنوں کو نیا اسلوب عطا کیا۔ نئی معنویت کا اضافہ کیا اور اردو شاعری میں فکری جامعیت کو روشناس کرواتے ہوئے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

محولہ بالا شعر ایک ایسی شعری فکر کی نشاندہی کرتا ہے جس کا تعلق غیبی مضامین والہام سے ہے غالب اپنی شاعری کو دوسروں کے مقابلے میں اسی بنیاد پر برتر ثابت کرتے ہیں کہ ان کی شعری بصیرت اور روشن خیالی اور اپنے اثباتِ ذات جیسے مضامین ان کی شاعری کا خاصہ ہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل نہیں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

☆

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

☆

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غالب کی شاعری اور شعری عظمت کو وہی قاری سمجھ سکتا ہے جس کو زبان دانی کی سوجھ بوجھ ہو ان کی شاعری کا حسن اور اندازِ بیان ان کی شعری گہرائی میں پنہاں ہے غالب بڑی سے بڑی بات نہایت سادہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔ سادہ اور دلکش انداز ملاحظہ فرمائیں:

عشق نے غالب نکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

☆

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

☆

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

☆

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

☆

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

عظمتِ غالب پر لکھنے کو تو بہت کچھ ہے مگر یہی سب کچھ ہے کہ غالب ہی غالب ہے آخر میں ایک شعر کہ جس میں غالب نے پوری انسانی زندگی کو سمو دیا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا' کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے' نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

☆...... نواب مصطفٰے خان شیفتہ (۲۷دسمبر۱۸۰۹ء تا ۱۱جولائی ۱۸۶۹ء)

مصطفٰے خان جہانگیر آباد کے جاگیردار گھر میں پیدا ہوئے آپ کی شناخت دہلی سے ہے آپ کا شمار شاعر اور نقاد کی حیثیت سے ہوتا ہے آپ کا شمار غالب کے عہد میں ایک وضع دار شاعر اور ذی شعور نقاد اور تذکرہ نگار کے طور پر ملتا ہے۔ پہلے مومن خان مومن سے اصلاح لیتے رہے اور بعد میں مرزا غالب سے بھی فیض یاب ہوئے۔ شیفتہ کا شمار غالب کے تلامذہ میں ہوتا ہے شیفتہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے فارسی کلام میں آپ کا تخلص ''حسرت'' کے طور پر ملتا ہے شیفتہ کو ۱۸۵۷ء کی غدر یا جنگ آزادی میں عتاب سہنا پڑا۔ ان کی ذاتی لائبریری کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی اور خود بھی سرکار کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ سات سال سزا ہوئی مگر بعد میں ہندوستان کے نامور عالم نواب صدیق حسن کی دادرسی کام آئی اور سزا معاف ہوئی اور پنشن مقرر ہوئی کہاں جاگیردار و نواب خاندان اور کہاں پنشن۔ آپ کے کلام میں گلشنِ بے خار اور تقریظ غالب پر تعریفی تنقید شامل ہیں۔

شیفتہ کا اپنے وطن دلی سے محبت کا انداز ملاحظہ ہو:

ویرانے کی مانند کہیں دل نہیں لگتا ہے
ہر چند کہ ہے شیفتہ دلی وطن اپنا

نمونہ کلام:

وہ غیر کے گھر نغمہ سرا ہوں گے مگر کب
جب ہم سے کوئی نالہ سرانجام نہ ہوگا
قاصد کو کیا قتل ، کبوتر کو کیا ذبح
لے جائے مرا اب کوئی پیغام نہ ہوگا
لکھا ہے خط میں حال دلِ بے قرار کا
ہوگا ضرور شیفتہ حامل کو اضطراب
عرض تمنا سے رہا بے قرار
شب وہ مجھے میں اسے چھیڑا کیا
کیا بن گیا ہوں صورتِ دیوار دیکھنا
صورت کسی کی میں سرِ دیوار دیکھ کر
روداد میں ہیں شیفتہ کے مختلف اقوال
پوچھیں گے وہاں سے جو کوئی معتبر آیا

☆...... بیخود دہلوی (۲۱ مارچ ۱۸۶۳ء تا ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۵ء)

سید وحید الدین احمد معروف شاعر سید شمس الدین سالم کے فرزند تھے آپ کو شاعری ورثے میں ملی تھی آپ کا شمار دہلی کے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری دہلی کی صاف اور نکھری ہوئی زبان میں ہے۔ بیخود تغزل کے شاعر ہیں اور اردو زبان پر قدرت رکھتے تھے بیخود کے کلام میں نزاکت خیال مومن سے اور سادگی وسلاست غالب سے در آئی ہے بے خود چونکہ داغ دہلوی کے جانشین اور شاگرد تھے چنانچہ ان کی غزلوں میں داغ کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ اردو غزل کا ایک روشن عہد گزارنے کے بعد ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ بیخود تمام عمر اپنی شاعری پر نازاں رہے ان کی شعری زبان میں حسن بیانِ، طرزِ ادا اور زبان کی چاشنی ان کی دلی کی زبان کو مزید دو آتشہ بنا دیتا ہے بیخود دہلوی کا شعری سفر کم وبیش چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔

53

نمونہ خیال:

ابرِ رحمت امنڈ آتا ہے
جب خیالِ گناہ کرتا ہوں
شمع مزار تھی ، نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے وہ کس کا مزار تھا
یہ دل کبھی نہ محبت میں کامیاب ہوا
مجھے خراب کیا آپ بھی خراب ہوا
نامہ بر یہ تو کہی بات پتے کی تو نے
ذکر اس بزم میں رہتا ہے اکثر اپنا
آپ کو رنج ہوا آپ کے دشمن روئے
میں پشیمان ہوا حال سنا کر اپنا
کیا کہہ دیا آپ نے چپکے سے کان میں
دل کا سنبھالنا مجھے دشوار ہوگیا
رند مشرب کوئی بے خود سا نہ ہوگا واللہ
پی کے مسجد میں یہ خانہ خراب آیا ہے
اور تو تم سے کیا نہیں ہوتا
ایک وعدہ وفا نہیں ہوتا

☆......☆

اُردو غزل بہ عہدِ داغ، حالی اور اقبال

غالب کے عہد سے غزل نے نیا روپ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا اور غزل کا لہجہ اور غزل کے مضامین جدید عہد کے پہلے زینے پر قدم رکھ چکے تھے۔ عزیز حامد مدنی کے مطابق ''اردو کی جدید شاعری کا فکری تسلسل غالب و حالی کے دور سے ہوتا ہوا، اقبال تک آیا اور اس عروج کی منزل پر پہنچ کر رخ بدلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ایک طرف ہماری تہذیبوں کی قدریں تھیں دوسری طرف مغربی فکر کے وہ اثرات جو ہمارے یہاں قبول ہوتے رہے۔'' زیر مطالعہ اردو غزل کے بدلتے ہوئے رنگ ۱۸۷۰ء ۱۹۳۶ء کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ اردو غزل کے زریں دور کا تسلسل اور مزید ارتقاء ہے۔

☆...... امیر مینائی (۲۱ فروری ۱۸۲۹ء تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء)

امیر مینائی کا شمار دبستان لکھنؤ کے آخری نمائندہ شاعر کے طور پر ہوتا ہے ان کے کلام میں برجستگی، بے تکلفانہ گفتگو اور شوخی نمایاں ہے۔ چھوٹی بحروں میں اظہار پر مکمل قدرت تھی آپ شعری طبع آزمائی کے ساتھ لغت نویسی بھی کرتے تھے نیز لسانیات پر بھی کام سامنے آیا ہے۔ آپ نعت گوئی میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے آپ خاندان صابریہ، چشتیہ کے سجادہ نشین حضرت امیر شاہ سے بیعت تھے۔ آپ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ امیر اللغات کی دو جلدیں آپ سے یادگار ہیں امیر مینائی کی غزلوں میں معاملہ بندی کا رجحان نظر نہیں آتا۔ آپ نے کلام کا انبار نہیں لگایا۔ ابتذال سے دور تھے۔ آپ کی قصیدہ نگاری بھی اعلیٰ درجے کی حامل ہے۔ امیر مینائی کے کلام میں زبان کی لطافت، محاورات و رعایت لفظی اور الفاظ کی ہم آہنگی ملاحظہ فرمائیں:

جھونکا ادھر نہ آئے نسیمِ بہار کا
نازک بہت ہے پھول چراغِ مزار کا

امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا
نگاہیں بول اٹھیں وہ لے لیا دل
آپ خود دیکھتے چلتے ہیں وہ جوبن اپنا
دیکھتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ کیا دیکھتے ہو
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیر مینائی اپنے دور کے شعری میلانات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسی ڈگر چلے جس نے ان کو اپنے عہد کے عظیم شاعر کے طور پر پروان چڑھایا انہوں نے داغ دہلوی کے مقابلے میں اپنے رنگ تغزل کو منوایا یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ کوئی تصنع، مبالغہ آرائی نہیں بس سیدھا سادا سلیس اور آسان اسلوب اپنا کر خود کو منوایا۔

نمونہ کلام:

مسکرائے وہ اس ادا سے امیرؔ
میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی
ان کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے
خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی
ہوتے ہیں تر پسینہ سے آغوش میں حسیں
پھولوں سے مجھ کو ڈھب ہے مرے عرق کی کشید کا
وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

محولہ بالا اشعار کے حوالے سے امیر مینائی بلاشبہ اپنے سلاست و سادگی اور مضمون

آ فرینی کے ساتھ دبستان لکھنؤ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور یہ کہ امیر مینائی دبستان لکھنؤ کے آخری نمائندہ شاعر کے طور پر بھی یاد رکھے جائیں گے۔

☆...... **نواب ابراہیم مرزا خان داغ دہلوی (۲۵مئی ۱۸۳۱ء تا ۱۷مارچ ۱۸۹۰ء)**

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ دہلوی کا شمار ذوق کے لائق شاگردوں میں ہوتا ہے جبکہ داغ کے شاگردوں میں علامہ اقبال، جگرمرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، احسن مارہروی اور نوح ناروی شامل ہیں داغ نے غدر کے بعد دربدری دیکھی مگر رام پور میں نواب کلب علی خان کے زیرسایہ سکون کے دن گزارے اور زندگی کے ۴۲ سال خوشحالی میں گزارے۔ جس طرح امیر مینائی دبستان لکھنؤ کے آخری نمائندہ شاعر ہیں اس طرح داغ کو دبستان دہلی کے آخری نمائندہ شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ داغ کے غزلیہ انداز میں غیر معمولی شوخی اور تیکھاپن، برجستگی، روانی اور نزاکت خیالی کا چرچا ہے۔ داغ نے ثقیل فارسی تراکیب واستعارات سے گریز کرتے ہوئے سادگی وسلاست کو مقدم رکھا۔ نظام والی حیدرآباد نے بلبلِ ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیرالدولہ، فصیح الملک جیسے خطابات سے نوازا۔ اس عزت نوازی اور قدرومنزلت کی وجہ سے داغ کو رام پور سے بیحد گہری انسیت تھی اس دور کی اردو غزل کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ داغ اور امیر ودیگر شعراء کے یکجا ہونے سے دلی کی داخلیت اور لکھنؤ کی خارجیت کے حامل شعراء نے ایک دوسرے کے تجربات وزبان دانی سے استفادہ کیا اور ایک دوسرے کے کلام پر اثر انداز ہوتے ہوئے باہم اثرات قبول کیے۔ داغ کی رنگیں بیانی ان کی غزل کا خاصہ ہے:

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

☆

نہیں ملتا کسی مضموں سے ہمارا مضمون
طرز اپنی ہی جدا سب سے جدا رکھتے ہیں

55

بقول حضرت غالب ''داغ کی اردو اتنی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم بھی دے رہا ہے۔''

علامہ نیاز فتحپوری داغ دہلوی کی غزل وزبان دانی کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ ''جس حد تک زبان کی صفائی وبیان کی سلاست، محاورات کی برجستگی اور بے تکلفانہ اظہار خیال کا تعلق ہے، بہت کم شاعر ایسے ہیں جو داغ کے مقابلے میں پیش کیے جاسکیں اور یہ داغ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب کا کوئی مورخ اس کو نظرانداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

خود داغ اپنی شعری اپچ پر نازاں ہیں وہ کہتے ہیں کہ

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے...... جو ہماری زبان سے نکلے

نیز داغ کی سلاست روانی اور سادگی ملاحظہ ہو

جب کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

نمونہ کلام:

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے اپنے گیسو
اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا
ملتا نہیں ہم کو دل گم گشتہ ہمارا
تو نے تو کہیں اے غم جاناں نہیں دیکھا

ساقیا! تشنگی کی تاب نہیں
زہر دے دے اگر شراب نہیں

تمہارا دل مرے دل کے برابر ہو نہیں سکتا
وہ شیشہ ہو نہیں سکتا یہ پتھر ہو نہیں سکتا

دی موذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

☆...... سید ضامن علیؔ جلال لکھنوی (۱۸۲۳ء تا ۱۹۰۹ء/۱۲۵۰ھ۔۱۳۲۵ھ)

آج کس مست کی رخصت ہے میخانے سے
شیشہ مل مل کے بہت روتا ہے پیمانے سے

محولہ بالا شعر لکھنؤ کے مابعد کلاسیکی شاعر، دبستانِ لکھنؤ اور رام پور کے امتزاجی اسلوب کے نمائندہ شاعر جلال لکھنوی کا ہے آپ کے والد حکیم اصغر علی ایک مشہور داستان گو تھے۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ جلال کے زمانے میں لکھنؤ میں ناسخ و آتش کا رنگ اپنے عروج پر تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جلال رام پور آ گئے۔ جلال کے کلام میں دہلوی انداز اور لکھنوی مزاج کا سنگم ملتا ہے۔ جلال کو اپنے سخن پر بہت ناز تھا وہ اکثر تکبرانہ انداز میں مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے وہ اپنے ہم عصر شعراء سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور معاصرین کو داد نہ دینے کی قسم کھائی ہوئی تھی مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جلال اپنے دوستوں سے احسن انداز میں ملتے تھے اور دوسروں کے کلام پر اصلاح بھی بہت محنت و محبت سے دیتے تھے۔ ان کے ایام شعر و شاعری اور اصلاح سخن میں گزرے۔ جلال لکھنوی کو اپنے اندازِ سخن، زبان اور تحقیق پر بڑا فخر تھا۔

نمونہ کلام:

دل ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل جاتے تھے، بیکار نہ تھا

ہائے قاتل نے ہمیں کو نہ کیا قتل جلال
مجرم آخر وہی ٹھہرا جو گنہگار نہ تھا

شب کو مئے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ایک رات دل جلوں کو یہ عیشِ وصال دے
پھر چاہے آسمان جہنم میں ڈال دے

میں نے پوچھا کہ ہے کیا شغل تو ہنس کر بولے
آج کل ہم تیرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

عشق کی چوٹ کا کچھ دل پہ اثر ہو تو سہی
درد کم ہو یا زیادہ ہو مگر ہو تو سہی

وعدہ کیوں بار بار کرتے ہو
خود کو بے اعتبار کرتے ہو

شبِ تنہائی فرقت میں دل سے
کچھ اس کی گفتگو ہے اور میں ہوں

نجات ہو گئی ناصح سے عمر بھر کے لیے
اُسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لیے

☆...... خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۱۴ء)

پانی پت کا نام آتے ہی لڑائیوں کی طرف ذہن جاتا ہے مگر اسی لڑائیوں کے میدان نے عظیم المرتبت شاعر مرزا غالب کے شاگرد، شاعر، تنقید نگار، مضمون نگار، محقق و مصنف الطاف حسین

حالی کو بھی جنم دیا، یوں پانی پت مرزا غالب اور خواجہ الطاف حسین حالی کے نام نامی بام عروج پر پہنچے اسی مناسبت سے حالی کی تصانیف یادگارِ غالب' حیات جاوید' مقدمہ شعر وشاعری اپنی اہمیت کے لحاظ سے یادگار قرار پائے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر نواب و رئیس مصطفٰی خان شیفتہ کے بچوں کے اتالیق بھی رہے اردو غزل کے نئے لہجے کے امیر الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر وشاعری لکھ کر اردو غزل کو جدیدیت سے روشناس کرایا۔ نیز مدو جزر اسلام حالی کی مایہ ناز تخلیق ہے۔آپ کی نظموں میں سادگی' روانی اور تسلسل نمایاں ہیں حالی کی تربیت میں غالب اور شیفتہ کا دستِ ہنر شامل ہے۔حالی نے اپنی سخن گوئی کے لیے غزل کے مضامین کو اختیار کیا تھا بہت دل نشیں انداز سے غزلیں کہیں جیسا کہ ذیل کے شعر سے واضح ہے:

عشق عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

پھر حالی کا اندازِ سخن بدلا اور ان کی شاعری اصلاحی مقاصد کی جانب مائل ہوتی چلی گئی ان کی شاعری قوم کی خدمت اور ادب کی اصلاح کرنے کی جانب مائل ہوگئی حالی نے غزل کی پرانی روش کو ترک کر دیا اور اندازِ سخن میں تراش خراش کے بعد غزل کو جدید رنگ اور جدید آہنگ عطا کیا حالی نے ایک جنبشِ قلم سے غزل کے مروج مضامین پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچا رفتہ رفتہ اپنی غزل میں سچے خیالات' پاکیزہ جذبات' قومی' سماجی' سیاسی اور تہذیبی عوامل کو داخل کیا حالی کا یہ انداز بے حد مقبول ہوا اور اردو شاعری کا زاویہ بدلتے ہوئے جدیدیت کی جانب جھکتا چلا گیا بعد میں آنے والے شعراء نے بھی حالی کی تقلید کی۔اردو شاعری میں جدید رنگ کے بانی حالی کہتے ہیں کہ:

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
ہوئے نہ تم سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

حالی کی غزل کے متعلق اختر انصاری لکھتے ہیں کہ ''حالی کی یہ ساری کوشش تھی کہ غزل کو ایسے عناصر کی گرفت سے آزاد کیا جائے جو محض روایتی اور رسمی ہیں اور ان میں موضوعات کے لحاظ سے ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن کی بنا پر وہ اصلیت' واقعیت اور سلاست سے ہمکنار ہوں اور دورِ جدید کے نشاطِ حاضر کے ذہنی تقاضوں کی حریف ثابت ہو سکے'' جبکہ مشہور نقاد سید کلیم الدین احمد کے مطابق ''کہنا پڑتا ہے کہ آزاد کی طرح حالی بھی اوسط درجے کا دماغ رکھتے تھے۔ان کے خیالات بھی سطحی ہیں۔کچھ بلند پروازی یا گہرائی نہیں۔ان کا طرزِ ادا آزاد سے کچھ زیادہ سادہ اور بے رنگ ہے' نثریت اس قدر غالب ہے کہ اگر وزن کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کے شعروں کو شعر سمجھنا مشکل ہو جائے۔''

اگر ہم دیکھیں تو حالی کی شاعری میں قومی ترجمانی' پند و نصائح اور اصلاحی پہلو اجاگر کرنے سے لطف و اثر تو کم ہوا مگر حالی کی شاعری نے اردو غزل کے لیے جدید راہیں متعین کیں اور اپنے تمام تجربات سے گذر کر گذشتہ صدی میں جدید غزل کے منصب پر فائز ہونے میں کامیاب ہوگئی۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

کلیم الدین احمد کے برعکس دیگر اکابرین انتقادیات کے حالی کے بارے میں نظریات:

ڈاکٹر عبدالحق:

''انیسویں صدی میں کسی شخص نے ہماری زبان و ادب پر ایسے گراں احسانات نہیں کیے جتنے حالی نے۔وہ ہماری جدید شاعری کے امام اور مجتہد ہیں۔''

رشید احمد صدیقی:

’’مسدس حالی وہ شاہکار ہے جس نے شاعری کی دنیا میں اور قوم کی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ حالی اگر کچھ نہ لکھتے صرف مسدس لکھتے تو بھی وہ بڑی شخصیت ہوتے۔‘‘

احتشام حسین کی رائے:

’’حالی کا نام ان کی قومی شاعری کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا مگر حالی نہ ہوتے تو ’اقبال بھی نہ ہوتے۔‘‘

یہ درست ہے کہ حالی نے اپنی شعری و نثری کاوشوں سے اردو ادب میں جو نئے در وا کیے جو باغبانی کی ہے وہ آج پھل دار تناور درخت بن چکے ہیں۔ حالی نے اپنی شاعری کو اصلاح معاشرہ اور تہذیب و اخلاق کے لیے موضوع سخن بنایا سر سید کے ساتھ مل کر کام کرنے سے حالی کو مزید دوام نصیب ہوا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، حالی کی ادبی کاوشوں کے اعتراف میں لکھتے ہیں کہ ’’حالی اپنے پیش روؤں اور معاصرین سے الگ ہیں کہ انہوں نے غزل کے موضوعات کی سابقہ حد بندی کو توڑ ڈالا اور سماجی اور قومی خیالات کو غزل میں داخل کیا اس کے علاوہ مسلسل شعر گوئی کے ذریعے غزل اور نظم کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اکبرؔ، چکبست اور اقبال کے لیے نمونے پیدا کیے جن پر ان تینوں شاعروں کی غزل کا توسیعی تصور قائم ہے۔‘‘

حالی کے چند اشعار

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

☆

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی مگر تو کہاں

☆

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

☆...... سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی (۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء تا ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

☆

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر نے لڑکپن میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا نظارہ بہت قریب سے کیا۔ یہ زمانہ افراتفری کا زمانہ اور انگریز کے تسلط کا زمانہ تھا۔ قصبہ بارہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہونے والے سید اکبر حسین رضوی المتخلص اکبرؔ اپنے زمانے کے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعر تھے مگر دونوں اقسام کی شاعری اصلاحِ قوم کے لیے وقف تھی۔ آپ نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرتے ہوئے جج کے منصب پر فائز ہوئے۔ انگریز سرکار سے ’’خان بہادر‘‘ کا خطاب ملا۔ اکبر کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اکبر الٰہ آبادی اردو طنز و مزاح کی شاعری میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

اکبر کا شعری اثاثہ چاہے وہ سنجیدہ ہو یا مزاحیہ دونوں میں پیغام ہے نسلِ نو کی اصلاح کا۔ ویسے بھی اکبر کے کلام میں مشرقی تہذیب و تمدّن سے پیار ہے وہ اپنے کلام میں نئے تہذیبی اقدار سے خائف نظر آتے ہیں۔ انگریزی ثقافت کی یلغار اور مغربی افکار سے اپنے مشرقی افکار

کو بچانا چاہتے تھے وہ روایت سے بھی جڑے رہے اکبرالہٰ آبادی کی شاعری اردو ادب کا خاصہ ہے مگر ان کی شناخت ظریفانہ شاعری ٹھہری:

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دُور تھے
میں نہ مانوں گا مورث آپ کے لنگور تھے

☆

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں
مارچ میں بلبل ہوں جولائی میں پروانہ ہوں

☆

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

☆

سید اٹھے جو گزٹ لے کر تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

اکبر کی شاعری اور شخصیت کا دلچسپ پہلو قوم کے لیے ناصح ہونا ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو ہر قسم کے شر سے بچانا چاہتے تھے اور ان کو بیداری کا پیغام پہنچاتے رہتے تھے:

خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو ہوش میں آؤ

☆

اسلام ہی کو بس اپنی ملت سمجھو
بے گانہ روش میں اپنی ذلت سمجھو

☆

نہ کتابوں سے نہ کالج کے در سے ہے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر کہتے ہیں کہ اگر میرے جوان مشرقی تہذیب اور اقدار کو بھول کر مغربی تہذیب کی بھول بھلیوں میں کھو جائیں گے تو اپنے مرکز سے اپنے نصب العین سے ہٹ جائیں گے وہ اس مغربی تعلیم کے مخالف تھے جو صرف کلرکی دلاتی تھی اور دل و دماغ کو روشنی سے دور کرتی تھی۔ اکبر کہتے ہیں:

قوم کی تاریخ سے جو بے خبر ہوجائے گا
رفتہ رفتہ آدمیت کھو کے خر ہوجائے گا

☆

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں مے خانوں میں
واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

اکبر کے سنجیدہ کلام کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ”تغزل اکبر کے کلام میں قدم قدم پر ملتا ہے اس میں لکھنؤ کی صناعی کا اثر بھی ہے اور رسمی تکلفات بھی مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بڑی زندہ اور جاندار چیزیں ہیں“ اکبر کی سنجیدہ شاعری میں تغزل و تصوف کا رنگ ملتا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

دل تو پہلے لے چکے اب جان کے خواہاں ہیں آپ
اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجیے
سمجھے وہی اس کو جو ہے دیوانہ کسی کا
اکبر یہ غزل ہے مری یا افسانہ کسی کا
اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت
روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا
جب کہا میں نے مرا دل مجھ کو واپس کیجیے
ناز و شوخی سے وہ بولے کچھ گیا ملتا نہیں

☆

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

اکبر کا فلسفیانہ انداز:

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

☆

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے
خدا باہر ہے حدِ دوربیں سے

☆

آئے گی تجھ کو نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ کچھ آئینہ فطرت کے سوا

اکبر اور تصوف: اکبر کی بود و باش بے حد مد و جزر کا شکار رہی۔ بچپن، تعلیم، ملازمت، انگریزوں کا تسلط، مذہبی اقدار سے دوری جیسے مسائل اکبر کے دور میں موجود تھے۔ اکبر کا مذاق ابتدا ہی سے عارفانہ تھا۔ اکبر کے کلام میں تصوف کا رنگ سر چڑھ کر بولتا ہے:

کہتا ہے کون اس کو کہ وہ بے نمود ہے
ہے سب نمود اس کی وہی اک وجود ہے

☆

بالائے زمیں پاس سکندر کے تھا سب کچھ
اب جا کے ذرا دیکھیے تربت میں بھی ہے کچھ

☆

سخن میں یوں تو بہت موقع تکلف ہے
خود خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں جو بھی ادوار ہیں وہ سب کے سب انسان کے معاشرتی مذہبی اقدار کے گرد گھومتے ہیں وہ اپنے معاشرے کو زمانے کی گرم اور مرکز گریز قوتوں اور ان کے اثرات سے بچانا چاہتے تھے اکبر کے عہد پیری میں علامہ اقبال ایک نوجوان تھے یہ لازمی امر ہے کہ اقبال کی شاعری پر اکبر الٰہ آبادی کا رنگ بھی اثر پذیر رہا۔

☆...... علامہ محمد اقبال (۹ نومبر ۱۸۷۷ء تا ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء)

اکبر الٰہ آبای اور علامہ اقبال کہنے کو تو ہم عصر ہیں ان کی عمروں میں تیس سال کا فرق ہے ایسا کہ اکبر کی پیری اور اقبال کا عہد جوانی۔ محمد اقبال جسے دنیائے ادب علامہ محمد اقبال، حکیم الامت، شاعر مشرق، ترجمانِ حقیقت، مفکر اسلام جیسے خطابات سے یاد کرتی ہے ایک فلسفی، پر امید، با حوصلہ اور بلند پایہ شاعر و مفکر تھے۔ ابتدائی تعلیم، فارسی ادب، اسلامیات کی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ ایف اے مرے کالج سیالکوٹ سے کیا۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آ گئے۔ بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر تعینات ہوئے۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ قانون اور فلسفے کی اعلیٰ تعلیم کا حصول جاری رہا۔ میونخ، جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کیا اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے مقام پر فائز ہوئے۔ برطانوی حکومت کی جانب سے ان کی علمی خدمات کو نوازتے ہوئے سر کے خطاب سے نوازا گیا۔

اقبال نے ابتدائی کلام ارشد گورگانی کو دکھایا مگر مشہور شاعر داغ دہلوی سے بھی اکتساب فیض جاری رہا۔ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں داغ کا رنگ سخن جھلکتا ہے۔ اقبال کی فکری و فنی تربیت میں داغ کے علاوہ سر ٹامس آرنلڈ، کیمبرج میں ڈاکٹر میک ٹگرٹ براؤن، نکلسن اور سارلی جیسے عظیم المرتبت مفکرین کی توجہ شامل ہے، نیز علی گڑھ کے زمانے میں مولانا شبلی سے دوستی اور تبادلہ خیال رہا۔ اقبال کے جد امجد کشمیر سے تھے اقبال کا تعلق کشمیری برہمن خاندان سے تھا۔ یہ خاندان عالمگیر کے عہد میں مسلمان ہوا۔

آپ کہتے ہیں کہ

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

اقبال کا سرمایۂ غزل کم ہوتے ہوئے بھی ان کا شمار اس دور کے اہم غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں وسعتِ مضامین، سوچ وفکر کی بلندی، خیالات کی نازکی، وفلسفیانہ انداز شامل ہیں۔ انہیں نبض شناس بھی کہا گیا ہے۔ کلیم الدین احمد اقبال کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ شاعری ہے اور اچھی شاعری ہے اس میں انفرادی رنگ ہے، باتیں بھی ہیں اور کام کی باتیں بھی ہیں لیکن شعریت کو پسِ پشت نہیں ڈال دیا گیا ہے اس قسم کے شعروں میں اور

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ان الملوک
سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

اقبال کی غزلوں میں بھی مضامین بالکل نئے ہیں۔ حالی کی طرح وہ بھی غزل کے عام مضامین سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔ اقبال نے خیالات کی دنیا بدل دی اور یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی شخصیت کی بزرگی کا ثبوت ہے''

''اقبال نے غزل کی فضا بالکل بدل دی۔ ایک نئی راہ نکالی جس پر دوسرے بھی چلنے لگے لیکن یہ بھول گئے کہ یہ راہ اقبال نے کھولی ہے جیسے ترقی پسند شعراء''

مجنوں گورکھپوری اقبال کی غزل پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

''اگر ہم ذوق کے ساتھ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں تو کیا نظم اور کیا غزل، جو کیفیت سب سے زیادہ نمایاں اور موثر محسوس ہوتی ہے وہ وہی ہے جس کو مبہم اور مجموعی طور پر تغزل کہا جا سکتا ہے۔ ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرتاً غزل گو تھے اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے بعد اور اس کے باوجود بھی وہ غزل گو ہی رہے۔''

مرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

☆

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

☆

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

☆

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

اقبال اپنی تصانیف کے آئینے میں:

☆علم الاقتضاء ☆نظم ''سارے جہاں سے اچھا'' کی تخلیق ☆نظم شکوہ ☆ تاریخ ہند ☆ اسرارِ خودی ☆ رموزِ بے خودی ☆ پیامِ مشرق ☆ بانگِ درا ☆ زبورِ عجم ☆ جاوید نامہ ☆ بالِ جبریل ☆ ضربِ کلیم ☆ ارمغانِ حجاز ☆ فلسفۂ عجم (پی ایچ ڈی) کا مقالہ ☆ مدراس لیکچر (خطباتِ مدراس)

اقبال کے ہاں وطن پرستی بطور نیشنل ازم کی نفی ہے وہ ملت اسلامیہ کے قائل ہیں۔ آپ مساوات کے حامی ہیں، رنگ ونسل، لسانیات کے گروہی وتفرقہ بازی کے خلاف ہیں کیونکہ یہ مرکز گریز قوتیں ہیں جو ایک ملک/ خطہ یا علاقے میں رہنے والے افراد کو یکجا ہونے سے دور رکھتے ہیں اقبال اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر خودی میں کھو کر خود کی شناخت چاہتے ہیں۔ وہ شناخت جو جمہوریت، آمریت، سرمایہ داری، سوشلزم سے متاثر نہ ہو۔ اسی وجہ سے اقبال زور دیتے ہیں کہ اپنے نفس کو جانیں، اقبال کہتے ہیں کہ

نہیں ہے وابستہ، زیرِ گردوں، کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہوجا

اقبال کے فکری وفلسفیانہ خیالات ہمہ وقت اصلاح پر مائل تھے وہ انسان کو خودی میں ڈوب کر مسائل کا حل چاہتے تھے ملاحظہ ہو:

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا
مئے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اقبال پھر حوصلہ بڑھاتے ہیں اور انسان کو خودی میں ڈوب کر بلند مقام کی جانب نشاندہی کرتے ہیں کہ تم ہم سب کچھ ہو سب کچھ حاصل کر سکتے ہو:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

☆

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

اقبال اپنے فلسفیانہ کلام اور ترجمانِ ملت کی وجہ سے بیحد مقبول تھے ان کا ترنم بھی دل موہ لیا کرتا تھا۔ وہ درد بھرے انداز میں جب ملتِ اسلامیہ کا حال بیان کرتے تھے تو مجمع دم بخود رہ جاتا تھا۔ حمایت اسلام لاہور کے جلسے اس بات کے گواہ ہیں۔ اقبال کا رنگِ سخن:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

☆

ترے شیشہ میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کا دلفریب ناصحانہ انداز ملاحظہ ہو:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دن جاتا ہے دھن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سا سراغ زندگانی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

علامہ اقبال اپنی علمی، فنی، سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ انداز میں علم کی شمع روشن رکھتے ہوئے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ۶۱ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور ہمارے لیے ایک پیغام چھوڑ گئے

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

☆...... شاد عظیم آبادی (۷ جنوری ۱۸۴۶ء تا ۸ جنوری ۱۹۲۷ء)

علی محمد شاد عظیم آبادی ۷ جنوری ۱۸۴۴ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے آپ کی پرورش ایک صحت مندانہ ماحول میں ہوئی۔ ابتدا ہی سے عربی فارسی علوم سے آشنائی حاصل کی۔ شاد ہندی اور انگریزی زبان سے شغف رکھتے تھے۔ شاد کی اپنی پوری زندگی ادب کی آبیاری میں گزری۔ وہ میرا اور درد کے افکار کے پیروکار تھے شاد نے میر تقی میر کے اوزان و بحور کو سخن آمیز رکھا۔ بلاشبہ شاد کو اپنے دور کا میر کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی سابقہ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد شاد کا درج ذیل شعر بام شہرت پر پہنچا اور زبان زد عام ہے:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

یوں تو شاد عظیم آبادی کا شمار کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے مگر ان کے افکار ہمہ جہت ہیں وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ شاد کی تصانیف کی تعداد ہمہ جہت ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ شاد کی تصانیف کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ساٹھ کے قریب ہیں۔ کلیاتِ شاد عظیم آبادی تین حصوں میں ہے جسے اردو کے نامور نقاد کلیم الدین احمد نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔ انتخاب کلام شاد کو شائع کرنے کا شرف حسرت موہانی، ریاض عمر، قاضی عبدالودود، حمید عظیم آبادی اور نقی احمد ارشاد کو حاصل ہے۔ جبکہ قطعات شاد فاطمہ بیگم نے ترتیب دیئے۔ شاد کی عشقیہ غزلیں اپنے اندر ایک رس کی کیفیت رکھتی ہیں جو ہندوستانی ادب کی شناخت ہیں۔

شاد نے اپنی زندگی خوشحال گزاری مگر آخری عمر میں بہت تنگدستی دیکھی اور اپنی زندگی کو سو روپیہ ماہانہ کی امداد میں محصور رکھا۔ دوران آنریری مجسٹریٹ ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ شاد کے شاگرد حمید عظیم آبادی نے اپنی تمام عمر استاد کے کلام کو سنبھالنے اور خدمت میں بسر کی۔ حمید عظیم آبادی کے بیٹے حسن حمیدی بھی ایک روشن خیال ترقی پسند شاعر تھے۔ راقم الحروف نے ان کے احوال و آثار بحوالہ ترقی پسند تحریک پر ایم فل کا مقالہ ۲۰۱۹ء میں کراچی یونیورسٹی شعبہ

اردو زیر نگرانی شاداب احسانی مکمل کیا اور ایم فل سند کا حقدار ٹھہرا۔

شاد کا نمونہ کلام:

عجب معیار ہے اے مئے پرستو! بزم ساقی کا
جنہیں ہم رند سمجھے تھے وہ اکثر پارسا نکلے

☆

بتوں سے قطع کر لینا فقط حوروں کے لالچ میں
یہی گر حق پرستی ہے تو زاہد تجھ سے ہم بہتر

☆

اٹھتی جوانی، عضو مناسب، سانولی رنگت، ہائے ستم
آنکھ رسیلی، باتیں بھولی، چال قیامت، ہائے ستم

☆

اے شاد جن کے ساتھ زمانہ بسر کیا
اللہ اب وہی مجھے پہچانتے نہیں

☆

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل! تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

☆

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

شاد عظیم آبادی کا کلام اپنی ہیئت کے اعتبار سے دہلوی اور لکھنوی انداز کا حسین امتزاج معلوم ہوتا ہے شاد نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعات میں طبع آزمائی کی مگر ان کی شہرت ان کی غزلیں ہیں:

جب کسی نے حل پوچھا رو دیا......چشمۂ تر تو نے مجھ کو کھو دیا

کالی گھٹائیں' باغ میں جھولے' دھانی دوپٹے لٹ جھٹکائے
مجھ پہ قدغن آپ نہ آئیں اف ری جوانی ہائے زمانہ

☆

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

شاد عظیم آبادی کا انتقال ۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو پٹنہ میں ہوا۔ وہی مدفون ہیں۔

☆...... صفی لکھنوی (۳ جنوری ۱۸۶۲ تا ۲۵ جون ۱۹۵۰ء)

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

صفی لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے جید اساتذہ میں ہوتا ہے آپ کا نام سید علی نقی زیدی تھا۔ ۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے جدید غزل کے لیے نئے زاویے چنے۔ سرکاری ملازمت کی اور قومی نظمیں لکھنے کا شغف بھی تھا۔ دبستانِ لکھنؤ سے تعلق ہوتے ہوئے انہوں نے لکھنؤ کے عام شعری مزاج سے ہٹ کر طبع آزمائی کی۔ اردو شاعری میں ہم صفی لکھنوی کی شاعری کو قدیم وجدید شاعری کا امتزاج کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی شاعری کے متعلق ناقدین فن نے لکھا کہ ''وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر لکھنؤ کے خاص روایتی طرز کو بدلنے کی طرف مائل تھے'' صفی لکھنوی کے کلام میں سوز وگداز' دردوغم کے علاوہ فلسفہ وتصوف کی جھلک موجود ہے آپ کا نام لکھنؤ کے دبستان میں یوں بھی اہم ہے کہ ان کی طبع آزمائی شیرینی سے بھرپور' تنوع' لطافت' شگفتگی، برجستگی اور سادگی سے معمور ہے۔ ڈاکٹر عبدالوحید نے ''جدید شعراء اردو'' میں لکھا ہے کہ صفی کی ذات ان مبارک ہستیوں میں سے تھی جنہوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری کا رخ بدلا اور غزل کی نئی عمارت تیار کی۔ انہیں شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ لیکن کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انہوں نے اپنے ہی

وجدان وذوق شعر کی رہنمائی میں اس فن کی ترقی کی اور ترقی بھی ایسی کہ بہت جلد صفی کا شمار لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں ہونے لگا۔ مذکورہ بالا آراء سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفی نے واقعی لکھنوی شاعری کے روایتی مزاج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کا انتقال ۲۵ جون ۱۹۵۰ کو ہوا۔

میری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

☆

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنت برباد کا
سنے بیٹھے ہیں وہ وفسانہ دلِ ناشا د کا
الٰہی زندگی کیا موت کیا بیمار ہجراں کی
پریشاں خواب وہ تعبیر یہ خوابِ پریشاں کی

☆

پیغام زندگی نے دیا موت کا مجھے
مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے

☆

دیکھے بغیر حال یہ ہے اضطراب کا
کیا جانے کیا ہو پردہ جو اٹھے نقاب کا

☆

سنے گا کون سنا جائے گا صفی کس سے
تمہاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

☆

اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دباویں گے

☆

جنازہ روک کر میرا وہ اس انداز سے بولے
گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو

☆

درد آغازِ محبت کا اب انجام نہیں
زندگی کیا ہے اگر موت کا پیغام نہیں

☆

نزع کا وقت ہے بیٹھے رہیے
آپ اٹھے تو قیامت ہوگی

☆

ہم بے کسوں کی قبر کہاں برگِ گل کہاں
صدقہ ہے سب یہ فیضِ نسیم بہار کا

☆...... عزیزؔ لکھنوی (۴فروری ۱۸۸۲ءتا ۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء)

مرزا محمد ہادی المتخلص عزیزؔ ۴ فروری ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ کا شمار دبستان لکھنؤ کے قدیم رنگ تغزل کے شعراء میں ہوتا ہے میر و غالب کی پیروی کی۔ جوش ملیح آبادی اور اثر لکھنوی کا شمار عزیز کے شاگردوں میں ہوتا ہے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق ''عزیز لکھنو کے قدیم رنگِ تغزل کی آخری یادگار تھے۔'' رنگ سخن ملاحظہ ہو:

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

☆

اب نیلگوں ہے چہرہ مگر پہلے زرد تھا
انجام درد یہ ہے وہ آغازِ درد تھا

عزیز کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ لکھنوی مزاج کے مطابق عزیز نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ قصائد میں بھی مرتبہ حاصل کیا۔ نعتیہ کلام اور قصائد جذبۂ ایمانی کے تحت اجاگر ہوا آپ کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عزیز ایک صاحبِ بصیرت شاعر تھے۔ وہ قدرتی مضامین کو نظم کرتے ہوئے ان مناظر و مظاہر میں ڈوب جاتے تھے یہی راستہ عرفان ذات، روحانیت اور تصوّف کا ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی کرب سامانی' آزادیٔ خیال کی گردش جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ تغزل کے میدان میں عزیز لکھنوی کو کمال حاصل ہے وہ حسن و عشق اور ہجر و وصل کی کیفیات کو نہایت سادہ اور احسن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ رنگ ملاحظہ ہو

سرخ ڈورے تیری آنکھ کے الٰہی توبہ
چاہیے تھا انہیں پیوست رگِ جاں ہونا

☆

جوش میں لے کے یہ انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

پروفیسر حامد حسن قاری کی رائے ''عزیز نے کلام غالب کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور اپنی غزل کے لیے اسی کو نمونہ بنایا۔ غالب کی تقلید میں نہ صرف جدید خیالات اور اسالیب پیدا کیے بلکہ غالب کی غزلوں پر کثرت سے غزلیں لکھیں۔ دیوان عزیز کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے لیے نئی زمینیں اتنی پیدا کیں جتنی اساتذہ قدیم' میر' آتش' ناسخ اور غالب کی طرح پر طبع آزمائی کی'' عزیز لکھنوی کے کلام میں روحانی تسلسل اور فکر عقبیٰ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

قصائد' مثنوی' نعتیہ و حمدیہ کلام ان کو آخرت میں سرخرو کرے گا وہ اپنے دینی جذبات میں ڈوب کر کلام لکھتے تھے ان کی دعا کبھی اپنے لیے اور کبھی قوم کے لیے وقف تھی:

خدا ہے تیرا معترف رسول تیرے جاں نثار
ادا ہو حقِ مدح کیا غلام کے غلام سے

عزیزؔ لکھنوی کا رنگ تغزل

خدا جانے وہ کیوں شرما کے اٹھ جاتے ہیں محفل سے
قریبِ شمع جب پروانے پر پروانہ آتا ہے

☆

وہ دن گئے عزیزؔ کہ ہنستے تھے رات دن
ملتا ہے چین دل کو اب آنسو بہانے میں

☆

ہوں گے بدنام تو ہو لینے دو
ہم کو جی کھول کے رو لینے دو

عزیزؔ لکھنوی کا دہلوی انداز:

دیکھ کر ہر درو دیوار کو حیراں ہونا
وہ میرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہوا
خیر گذری کہ تو خدا نہ ہوا

سوزِ غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا

دبستانِ لکھنو کا آخری نمائندہ شاعر ٢٦ جولائی ١٩٣٥ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

☆...... شوکت علی فانی بدایونی (١٣ستمبر ١٨٧٩ء تا ٢٦ اگست ١٩٤١ء)

آپ کا تعلق قصبہ اسلام نگر' بدایوں کے مردم خیز خطے سے تھا اردو ادب میں فانی کو شاعر یاس کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔ بی اے ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی وکالت کا پیشہ اختیار کیا مگر کامیابی نہ مل سکی حیدرآباد دکن میں صدر مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی آپ کے والد شوکت علی خان پولیس میں بطور انسپکٹر تعینات تھے۔ فانی کے کلام میں حسرت و یاس کا چرچا

خاص طور پر ملتا ہے اس کی وجہ زندگی کی ناکامیاں بھی ٹھہریں ان کے ہاں غم والم کوئی سطحی نہیں ہے وہ اپنے غم والم میں ڈوب کر فلسفیانہ انداز میں غزل گو ہوتے ہیں۔ فانی کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور یاس و محرومی در آئی ہے اور انداز سخن میں غالب کا مفکرانہ انداز بھی۔ فانی کے بارے میں مجنوں گورکھ پوری کی رائے:

''فانی کی شاعری میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے موضوع کا دائرہ تنگ ہے۔ وہ زندگیکے ہر پہلو پر نظر ڈالتے' محبت' موت اور تاریکی کا احساس اس طرح ان کی شاعری کی کائنات پر چھایا ہوا ہے کہ معلوم ہوا ہے کہ زندگی اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں' اس سے ان کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔''

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھ چھوٹ گیا

آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ''فانی کے اشعار میں جو مجبوری بے چارگی جو پامالی و خستگی ہے وہ اگرچہ ذاتی معلوم ہوتے ہیں مگر کون جانے اس میں اجتماعی زندگی کی کتنی محرومیاں اور ماحول کی کتنی تلخیاں ملی ہوئی ہیں۔''

وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر
شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے
اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی......کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا
غیرت ہو تو غم کی جستجو کر......ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

فانی کے انداز سخن کے بارے میں رشید احمد صدیقی کیا لکھتے ہیں ملاحظہ ہو:

''فراق نے فانی کے غم میں عظمت عالم گیری دیکھی ہے جگر نے ان میں میر کا سا سوز و گداز۔ غالب کی سی رفعتِ فکر و فن اور مومن کے انداز کا بانکپن پایا ہے فانی کے یہاں آلام

حیات کی تفسیر ہے۔ فانی زندگی کو ایک مسلسل اور منظّم الم قرار دیتے ہیں۔ وہ الم جس نے گوتم بدھ کو نجات کا متلاشی بنایا اور جس کی نشاندہی مسیح کی صلیب کرتی ہے۔''

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا...... بات پہنچی تری جوانی تک

لبریز تموج کا تھا اک خط پیمانہ...... محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

فانی کے شعری شعور و فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا اسلوب گو کہ میر و غالب، اصغر، داغ، ناسخ، و مومن سے متاثر ضرور ہے مگر یاسیت کے امام کا آہنگ ان کا اپنا آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم، والم و یاس کے ساتھ ان کی شاعری میں کیف و سرور اور مسرت و رنگینی کے مضامین بھی ملتے ہیں:

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مرجا

☆

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

☆

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

☆

جب ترا ذکر آ گیا، ہم دفعتاً چپ ہو گئے
وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کر دیا

☆

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کے رہ گئے

اردو شعری سفر کا یہ روشن ستارہ ۲۶ اگست ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد دکن میں انتقال کر گیا۔

☆...... اصغر گونڈوی (یکم مارچ ۱۹۸۴ء تا ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء)

سید اصغر حسین کا تخلص اصغر تھا۔ آپ گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گونڈہ میں قانون گو تھے آپ وہاں والد کے ساتھ مقیم رہے۔ اور اصغر گونڈوی کہلائے۔ جس طرح فانی کو یاسیت کا امام کہا گیا ہے اسی طرح اصغر کو نشاط کا بادشاہ۔ آپ اس کا اظہار ذیل کے شعر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں:

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیے
مجھ کو اصغؔر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

اصغر کی شعری طبع آزمائی جدید اردو غزل میں جدّت کی جانب ایک نئی پیش قدمی ہے اصغر کا غزل کا لہجہ معاصرین سے الگ ہے ان کے افکار میں فلسفیانہ اور مفکرانہ مزاج ہے جو انہیں اقبال کے قریب لے جاتا ہے:

کوئی عمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اصغر کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے مگر ذاتی کاوشوں سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور مطالعہ بڑھایا۔ آپ ایک وسیع النظر آدمی تھے۔ آپ ایک فطری شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں لطافتِ احساس، تخیل کی بلندی، مایوسی اور قنوطیت سے دوری کا تاثر ملتا ہے۔ آپ رجائیت پسند شاعر تھے۔ اردو غزل کے جدید دور میں اصغر کی شاعری ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے ان کا اندازِ سخن شگفتگی و رنگینی لیے ہوئے ہے آپ کا لہجہ جدید ہے۔

اصغر کی شاعری کے بارے میں چند اکابرین کی رائے:

مجنوں گورکھپوری: ان کے کلام کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ خود نہ کسی کے مقلد تھے اور نہ

آج تک کوئی ان کی تقلید کر سکا۔ تنہا اپنی ذات سے ایک دبستان ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد: میں نے یہ مجموعہ ''سرودِ زندگی'' بے دلی کے ساتھ اٹھایا لیکن جب رکا تو اس اعتراف کے ساتھ کہ اردو میں ایک شاعر موجود ہے۔''

رشید احمد صدیقی ''اصغر کے یہاں تخیل زیادہ جذبہ کم ہے ان کی شاعری حسن کی شاعری ہے۔''

اصغر گونڈوی کے دو شعری مجموعے نشاطِ روح اور سرودِ زندگی یادگار ہیں۔

نمونہ کلام:

زمانہ آ رہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

☆

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

☆

کچھ اس ادا سے مرا اُس نے مدّعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

☆

نہ کامیاب ہوا میں ، نہ رہ گیا محروم
بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں

☆

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

☆

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کرلیا ہے جی کے

اصغر کا نعتیہ شعر ملاحظہ ہو:

چھٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم
لیکن نہ چھٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

اصغر پر آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال فرما گئے۔ آپ الہٰ آباد میں مدفون ہیں۔

☆...... سید فضل الحسن، حسرت (۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء تا ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء)

سید فضل الحسن، حسرت ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو اُناؤ (موہن۔ دور برطانیہ) اتر پردیش بھارت میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک جدّت پسند شاعر اور تحریک آزادی ہند کے ہراول دستے کے رکن تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا حسرت سودیشی تحریک میں نمایاں متحرک رہے۔ وہ ہمیشہ دیسی چیزیں استعمال کرتے تھے آخری وقت تک کسی ولایتی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے ''اردوئے معلٰی'' جاری کیا علامہ شبلی آپ کی متحرک شخصیت کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ''تم آدمی ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے پھر سیاست دان بنے اور اب بنیے ہو گئے ہو''؟ آپ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کئی بار پابند سلاسل ہوئے۔ آپ کا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے تھا۔ ترقی پسند تحریک میں بھی شامل رہے۔ آپ کو رئیس المتغزلین کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ حسرت موہانی جدید شاعری میں جدیدیت کے امام ہیں۔ ان کی غزل کا اپنا ایک انفرادی رنگ ہے ملاحظہ کیجیے:

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کسی کے دھوکے میں
کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کر کہا کہ تم ہو
گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ میری جان سویرا دیکھو

☆

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی زندگی مدوجزر کا شکار رہی آپ ایک صابر اور قناعت پسند انسان تھے۔ ہمیشہ اپنی ذات کی نفی کرتے تھے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ کئی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی صبر وقناعت کے ساتھ آپ کے مزاج میں بے باکی اور صاف گوئی شامل تھی جس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی ہوتا ہے :

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں......دنیا میں اور بھی کوئی' تیرے سوا ہے کیا؟

حسرت موہانی کی شاعری کے بارے میں ممتاز نقاد مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں کہ' 'حسرت کی شاعری اس منزل کی چیز ہے جہاں رنج والم اور خوشی بچوں کی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں جہاں آنکھوں میں آنسو آتے ہی چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور مسکراتے مسکراتے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر احساسات میں ادراک کا عنصر داخل ہو جاتا ہے اور ہماری ہر کیفیت کو ایک بصیرت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شکپیئر کی آخری تمثیلیں اسی منزل کی چیز ہیں جن کو نہ آپ المیہ کہہ سکتے ہیں نہ نشاطیہ اور جن کا آخری اثر ایک اشک آلود تبسم بھی ہو سکتا ہے۔''

مولانا حامد حسن قادری کے مطابق ''حسرت نے غزل کے علاوہ کچھ نہیں لکھا غزلوں کے چار پانچ دیوان مرتب کیے ہیں چھوٹی چھوٹی بحر کی غزلیں لکھی ہیں۔ دیوان کی تکمیل سے ان کو خاص ذوق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ۲۳۔۱۹۲۲ء میں احمد آباد پونہ کے جیل خانوں میں ایک چھوٹا سا مستقل دیوان مرتب کر لیا۔''

تاثیر برق حسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی

حسرت موہانی کا تعلق نیشاپوری سادات گھرانے سے تھا جس کا اظہار انہوں نے بڑے

فخر سے اپنی شعری کاوش میں بھی کیا ہے:

کیوں نہ ہوں اردو میں حسرت ہم نظیری کی نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاکِ نیشاپور سے

اپنی سادہ اور قناعت پسند طبیعت کے ساتھ حسرت موہانی تصوف کی طرف بھی مائل تھے آپ کی شاعری میں تصوف کے مضامین جا بجا ملتے ہیں۔

مسلک عشق ہے پرستش حسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

☆

علم وحکمت کا جنہیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
کچھ نہیں فلسفہ عشق میں حیرت کے سوا

یہ درست ہے کہ حسرت کی شاعری میں اساتذہ کے کلام کا رنگ سخن جھلکتا ہے مگر حسرت کا ایک اپنا رنگ بھی ہے جو انہیں اردو شعرا میں ممتاز کیے ہوئے ہے جیسا کہ:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

حسرت نے جس انداز سے غزل کا احیاء کیا ہے وہ رنگ عاشقانہ ہے۔ حسرت کا عشق پستیوں سے بالاتر ہے حسن وعشق کے تناظر میں حسرت کی شاعری میں جوش سے ولولہ ہے' شگفتگی' رنگینی ورعنائی نمایاں ہے:

حسن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

☆

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

ہم نے تو نثار کر دیا دل
اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے
اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرت
آغازِ جنون کے پھر زمانے

حسن و عشق کی کیفیت کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے......غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا......مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت، وہ نیچی نگاہیں......وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا

ڈاکٹر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں کہ ’’حسرت بنیادی طور پر وصل کے شاعر ہیں ہجر و فراق کے نہیں۔ ان کے غم میں درد کی کسک نہیں۔ امید اور خوشی کی لہر ہے اسی لیے ان کی غزلوں میں وہ سوز و گداز نہیں آسکا جو میر کی غزلوں میں ہے۔‘‘

اپنی بھرپور شعری، سیاسی و سماجی زندگی گذارنے کے بعد حسرت موہانی ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ۷۶ سال کی عمر میں لکھنو میں انتقال کر گئے۔

☆...... علامہ سیماب اکبرآبادی (۵ جون ۱۸۸۰ء تا ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء)

عاشق حسین صدیقی سیماب ۵ جون ۱۸۸۰ء کو آگرہ اتر پردیش ہندوستان میں محمد حسین صدیقی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بھی شاعر تھے۔ آپ داغ کے شاگرد تھے۔ سیماب اکبرآبادی بنیادی طور پر کلاسیکی غزل کے شاعر تھے جدید علوم سے آگہی کے بعد انہوں نے مشق سخن میں نظم کو شامل کیا اور نظم کو غزل پر فوقیت دی سیماب کے کلام میں عظمت انسانیت اور عوام الناس کا درس ملتا ہے ایک معرکہ آرا شعر جو ان کی پہچان بھی کہا جا سکتا ہے۔

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

سیماب کی شاعری میں کلاسیکیت کے ساتھ ترقی پسندیت، جدیدیت کے پختہ رنگ

70

نمایاں ہیں:

اسیری اور ایسی بے بسی اللہ رے مجبوری
کسی نے یہ نہ پوچھا آج تم بے بال و پر کیوں ہو
ہے نیا روپ روز دنیا کے......یہ پرانی کبھی نہیں ہوتی

سیماب کی شاعری ان کی اپنے لہجے کی شاعری ہے وہ کسی کے مقلد نہیں مگر اساتذہ کا رنگ کہیں کہیں ملتا ہے اور انہوں نے لکھنوی لہجے و معنویت سے اجتناب کیا ہے آپ کے کلام میں تکنیک اور معنی پر زیادہ توجہ ملتی ہے اپنی سادہ طرز ادا سے اپنے کلام کو عام فہم بنایا ہے آپ کا رنگ جدیدیت کے رنگ کا آغاز ہے آپ علم العروض پر گہری دسترس رکھتے تھے دیگر گراں قدر تصانیف کے ساتھ ’’رمز العروض‘‘ کے نام سے ابتدائی عروض سیکھنے والوں کے لیے عروضی اثاثہ چھوڑا ہے آپ کے شاگردوں میں راز چاند پوری، ساغر نظامی، ضیا فتح آبادی، بسمل سعدی، الطاف مشہدی اور شفا گوالیاری و دیگر ہزاروں شاگروں کا نام آتا ہے۔ آپ کے شعری سفر میں آپ کو تاج الشعراء اور ناخدائے سخن جیسے خطابات سے نوازا گیا۔

سیماب اکبرآبادی کو آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہرا عشق تھا وہ آپ کی ذاتِ مبارکہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ کے نعتیہ کلام میں اس عشق کا اظہار بڑے زور و شور سے ملتا ہے۔

فرشتے سیکڑوں آتے اور جاتے ہیں
بہت قریب ہے عرشِ خدا مدینے میں
خدا کے گھر کا گدا ہوں فقیرِ کوئے نبی
مجھے تو عشق ہے مکے سے یا مدینے سے

سیماب کی شاعری میں فکری و فنی کروٹ اس وقت در آئی جب اردو شاعری زلف و رخسار کے دائرے میں مقید تھی۔ سیماب نے اپنی شاعری میں پرانے مضامین کو ترک نہیں کیا بلکہ سنجیدگی سے غزل کی اصلاح کی اور عصری رجحانات اور مسائل حیات جیسے مضامین کو داخل

کیا۔اپنی غزل اور نظم دونوں تجربات کیے اور کامیاب رہے اور شعریت میں مقصدیت کو روشناس کرایا۔

نمونہ کلام:

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

بدل گئی وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب نہ ہوسکا

بدن سے روح رخصت ہورہی ہے
مکمل قید غربت ہورہی ہے

میں خود ترکِ تعلق پر ہوں مجبور
کچھ ایسی ہی طبیعت ہورہی ہے

عمر دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اردو نثر شعریت اور عروض پر گراں قدر تخلیقات کرنے والے اردو غزل کے آخری کلاسیکل شاعر علامہ سیماب اکبر آبادی نے ایک اندازے کے مطابق ۲۸۴ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔علم و ادب کا یہ روشن ستارہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں نور بیزی کرتے کرتے بالآخر ٹمٹما کر بجھ گیا۔

☆...... یاس یگانہ چنگیزی (۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء تا ۴ فروری ۱۹۵۶ء)

مرزا واجد حسین ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو پٹنہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلہ نسب چنگیز خان سے جا ملتا ہے پہلے بیتاب سے اصلاح سخن کی بعد میں شاد عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے مرزا واجد حسین پہلے یاس تخلص کرتے تھے بعد میں یگانہ اختیار کیا۔یگانہ چنگیزی کو شاد عظیم آبادی کی قدیم یادگار کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔یگانہ چنگیزی کے کلام میں غزل کی روایت

کے ساتھ تیکھا پن اور جارحانہ انداز ملتا ہے شاید یہ فطری طور پر ہے کہ آپ کا تعلق جنگجو خاندان چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔یگانہ عظیم آباد سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہوئے اور تادم سپرد آفریں لکھنؤ ہی میں رہے۔لکھنؤ کے شعراء سے ان کی کبھی نہ نبھی اور شعرائے لکھنؤ کی چشمک کی بدولت انہیں غالب شکن کی صف میں لا کھڑا کیا یاس یگانہ چنگیزی انہی خیالات کی بدولت اور اپنے متنازعہ خیالات کے باوجود بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔متنازعہ ہونے کی وجہ سے اور غزل میں نئی جہت روشناس کرانے کے سبب یگانہ لکھنؤ میں اکیلے رہ گئے۔لکھنؤ میں ان کا کوئی ہم نوا نہ تھا۔اپنی انا پسندی کی وجہ سے تنہا رہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ انفرادی تھا۔وہ جدید غزل کے خاص تیور کے بانکپن کے شاعر ٹھہرے۔یگانہ نے حالات کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا وہ رونے دھونے کے قائل نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں خودی اور خودداری کی جھلک نظر آتی ہے۔

یگانہ کافی عرصے تک اودھ اخبار سے منسلک رہے' نیز لاہور کے اشاعتی ادارہ ''اردو مرکز'' سے بھی وابستگی رہی۔حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ کے سب رجسٹرار رہے۔۱۹۵۱ء میں پاکستان آئے یہاں اپنے بیٹوں کے پاس کچھ عرصہ قیام کیا اور دوبارہ لکھنؤ چلے گئے۔یگانہ کے لیے مجنوں گورکھپوری اپنی رائے اظہار یوں کرتے ہیں:

''یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رنگ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں' ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔''

وزیر آغا کے مطابق ''جب میر کو زندگی کا سامنا ہوا تو اس نے اپنا سر جھکا دیا۔غالب مسکرا دیا اور یگانہ اکڑ گیا۔''

یگانہ نے لکھنؤ کر ہر اس مزاج کی نفی کی جو وہاں مروج تھے۔۔یگانہ نے لکھنؤ کے مرثیت زدہ ماحول سے بغاوت کی یگانہ اس ماحول کے شاعر ہیں۔ان کی غزل میں صرف حسن وعشق کے چرچے ہیں بلکہ یگانہ کی غزل افکار و مسائل سے کھیلتی ہے اور زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ غالب کی طرح کے رجائی شاعر ہیں۔

نمونہ کلام:

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

☆

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

☆

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی
دیدنی ہے پاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

☆

جھوم کر اٹھتے ہیں لیکن پھر سنبھل جاتے ہیں مست
سامنا ساقی کا ہے گستاخیاں کیوں کریں

☆

صلح کرلو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی اک استاد
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھیں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

☆

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

72

یگانہ نے اپنے آخری ایام نہایت کسمپرسی میں گزارے۔ لکھنؤ کے لوگوں اور لکھنوی مزاج سے لڑتے جھگڑتے یگانہ چنگیزی ۲ فروری ۱۹۵۶ء کو سفرِ آخر پر روانہ ہوگئے۔ آپ کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔

☆...... اثر لکھنوی (۱۳ جولائی ۱۸۸۵ء تا ۶ جون ۱۹۶۷ء)

میرزا جعفری علی اثر لکھنوی ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بھرپور زندگی گزاری۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ سرکار کی جانب سے خان بہادر اور ایم بی ای کے خطابات سے نوازا گیا۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ریاست جموں کشمیر کے ہوم منسٹر اور وزیرِ تعلیم کے عہدوں پر فائز رہے آپ نے ایک اردو لغت بھی ترتیب دی۔ مجموعہ کلام میں اثرستان، بہاراں، رنگ بسنت اور لالہ و گل شامل ہیں۔ اثر جناب عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے شاعر ہونے کے ساتھ آپ ایک نقاد بھی تھے۔ آپ کی خدمات و خصوصیات کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری فرماتے ہیں کہ ''جعفر علی خان اثر لکھنوی ان لوگوں میں ہیں جو شاعر پیدا ہوئے اور شعر و شاعری ہی ان کی زندگی کا مقطع ہوگا۔'' اثر نے لکھنوی شعری مزاج میں رہتے ہوئے غزل میں اردو زبان کے نئے راستے بنائے۔ وہ میر کے پیروکار تھے مگر اپنی شاعری میں میر سا سوز و گداز پیدا نہ کر سکے وہ اپنے استاد عزیز لکھنوی کی شاگردی کا برملا اظہار کرتے تھے:

اثر ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیز اُستاد
نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لیے

میر کے افکار سے عشق کی بدولت وہ میر کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

اثر ہے میر سے نادیدہ بیعت...... نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ کی شاعری میں مستی کی کمی ہے یا خشک آہیں یا سرد فلسفہ ہے تمام لکھنوی شعرا میں اگر کہیں رنگینی و شادابی ہے تو وہ تعیش، ریاض اور اثر کے یہاں ہے''

اثر کے کلام میں رنگِ تغزل سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ اپنے جذبات، احساسات کو سادہ اور

دلکش پیرائے میں لطافت اور نفاست سے بیان کرتے ہیں۔

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے......مستی میں چھوا صبا نے دامن
نہ کھلنے پہ میرے دل کی کلی......گلِ تر کی صورت مہکتی رہی
نازک لبوں پہ ہلکی سی لرزش......کھلتی کلی یا رستی گلابی
صبا گنگنائی فضا گونج اٹھی......جہاں دل نے چھیڑا ربابِ محبت
ایک اجڑا دیار ہوں میں......آگے آیا ہے سب کیا میرا
ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے......آنسوؤں میں یہ رنگ جب آیا
اک چھلکتا ہوا جام آنکھ ملا کر ساقی
جس کے ہر قطرے میں ہو صبح کا جوہر ساقی

اثر کے مضامین میں روز مرّہ کے واقعات اور حسن وعشق کے معاملات ہیں وہ ان تمام مضامین کو اپنی شاعری میں سمو کر سادگی، روانی، شگفتگی وشوخی سے بیان کرتے ہیں اور اپنے شائستہ مزاج سے شعری نشے کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں:

جھپکی جو ذرا آنکھ جوانی گذر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی
یاد کر لے بھولنے والے مرے......اب تو بچھڑے ہوئے ایک مدت ہوگئی
مجلس وعظ سے اک رند یہ کہتا اٹھا
کافر اچھے ہیں دل آزار مسلمانوں سے
کسی بے کس کا دل دکھانے سے......کیا ملا آپ کو بھلا' کہیے
عشق سے لوگ منع کرتے ہیں......جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
آہ کس سے کہیں کہ ہم کیا تھے......سب یہ دیکھتے ہیں کیا ہیں ہم

آسودہ اور پُر آسائش زندگی گزارنے والے اثر لکھنوی نے ۶ جون ۱۹۶۷ کو ۸۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

☆...... جگر مراد آبادی (۶ اپریل ۱۸۹۰ء تا ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء)

علی سکندر المتخلص جگر مراد آباد میں ۶ اپریل ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوئے۔ جگر کے والد مولوی نظر علی بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ جگر کا شمار بیسویں صدی کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے آپ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ تو نہ تھے البتہ ابتدائی تعلیم فارسی اور اردو زبان کی حاصل کی ابتدا میں اپنے والد سے شعری سخن میں اصلاح لی بعد میں داغ اور پھر تسلیم کے شاعر ہوئے۔ جگر مراد آبادی کو ادبی دنیا شہنشاہ تغزل کے نام سے یاد کرتی ہے جگر کے کلام میں دلی جذبات رندانہ ومستانہ کیفیت میں اس طرح سے ملتے ہیں کہ وہ کیفیاتِ حسن کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ جگر کا اپنا ایک انداز ہے اور اپنا ہی منفرد رنگ غزل ہے یہ درست ہے کہ جگر کی غزلیات ابتذال اور عامیانہ روش سے دور ہیں:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے
آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے
اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

بیسویں صدی کے اردو شعری کارواں میں فانی' حسرت' اصغر اور جگر کو نمایاں مقام حاصل ہے جگر کے کلام میں سوز وگداز' سرمستی وشادابی سرچڑھ کر بولتی ہے۔ اپنے ترنم سے بھی جگر نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے آج بھی شعراء جگر کے ترنم کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں مگر جگر کا سا انداز کہاں:

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تم ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے

پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق ''جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل

گو شعراء میں سے ہیں۔ان کو لوگ مانیں یا نہ مانیں ان کے کلام پر سبھی سر دھنتے ہیں......جگر کے یہاں جدید رنگ تو نہیں قدیم رنگ کا نکھار ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں وہ چیز پائی ہے جو تغزل کی جان ہے" جگر کے یہاں کیف و سرشاری، والہانہ پن اور سرمستی کی دنیا آباد ہے۔

جبکہ رشید احمد صدیقی یوں جگر کے شعری سفر پر اظہار کرتے ہیں:

''جگر میں بے پایاں سرشاری او رسپردگی کے ساتھ عشق اور اس کے متعلقات کا جو احساس یا بصیرت ملتی ہے وہ ان کی شخصیت کو بہت دل آویز محترم بنا دیتی ہے۔''

جگر کا شعری سفر اردو غزل کا سنہرا دور ہے۔ جہاں جگر نے اپنے رنگِ تغزل کو جو آب و تاب بخشی اس سے غزل کا وجود سرخرو ہو گیا۔جگر کی زندگی معاشی ابتری کا شکار رہی وہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہ کر پائے۔ازدواجی زندگی بھی ابتری کا شکار رہی۔ایک عرصہ تجرد کی زندگی، معاشقے شادی، علیحدگی پھر شادی کی، پھر داغ مفارقت اس افتاد نے بھی جگر کو بے تاب رکھا۔جگر بلا کے مئے نوش تھے۔نگر نگر پھرے۔شراب، نوشی ساتھ چلتی رہی۔جگر شراب کے نشے میں دھت رہتے تھے اور اپنا غم غلط کرنے میں لگے رہتے تھے۔اس کا اظہار یوں بھی کیا ہے:

سب کو مارا جگر کے شعروں نے......اور جگر کو شراب نے مارا

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جارہا ہوں میں
آ میری جانِ انتظار آ میرے آفتابِ شوق
تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شام بے سحر
صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے...... جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اردو شاعری کی خدمات کو دیکھتے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری سے نوازا اور ساہتیہ اکیڈمی نے انعام و اکرام سے نوازا۔جگر کا ایک رنگ ملاحظہ ہو:

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے ہے زمانہ خود، زمانے سے ہم نہیں
دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

جگر شہنشاہ تغزل تو ہیں ہی مگر اس کے ساتھ ان کا نام عظیم غزل گو شاعر کے طور پر اردو شاعری میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ان کی شاعری اور زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے اور انداز سخن انسان کے فطری لطیف احساسات کو جگا دیتے ہیں اور ایک مدت سے سوئے ہوئے جذبات مدھر اور رنگین مزاج لہروں سے ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔

جگر کی شاعری میں شراب اور سرمستی سر چڑھ کر بولتی ہے وہ کبھی تو جام و سبو مینا و ساغر کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی اپنے محبوب کی مست اور خمار آلود آنکھوں سے پیمانوں کا کام لیتے ہیں۔سرمستی کی کیفیت میں مخمور نگاہیں اور ان سے چھلکتا نشہ ان کے لیے تسکین کا باعث بنا مگر وہ اس مدہوشی میں بھی اپنے محبوب اور اس کی رسوائی کا خیال رہتا ہے اس مضمون کو جگر نے اس دل کش انداز سے باندھا ہے کہ یہ اشعار زبان زد عام ہیں:

تیری اس مست نگاہی کا بھرم رکھ لوں گا
ہوش آیا بھی تو کہہ دوں گا مجھے ہوش نہیں
کبھی ان مدھ بھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام
آج تک ہوش نہیں، ہوش نہیں، ہوش نہیں

غزل کے عشق انگیز، جنوں خیز، پرسوز، مجاز و حقیقت کے شاعر، غنائیت و شگفتگی کے پیکر جگر مراد آبادی اپنی رندی و سرمستی سے محبوب خوش جمال کی یاد سے باتیں کرتے ہوئے اسی سرشاری میں ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو گونڈہ (گورکھپور) میں ستر سال کی عمر میں راہی عدم ہوئے۔

☆...... فراق گورکھپوری (۲۸ اگست ۱۸۹۶ء تا ۳ مارچ ۱۹۸۲ء)

اردو غزل کے کلاسیکی روایت کے شاعر، جمالیاتی احساس کے پیکر رگھو پتی سہائے فراق ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت ایک مشہور

قانون دان اور شاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم گورکھ پور سے حاصل کرنے کے بعد الٰہ آباد کالج میں داخلہ لیا۔ شعری سوجھ بوجھ بچپن ہی سے تھی۔ فراق نے انڈین سول سروسز کا عہدہ ڈپٹی کلکٹر ٹھکرا کر سیاست میں قدم بڑھایا۔ سیاسی وسماجی تحریکوں کے دوران جیل یاترا کی۔ زنداں اور زنداں سے باہر ہر جگہ شعری شوق پروان چڑھتا رہا۔ آپ نے جنگ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ فراق نے ایک متحرک زندگی گزاری۔

فراق کی غزلیہ شاعری حسن وعشق کی رعنائیوں سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں حسن کی رنگینیاں ایک انوکھے انداز سے نکل آتی ہیں فراق کی شاعری کے بارے میں ممتاز نقاد رشید احمد صدیقی کی رائے: ''فراق کو اس صدی کے موجودہ پچاس سال کے منفرد اور ممتاز غزل گو شاعروں کی صف میں جگہ مل چکی ہے اور یہ امتیاز معمولی نہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ فراق گورکھپوری کا شمار بیسویں صدی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ جدید شاعری میں فراق کو بلند مقام حاصل ہے فراق کی ابتدائی شاعری میں قدیم کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ فراق کے کلام میں کلاسیکیت سے جدیدیت تک معاملہ فہمی، سادگی، نرمی اور صاف گوئی کا مزاج ملتا ہے:

کسی کی آنکھ میں ملتے ہیں دونوں وقت فراقؔ
ہم اک نگاہ میں شام وسحر کو دیکھتے ہیں
ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا
کسی کے حسن کو آئی ہو نیند سی جیسے
میرے اشعار میں انگڑائیاں لیتا اٹھا کوئی
کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مرجائیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراق گورکھپوری نے عشق ومحبت کے پیچیدہ معاملات کو اپنے کلام میں رسیلے نغمات میں پروکر ایک اعلیٰ فکر کی بنیاد رکھی جو بعد میں آنے والوں کے لیے بھی تقلید کا باعث ہے۔ فراق نے میٹھے نغموں اور دل کش سروں سے غزلیت کو ایک حوصلہ افزا مقام عطا کیا۔ انہوں نے غزل میں شعور سخن کو نپے تلے انداز میں آگے بڑھایا۔ عشق، حسن، رنگینیت کے ساتھ ساتھ فراق کی غزلوں میں بے چارگی، بے بسی اور کرب تنہائی کا احساس نمایاں ہے۔ اقبال کی شاعری کے تناظر میں فراق بھی جدید غزل کے پیش رو ہیں فراق کے کلام میں جابجا اساتذہ کے کلام کا رنگ چھلکتا ہے گو کہ ان کا بھی ایک منفرد مقام ہے اور فکر اور نیا آہنگ ہے ملاحظہ ہو:

جب دیکھو اس کو ہے یہ عالم......اک انگڑائی آئی ہوئی سی
ذرا وصل کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی
کیا کریں ہم بھی، کیا کرو تم بھی
آدمی آدمی کا دشمن ہے
میرے سینے سے لگ کے سو جاؤ......پلکیں بھاری ہیں، رات بھی کم ہے

علامہ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ ''فراق ایک نقاد شاعر ہے اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علاحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہوتی ہے۔''

جدید غزل کی علامت فراق گورکھپوری اپنی غزل کو متحرک زندگی بخش کر ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو سورگباشی ہوگئے۔

☆......☆

رومانی تحریک اور اردو غزل

کلاسیکیت ‘روایت پسندی اورنت نئے مضامین کی وسعت پذیر غزل کا ایک اور زاویہ'رومانوی تحریک کا بھی ہے محمد حسین آزاد کی رومانیت' میر ناصر علی کا رومانی ردعمل' عبدالحلیم شرر کی رومانیت پسندی اردو ادب میں رومانیت کی ابتدا ہے جبکہ یلدرم' مہدی افادی' سجاد انصاری کی خدمات کو رومانی ادب میں یاد رکھا جائے گا۔اردو رومانی شاعری میں جوش'اختر شیرانی' مجنوں گورکھپوری' حفیظ جالندھری' عرش ملسیانی اور روش صدیقی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔اگر رومانی تحریک کے احیاء کو دیکھیں تو سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کا ردعمل قرار پاتا ہے۔

رومانوی فن پارے اور رومانوی تخلیق کار اپنے جذبے اور شعری وجدان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے ہیں یہ کسی کی تقلید کے بجائے جدّت اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ظاہر ہے رومانوی شاعر رومانس سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنی عشق و محبت کی داستان کے ہیں۔

انقلابِ فرانس اور روسو کا وہ جملہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے'' رومانی تحریک اپنے اساس کے وقت سے روایت سے بغاوت کا نام تھا۔اور روسو کی اس تحریک پر دیگر ادباء وشعراء نے توجہ دی اور اپنے دور میں گوئٹے' شیلے' ولیم بلیک' ولیم ورڈز ورتھ اور جان کیٹس کی رومانی تحریروں کے سبب اس تحریک کو فروغ نصیب ہوا۔آنے والے صفحات میں ہم مندرجہ ذیل اہم رومانی شعرء کی خدمات کا ذکر کریں گے۔

☆...... جوش ملیح آبادی (۵ دسمبر ۱۹۹۸ء تا ۲۲ فروری ۱۹۹۲ء)

شاعرِ انقلاب کے لقب سے مشہور شبر حسن خان' جوش ۵ دسمبر کو ملیح آباد (یوپی) ہندوستان میں بشیر احمد خان بشیر کے گھر میں پیدا ہوئے۔جو کو شاعری ورثے میں ملی۔ابتدائی

تعلیم سیتا پور اسکول اور مشن ہائی اسکول لکھنؤ سے حاصل کی۔ہندسرکار نے آپ کو''پدم بھوشن'' کے خطاب سے نوازا۔دوران قیام حیدرآباد نظام حیدرآباد کے خلاف ایک نظم لکھی اور دیس نکالا ملا۔ حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۲۰۱۳ء میں ہلال امتیاز عطا کیا۔

جوش کو شاعر انقلاب و شباب کا درجہ حاصل ہے۔جوش کے کلام میں سرکشی' بغاوت اور انقلابی جوش وخروش جیسے مضامین وجہ شہرت ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کے رومانی جذبات بھی اردو شاعری کا خاصہ ہیں۔

ادب کر اس خرافاتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی
کیا شیخ ملے گا گل افشانی کرکے
کیا پائے توہین جوانی کرکے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کرکے

جوش اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ''میرا خمیر انسان دوستی سے بنا ہے'' جوش کے بارے میں سردار جعفری کی رائے''الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا'' کرشن چندر کے مطابق''سچ تو یہ ہے کہ جوش ایسا قادرالکلام شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔'' گو کہ جوش نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی مگر وہ اپنے شعری سفر میں غزل کے مخالف رہے جوش کا انداز کلام خطیبانہ ہے' تحکمانہ ہے وہ عرض داشت کے قائل نہیں اپنا حق چھیننا جانتے ہیں جوش کی نظم ورثائی ادب کی غزل کا رنگ بھی اپنے منفرد انداز کا ہے:

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
کیا فائدہ شیخ تجھ سے کینے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف' سفینے میں مجھے

عیاش تو دونوں ہیں مگر فرق یہ ہے
کھانے میں مزا تجھے پینے میں مجھے

جوش کا ایک خاص رنگ ملاحظہ ہو:

اب اے خدا ! عنایت بے جا سے فائدہ
مانوس ہو چکے ہیں غم جاوداں سے ہم

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور

مِرے خدا نے مرے سب گناہ بخش دیے
کسی کا رات کو یوں میں نے انتظار کیا

جوش انقلاب کا پرچار کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں:

کلام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میر انعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

خواب کو جذبہ بیدار دیئے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

جوش شاعر انقلاب کے ساتھ ایک رومان پرور شاعر تھے آپ کی غزلوں میں رومانی پہلو ایک منفرد چاشنی رکھتا ہے فراق گورکھپوری نے بھی آپ کی شعری عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو استاد کہا ہے۔

جوش کے لیے گوپی چند نارنگ کا خراج تحسین ’’جوش کے لہجے میں ایسا طنطنہ اور مردانگی تھی اور ان کی آواز میں ایسی گھن گرج، کڑک اور دبدبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا گویا ہمالیہ لرز رہا ہے یا زلزلہ آ گیا ہے۔‘‘

کنور نٹور سنگھ کے مطابق ’’حضرت جوش ملیح آبادی ہمارے ملک کی جنگ آزادی کے سورما اور صف اوّل کے شاعر تھے۔ ٹیگور اور اقبال کے بعد نرالا، ولاٹھول اور سبرامینم بھارتی جیسے

بڑے شاعر ہندوستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے اور جوش بھی اسی مرتبہ کے شاعر تھے۔‘‘

نثری نگارشات میں جوش کی آپ بیتی ’’یادوں کی بارات‘‘ کو اپنے متنازعہ ہونے کے باوجود اہمیت حاصل ہے یادوں کی بارات اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ ایک عظیم شاعر کے ساتھ ایک عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ جوش کا ایک بڑا کارنامہ مرثیہ حسین اور انقلاب ہے جوش قلم کے سپاہی تھے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا لکھا ہوا رثائی سرمایہ اردو ادب میں ایک ادبی خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسین اور انقلاب میں انداز بیاں اس قدر دلنشیں ہے کہ قاری اس زمانے میں سفر کرنے لگتا ہے جیسے وہ خود کربلا اور داستان کربلا کا حصہ ہو اور اس کے دل میں جوش حسینی اور ولولہ حسینی پیدا ہو جاتا ہے گویا جوش سے عزم حسین اور اس عزم کی روحِ انقلاب کو دوبارہ لوگوں میں پہنچا دیا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

جوش نے نظم، غزل، مرثیہ اور قطعات کے ساتھ نعت نگاری میں بھی کمال حاصل کیا ہے جس سے ان کی تصوف اور روحانیت سے لگاوٹ سامنے آتی ہے مگر انداز وہی ہے:

اے کہ تیرے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشہ خوف بن گیا ، رقص بتانِ آذری
تیری پیغمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
دشت نوردوں کو دیا تو نے مقامِ سروری

بے ہوشیوں نے اور خبردار کردیا
سوئی جو عقل روح کو بیدار کردیا

جوش نے دنیا کی بے ثباتی کو اپنے انداز سخن میں یوں بیان کیا:

کبھی جن کا تبسم روح کو بیدار کرتا تھا
وہی اب سو رہے ہیں قبر کی تاریک منزل میں

جوش کی ابتدائی زندگی زہد و عبادت سے عبارت ہے۔ نماز کے پابند تھے۔ رکوع و سجود کا اہتمام کرتے تھے رب کائنات نے جوش کو بے پناہ خوبیوں سے نوازا تھا اس کے بعد ان کی زندگی میں جذبہ رندی اور سرمستی چھا گئی اور جوش مادیت کے غلبے میں ڈوب گئے اور ڈوبتے چلے گئے۔ جوش اپنے زہد و تقویٰ پارسائی سے لے کر رندی اور سرمستی حسن و عشق سے کھیلتے اور علم بغاوت و انقلاب لہراتے ہوئے ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

تقدیر کے دائرے میں آنا ہی پڑا
سر پائے مشیت پر جھکانا ہی پڑا

☆...... حفیظ جالندھری (۱۴ جنوری ۱۹۰۰ تا ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء)

محمد حفیظ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر میں حافظ شمس الدین کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابوالاثر کنیت اور حفیظ تخلص اختیار کیا یوں ابوالاثر حفیظ جالندھری کے نام سے ادبی افق پر پہچانے گئے۔ حفیظ کی اہم وجہ شہرت پاکستان کے قومی ترانے کی تخلیق اور شاہنامہ اسلام کی تخلیق ہے۔ حفیظ جالندھری کے لکھے ہوئے گیت اردو شاعری میں شاداب و پراثر کیفیات کے حامل ہیں جیسے کہ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص مذہبی وجوشیلے انداز سے مسلمانوں کے لہو کو گرمانے کی سعی کی۔ انہیں اسلاف کے قصے و کارنامے سنا کر نئی منزل سے روشناس کرایا حفیظ کی مثنوی اور نظموں نے شہرۂ آفاق شہرت حاصل کی جبکہ ان کی غزلیں بھی رومانی آہنگ کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں شگفتگی، شیرینی، غنائیت نے حسن و عشق کی کیفیات کو ایک نیا آہنگ عطا کیا:

آنکھ کمبخت سے اس بزم میں آنسو نہ رکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

☆

بھلائی نہیں جاسکیں گی یہ باتیں
تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اردو نہ ہندی نہ ہندوستانی

حفیظ جالندھری کی شاعری سہل ممتنع کا ایک نمونہ بھی ہے انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔ ان کی شاعری میں روایت سے بغاوت صاف جھلکتی ہے۔

حفیظ کا ایک امتیاز ان کی نظم گوئی ہے اور نظم گوئی بھی اس وقت کی جب اکبر، اقبال، چکبست کی وطنی اور قومی شاعری کا چرچا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ جوش اور اختر شیرانی بھی اپنا جادو جگا رہے تھے۔

سید ضمیر جعفری نے حفیظ کے لیے لکھا ہے کہ ''حفیظ اردو ادب میں ایک دھماکے کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ دھما کہ نغمہ زار تھا جو اپنے دامن میں اردو شاعری کے لیے کچھ نئے پھول اور کچھ انوکھے نغمے لایا۔ خوبصورت، شیریں۔ حفیظ نے اردو شاعری کو ایسا مرتبہ، اتنے میٹھے، اتنے پیارے اور اتنے بہت سے گیت دیئے جو اس سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے۔ ان گیتوں کی مٹھاس ان کے رس رچاؤ، بہاؤ اور سبھاؤ نے یک بارگی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔''

جبکہ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) نے ذیل کے مرصع الفاظ میں ان کی شعری پیکر کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے ''جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پرواجنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔''

حفیظ جالندھری نے تحریک آزادی میں بھر پور حصہ لیا انقلابی شاعری کے ذریعے ملک و ملت کی ترجمانی کی شاہنامہ اسلام تخلیق کیا۔ حسینیت کے موضوع پر اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور گلہائے عقیدت نچھاور کیے۔

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑہ بھی پار

حفیظ کی شاعری ایک عام آدمی کی سطح والی شاعری ہے روایتی مضامین ان کا خاصہ ہیں ذیل کا شعر ایک عام آدمی کی زبان پر رواں رہتا ہے

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

حفیظ بھرپور اور متحرک زندگی گذارنے اور اعزازات سمیٹنے کے بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۹۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

☆...... اختر شیرانی (۴مئی ۱۹۰۵ء۔۹ستمبر ۱۹۴۸ء)

اردو شاعری میں پہلے سکہ بند رومانی شاعر محمد داؤد خان (اختر شیرانی) ۴مئی کو پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کے گھر میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ محمود شیرانی ۱۹۲۱ء میں لاہور منتقل ہوگئے لہٰذا اختر شیرانی کی تربیت و بود و باش لاہور میں ہوئی۔ اختر نے ۱۹۲۱ء میں اورنٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور منشی فاضل کا امتحان پاس کیا بعد ازاں ادیب فاضل اور میٹرک پاس کیا۔ اختر شیرانی انگریزی، عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ اردو غزل کے سفر میں اختر شیرانی کا شمار بھی بلا کے مے نوش شعراء میں ہوتا ہے۔ شراب نے اختر کی شاعری کو دو آتشہ تو بنایا مگر وہ اپنی صحت تباہ کر بیٹھے۔ شراب سے گہرا لگاؤ ہونے پر اختر شیرانی کہتے ہیں

جو روح ہوچکی اک بار داغ دار مری
تو اور ہونے دے لیکن شراب پینے دے

شراب نوشی کی محفل ولت کے باوجود وہ ایک اچھے مزاج کے مالک تھے وہ انسانیت، سادہ لوحی کی وجہ سے اپنے دوستوں میں مقبول رہے۔ اختر شیرانی ایک زود گو شاعر تھے ان کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا کچھ خواتین بھی اس حلقے میں شامل رہیں مگر مشہور شاگردوں میں احمد ندیم قاسمی، ن۔م۔راشد، میرزا ادیب، کنیز فاطمہ حیا اور عزیز جہاں بیگم ادا بدایونی کے نام نامی شامل

ہیں۔ محمد طفیل مدیر نقوش، لاہور اختر شیرانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''سوائے شراب کے میں نے اختر میں کوئی خرابی نہ دیکھی۔ وہ اپنے ملنے والوں کی عزت کرتے تھے۔ ان کی مدد کرتے تھے۔ ان سے پیار کرتے تھے الغرض معصوم سے انسان تھے جو اختر شیرانی کے نام سے معروف ہیں۔'' جبکہ تابش صدیقی لکھتے ہیں ''ان کے دوستوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ اعلیٰ پائے کے ادیب اور شاعر بھی اور گھٹیا درجے کے شرابی بھی لیکن دوستی میں سب ان کے لیے برابر تھے، یکساں خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔'' خوش اخلاق تھے مگر بے باک بھی بلا کے تھے، کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی جس کا برملا اظہار ایک شعر میں بھی کیا ہے:

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختؔر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

اردو شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے جب قاری کے ذہن میں اختر شیرانی کا نام آتا ہے تو قاری کا مزاج رومان پرور ہوجاتا ہے ان کا امام عشق ہے۔ حسن و عشق، رنگ و بو اور نسوانی حسن خاص موضوعات ہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری میں سہانے اور سنہرے خواب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ممتاز محقق ڈاکٹر اختر اورینوی کے مطابق ''اختر کیٹس کی طرح الفاظ سے بت گری بھی کرتا ہے اس مجسم تصویر کشی میں اختر کا بڑا درجہ ہے۔'' اختر شیرانی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی رومان پروری اور ان کے رومانی افکار رومانوی تحریک کے بنیادی اور اہم ستون ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ ''اختر رومانیت کی توانا آواز ہے اس کی شاعری میں جذبے کی لاوی صورت نمایاں ہے اس میں شدت بھی ہے اور دل بستگی بھی چنانچہ اختر نے نہ صرف رومانوی تحریک کو فروغ دیا بلکہ نئی اردو نظم کو بھی کروٹ دی

اٹھا جام ساقی جہاں کو بدل دیں
نظام زمیں و زماں کو بدل دیں

☆

مری آغوش میں ہوگا وہ جسم مرمریں اس کا
وہ اس کے کاکل مشکیں وہ روئے نازنیں اس کا

وہ رخسار حسیں اس کے وہ حسن یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی
سنا ہے میری سلمٰی رات کو آئے گی وادی میں

☆

عمر بھر کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں
جس کے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

رومان پروری اور رومانی جذبہ کے زیر اثر اردو شاعری میں روایت کی بت شکنی اور نئے مضامین اور نئے اسالیب کا اضافہ ہوا جس میں جذبات کو اہمیت دی گئی اور اردو شاعری میں نئی بحروں، ترنم اور نئے آہنگ کا اضافہ ہوا۔ اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں شدت جذبات، داستان عشق و محبت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ بقول ڈاکٹر محمد حسن ''اختر یا رومانی شاعر ہیں یا کچھ نہیں''، اختر شیرانی کے کلام میں اردو شاعری کی ایک نئی کروٹ ملتی ہے جہاں محبوب کو براہ راست مخاطب کیا ہے مگر فرضی ناموں سے، اختر شیرانی کی ان خیالی یا فرضی محبوباؤں کی فہرست طویل ہے جن میں سلمٰی، عذرا، زلیخا، مہ لقا، نو بہار ناز، ریحانہ، زہرہ، پروین، ثریا، نسرین، ناہید، لالہ رخ، شمسہ، لیلیٰ اور شیریں کے نام شامل ہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری کا خاصہ ہے کہ انہوں نے اپنی شباب آمیز راتوں اور اپنی خمار آلود شاموں کا تذکرہ ایک نئی کیفیت میں بیان کیا ہے وہ اپنی محبوباؤں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ محبوب کے انگ انگ اور حسن و جمال سامنے نظر آتے ہیں۔ بلاشب اختر شیرانی اپنے عہد کے بلکہ اردو شاعری میں سب سے بڑے رومانی شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں رومانی رجحان زیادہ ہے جبکہ رنگ تغزل بھی نمایاں ہے۔
اختر کی غزلوں میں روایتی لہجہ و مضامین جدید انداز میں ملتے ہیں

اختر شیرانی کے چند اشعار

عمر بھر کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں
جس کے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

ان رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے
اک محبت تھی مٹ چکی یارب
تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے
غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

اختر شیرانی چونکہ رومانوی شاعر ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں تشبیہات، کنایات اور استعاروں کا استعمال کثرت سے ملتا ہے:

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو
یہ مرجھائی ہوئی کلیاں نہیں بے نور آنکھیں ہیں
بسی تھیں جن کے خوابوں میں کبھی راتیں جوانی کی

شاعر رومان اختر شیرانی کے کلام میں رومانیت کا غلبہ ہے ان کے کلام میں سادگی و بے ساختگی کا عنصر نمایاں ہے کلام میں جمع کا صیغہ استعمال کر کے ایک جلترنگ کا سماں باندھا ہے جگہ جگہ کلام میں ترکیب سازی اور رسیلے الفاظ کا استعمال شیرینی و شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام عناصر مل کر اختر شیرانی کے کلام غائیت و چاشنی پیدا کرتے ہیں جو اس سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں خال خال ہے۔ یہی ان کا اسلوب ہے۔ اختر شیرانی کی ادبی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر یونس حسنی نے ''اختر شیرانی اور جدید اردو ادب'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور ڈگری حاصل کی اس مقالے کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۷۶ء میں بار اوّل شائع کیا ہے۔

اختر شیرانی اپنی شاعری کے تناظر میں ایک روایت شکن شاعر ہیں انہوں نے بار ہا نت نئے تجربات کیے جس کی آنے والے شعرا نے تقلید کی اور مزید تجربات کیے جو ہنوز جاری ہیں۔ اختر کی شہرت رومانی شاعری ہے مگر اختر کی نثری خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک

اچھے نثر نگار بھی تھے اپنی محبوبہ سلمیٰ کے نام خطوط۔ ''جن میں جذبات کی فراوانی، تخیل کی جولانی، الفاظ وتراکیب کی مرصع کاری اور عبارت کی روانی نے ان خطوط کو منثور نظم یا منظوم نثر بنا دیا ہے'' (یونس حسنی، ڈاکٹر)

اختر شیرانی کی نعت کے دو اشعار

کس نے پھر چھیڑ دیا قصہ لیلائے حجاز
دل کے پردوں میں مچلتی ہے تمنائے حجاز
بھر کے دامن میں غریبوں کی دعائیں لے جا
اے نسیم سحر اے بادِ بہ پیمائے حجاز

ایک غزل سے چند اشعار:

دردِ فرقت کی قسم ضبط کا یارا نہ رہا
وقتِ آزار کوئی یار ہمارا نہ رہا
ہائے وہ وقت کہ ہر ایک تھا ساتھی اپنا
ہائے یہ وقت کہ اب کوئی ہمارا نہ رہا
ان سے کہہ دو غم دنیا سے نہیں ہے فرصت
جن کو شکوہ ہے کہ اختر بھی ہمارا نہ رہا

بلا کی مے نوشی اختر شیرانی کو لے ڈوبی اور وہ صرف ۴۳ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

☆...... احسان دانش (۲ فروری ۱۹۱۴ء تا ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء)

احسان الحق المعروف والمتخلص احسان دانش ۲ فروری کو کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ آپ کا ذریعہ معاش مزدوری تھا۔ احسان دانش لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے شاعری کا آغاز کیا۔ آپ کی ادبی نگارشات میں شاعری، نثر نگاری اور لسانیات شامل ہیں آپ کی نمایاں تخلیقات میں سے ایک تخلیق ''جہانِ دانش'' ہے۔

حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو تمغۂ امتیاز عطا کیا۔ احسان دانش چونکہ رومانوی تحریک کی ایک مضبوط کڑی ہیں مگر آپ نے شاعرِ مزدور حیثیت سے جو خدمات انجام دیں اس کے نتیجے میں آپ ترقی پسند تحریک کا بھی حصہ ہیں۔ رومانی دور کے اہم شاعر احسان دانش کے کلام میں رومانیت کے ساتھ ساتھ ان کے ارد گرد ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور ان کے ذاتی تلخ تجربات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ انہیں شاعر مزدور بھی کہا جاتا ہے۔ احسان دانش رومان پرور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انقلابی شاعر ''مصورِ غم واندوہ'' شاعر فطرت اور عوامی شاعر تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔

سرخ مئے برسا رہا تھا شام کا رنگین شباب
جھلک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب

☆

یہ اڑی اڑی سی رنگ یہ کھلے کھلے سے گیسو
تیری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

ڈاکٹر انور سدید کے مطابق احسان دانش کی رومانیت میں ماضی کی یادوں اور فطرت پرستی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ احسان دانش کی کائنات چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور معصوم خواہشوں کا مرقع ہے اور ان کی تکمیل ان پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے اور وہ ایک خدا مست صوفی کی طرح نغمہ الاپنے لگتے ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر وقار رضوی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''احسان نے غزلیں کہی ہیں مگر ان کا اصل مقام نظم ہی میں ہے۔ شاعرِ مزدور کی حیثیت سے ان کا بلند مرتبہ ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ احسان نے ردیف وقافیہ کی پابندی کے ساتھ غزل میں نئے موضوعات اور نئی تشبیہات کو جگہ دی ہے۔ ان کی غزلوں میں حسین و دلکش الفاظ کا انتخاب ہے۔''

احسان دانش نے پوری زندگی محنت میں گذار دی اور ان کی شعری و نجی زندگی اور احسان دانش کی عظمت کا راز، ان کی ان تھک محنت اور مسائلِ حیات کی باریکیوں پر تفتیشی نثر میں

پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احسان دانش کے کلام میں مزدور اور مزدور طبقہ کے مسائل اور درد نمایاں ہے۔ ذیل کے اشعار میں ان کا خاص اسلوب جھلکتا ہے:

غمِ حیات سے بے شک خودکشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا
غربت کی دوپہر میں خیالِ وطن نہ پوچھ
گر گر پڑا ہوں سایۂ اشجار دیکھ کر
اس شہر میں جو خوش ہیں خدا اُن سے خوش رہے
اپنی تو ساری عمر مصائب میں کٹ گئی
احسان اپنا کوئی برے وقت کا نہیں
احباب بے وفا ہیں، خدا بے نیاز ہے
دورِ حاضر کی دوستی احسان
کس قدر جلد رخ بدلتی ہے

آپ کی تصانیف میں آتش خاموش، نوائے کارگر، گورستان، چراغاں، زخم و مرہم، دردِ زندگی، حدیث خواب، جادۂ نور، تغیر فطرت، عکسِ آئینہ، غبارِ کارواں، زنجیر بہاراں، رموزِ غالب، اردو مترادفات، قاموسِ محاورات اور جہانِ دانش (خودنوشت) شامل ہیں۔

احسان دانش کو حالات سے شکوہ بھی رہا مگر وہ اپنی بساط بھر مزدوری سے اپنا سفر طے کرتے رہے مصائب و آلام سے گذر کر ان کی شاعری میں کچھ جرات اور بڑھ گئی اور انقلابی رنگ بھی جھلکنے لگا مگر وہ اس انقلابی اظہار میں بھی مسکراتے رہے:

ہر اک بلندی کا بار پستی لیے دوش پر کھڑی ہے
گذرنے والے گذر رہے ہیں مگر کوئی پوچھتا نہیں ہے
تم دوائے دل تھے درد لادوا کیوں ہوگئے
آشنا ہو کر وفا، آشنا کیوں ہوگئے

صاحبانِ دولت و منصب کا شکوہ بے فضول
عام لوگوں میں بھی وہ پہلی ملنساری نہیں

احسان دانش عوامی شاعر تھے ان کے کلام میں روزمرّہ بول چال بھی ملتی ہے وہ بول چال جو عام آدمی کی زندگی کا حصہ ہیں ملاحظہ کیجیے:

صاحبانِ دولت و منصب کا شکوہ ہے فضول
عام لوگوں میں بھی وہ پہلی ملنساری نہیں

احسان دانش عوامی شاعر تھے ان کے کلام میں روزمرہ بول چال بھی ملتی ہے وہ بول چال جو عام آدمی کی زندگی کا حصہ ہیں ملاحظہ کیجیے:

کسی کے سامنے اشکوں کی آبرو نہ گنوا
یہ گھر کی بات ہے، گھر میں رہے تو اچھا ہے

احسان دانش نے رومانی نظمیں کافی بھی کہی ہیں جن کا انداز حسن و عشق میں ڈوب کر والہانہ ہوتا چلا گیا۔ کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار احسان دانش کی پہچان بن گئے:

یہ بدمست آنکھیں، یہ ڈورے گلابی
بنا دیں گے دنیا کو اک دن شرابی
ابھی تک نگاہوں میں چھائی ہوئی ہے
وہ مستی میں ڈوبی ہوئی نیم خوابی
ہر اک شے میں تم مسکراتے ہو گویا
ہزاروں حجابوں میں یہ بے حجابی

احسان دانش اپنی تمام عمر مصائب سہتے ہوئے گذارتے رہے مگر ان کی شاعری میں ندرت خیال کو کمال حاصل رہا۔۔ دنیا کے کڑوے کسیلے ماحول کو برداشت کرتے ہوئے بھی ان کے اندازِ سخن میں سلاست اور روانی برقرار رہی۔ اردو شاعری کا یہ روشن ستارہ اپنے فانی جیون کو ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور میں الوداع کہہ گیا۔

اُردو شاعری میں ایک نیا زاویہ: ترقی پسند

کلاسیکی، روایت پسندی۔ رومانیت کے ساتھ ساتھ ایک اور سوچ بھی پروان چڑھ رہی تھی وہ سوچ غیر ملکی تسلط۔ سامراجی رویوں سے نفرت۔ حقوق کی پامالی۔ جبر و تشدد کے خلاف تھی یہ سوچ گو کہ پہلے سے موجود تھی مگر اس کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء نے جلا بخشی۔ اردو شاعری میں سیاسی، معاشی و سماجی شعور کا پرچار اور انسان دوستی، جمہوری رویوں اور اقدار کا چرچا شامل ہوتا چلا گیا جس نے سماجی اقدار اور رویوں کا بھرپور جائزہ لیا۔

اس دور کو روشن خیالی اور ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ یوں تو اس تحریک میں بے شمار نام آتے ہیں مگر چیدہ چیدہ میں سجاد ظہیر، مجاز، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، وامق جونپوری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، پرویز شاہدی، فیض احمد فیض، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، حسن حمیدی اور مسلم شمیم شامل ہیں۔ مذکورہ بالا ناموں میں سردار جعفری اور فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے سرخیل، سجاد ظہیر ایک اچھے نثر نگار تھے۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک گئے اُن حضرات نے مغربی افکار کا مطالعہ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو شاعری بھی ان خیالات سے متاثر ہونے لگی۔ برصغیر پاک و ہند میں ترقی پسند تحریک کا آغاز انیسویں صدی کے قریباً نصف سے ہوا، اس وقت برصغیر پاک و ہند میں سر سید احمد خان، الطاف حسین حالی، آزاد اور نذیر احمد کی اصلاحی تحریکیں اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔ انقلاب روس سے اشتراکیت کو ایک مرکز میسر آ گیا اور اس کا پرچار رفتہ رفتہ دوسرے ممالک تک پھیلنا شروع ہو گیا اور بالآخر یہ ہندوستان بھی ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ پہنچ گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور میں کہا گیا کہ ''انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو

دقیانوسوں سے بچانا ہے۔ فنون لطیفہ کو عوام کے قریب لانا ہے۔ ادب میں بھوک، غریبی، سماجی پستی، سیاسی غلامی سے بحث کرنا ہے۔ وہ ادب جو سست و بیکار بنائے رجعت پسند ہے جو عقل کو روشنی دے وہ ترقی پسند ادب ہے۔'' یہ ایک طویل کہانی ہے ہم فوری طور پر ترقی پسند تحریک اور منزل کی جانب لوٹتے ہیں۔ اس روشن خیال دور میں فراق، فیض، جذبی، مجروح، ساحر، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، پرویز شاہدی، علی سردار جعفری، وامق جونپوری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، حسن حمیدی، پروفیسر سحر انصاری، مسلم شمیم جیسے شعرا نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعری کاوشیں قرطاسِ ادب پر منتقل کیں، آیئے ہم ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شعراء کے کلام اور خدمات کا جائزہ لیتے ہیں:

☆...... اسرار الحق مجاز (۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء تا ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ادبی دنیا میں مجاز لکھنوی کے نام سے پہچانے جانے والے اسرار الحق، ۱۹/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ جامعہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ آپ ایک روشن خیال شاعر تھے گو کہ عمر بہت کم پائی مگر ان کے ادبی کارنامے اردو شاعری کا خاص حصہ ہیں۔ مجاز نے جس زمانے میں شعری کاوشیں کیں، وہ زمانہ فراق، جوش، فیض، فانی، مخدوم، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری اور جذبی جیسے روشن ستاروں کا تھا جن کی ادبی چمک دمک کے سامنے کسی بھی شاعر کا خاص مقام بنانا خاصا مشکل تھا مگر مجاز کامیاب رہے۔ مجاز کی شاعری میں حساسیت اور حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں ہے، وہ ترقی پسند تحریک کے منشور یعنی بیروزگاری کے خلاف معاشرے میں پھیلی ہوئی ابتری اور سماج کے طبقاتی نظام کے خلاف اپنے خیالات کو اپنی شاعری میں سموئے ہوئے ہیں، اُن کے کلام میں امنگ اور شرمساری سے بھرپور رومان موجود ہے۔

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

☆

سچ تو ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

☆

حسن کو شرمسار کرنا ہی
عشق کا انتقام ہوتا ہے

☆

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

☆

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کے پیچ و خم نہیں ہے

مجاز کے متعلق سردار جعفری نے یوں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ''ہم اس کو شعر رومانی کہہ کر اس کی اہمیت کم نہیں کر سکتے یہ انقلابی مزاج کا رومان تھا۔''

مجاز آگرہ میں حامد حسن قادری کے شاگرد تھے جبکہ مے کش اکبر آبادی اور فانی سے بھی اکتساب فیض کیا آپ ایک خوش مزاج اور خوش گفتار انسان وشاعر تھے مگر وہ بلا کے مے نوش بھی تھے جس نے ان کی زندگی کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مجاز کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اپنی جگہ مگر ان کی رومان پرور شاعری ان کی مقبولیت کی وجہ ہے ان کی غزلوں میں عشق ومحبت اور رومان پروری کا گہرا رچاؤ ہے مجاز کہتے ہیں کہ

ان انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو
صہبا ہی صہبا ، مستی ہی مستی

مجاز کا یہ اندازِ سخن نوجوانوں میں مقبول رہا وہ اپنی غزلوں میں تشبیہ، استعارہ، رمز وکنایہ اختیار کرتے ہوئے بے اختیار و بے ساختگی سے رومان پرور اشعار کہتے تھے

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کردیا
پی کر اٹھے شراب ہر بوستاں سے ہم

ترقی پسندانہ خیالات کے حامل مجاز نے سرمایہ دارانہ نظام کی ہر سطح پر مذمت کی، ان کے کلام میں شدت جذبات کا تاثر منفرد انداز میں ملتا ہے:

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز سرمایہ داری ہے

ممتاز حسین کے مطابق ''جدید غزل میں جو انقلابی بانکپن آیا ہے اس کی بنیاد مجاز نے رکھی ہے مجاز کا اسلوب منفرد بھی ہے اور بے داغ بھی۔ اس میں ذہانت بھی ہے اور شعریت بھی۔''

مجاز کا شعری محور اس کی زندگی کی افسردہ دلی اور مایوسیاں تھیں اپنی ذات میں وہ ایک حوصلہ مند پر امنگ اور پر حوصلہ انسان تھے مگر ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور کثرت شراب نوشی کے باعث ان کی زندگی کا اختتام مایوسیوں پر ہی ہوا اور ان کی جوانی سرمستی، حسن کی رنگینی، رفتہ رفتہ دم توڑ گئی:

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا
یہ موجوں کی بے تابیاں کون دیکھے
میں ساحل سے اب لوٹنا چاہتا ہوں
پھر مری آنکھ ہوگئی نم
پھر کسی نے مزاج پوچھ لیا
مجھے سنے نہ کوئی مست بادۂ عشرت
مجاز ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں میں

مجاز نے حسن ومحبت کے گیت گائے، مسرتیں بکھیریں، فرسودہ نظام کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ فرسودہ نظام کو بدلنے اور انقلابی سوچ کے لیے راہ ہموار کی۔ اپنے افکار میں سماجی افکار شامل کیے۔ غزلوں میں دردمندی کو داخل کیا اور نشاطیہ عنصر سے دوری اختیار کی اور ان مسائل سے لڑتے، الجھتے ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ رومانیت کے شہید اور مغنیِ آتش نوا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆...... محی الدین مخدوم (۴فروری۱۹۰۸ء تا۲۵اگست ۱۹۶۹ء)

ابوسعید محمد مخدوم محی الدین ۴فروری ۱۹۰۸ء کوسنگا ریڈی کے قریب اندول ضلع ملاک حیدر آباد' دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام غوث محی الدین تھا ان کا تعلق مذہبی گھوارے سے تھا۔ بنیادی طور پر مخدوم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا مخدوم اپنے اردگرد پھیلے بھوک' افلاس' غربت اور استحصالی ماحول دیکھ کر بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے اور اپنی پوری زندگی اس استحصالی نظام سے جنگ میں گذار دی۔ آپ سٹی کالج حیدر آباد میں لیکچرار بھی رہے نوکری سے استعفٰی دے کر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہو گئے۔ پہلی مرتبہ حیدر آباد سے الیکشن لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے بعد ازاں حضور نگر سے ضمنی انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور قانون ساز اسمبلی کے رکن بن گئے۔ مخدوم خالصتاً ایک مزدور طبقے کے شاعر و ترجمان تھے۔ ممبر قانون ساز اسمبلی بن کر بھی مخدوم نے کسی سے رشتہ نہیں توڑا۔

مخدوم کی شاعری ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے جس کا شمار حقیقت نگاری میں ہوتا ہے۔ مخدوم انقلابی شاعر تھے مگر انقلابی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں تغزل اور رومان بھی اعلیٰ درجے کا ہے ملاحظہ کیجیے

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح آپ آتے رہے' جاتے رہے

☆

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن

مخدوم بطور ممبر قانون ساز اسمبلی ہوتے ہوئے اشتراکیت اور مارکسزم کے افکار کے پیروکار رہے اور تادم مرگ مصائب اٹھانے کے باوجود قائم بھی رہے وہ اپنے نصب العین میں اولوالعزم اور پکے یقین کے آدمی تھے۔

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا

اور وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا

حیات لے کے چلو' کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

ان کا شوخ رنگ بھی ملاحظہ ہو

بھرنے لگا بازو تو ہوئے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

غرضیکہ مخدوم کی شاعری میں تغزل کا رنگ' مزاحمتی و علامتی شاعری' غریب' مزدور' کسانوں کی تمثیل نگاری اور سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت جیسے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جو انہیں ترقی پسند شاعروں میں ممتاز کیے ہوئے ہیں۔ مخدوم کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری دیگر شعراء کی طرح رومان پرور شاعری ہے جو ان کے ایام طالب علمی میں پروان چڑھی یہ کالج کا زمانہ تھا۔ مگر جب غریب عوام کو غربت کی چکی میں پستے دیکھا تو اُن کی شاعری نے روایت سے بغاوت کی اور ترقی پسندانہ روش کے ساتھ سیاسی جدوجہد اور سماج سے بغاوت کی شاعری شروع کر دی اور یوں رومان پرور مخدوم محی انقلابی شاعر بن گیا۔

نہ کسی کی آہ کی آواز' نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

آپ کی انقلابی شاعری سے متاثر ہو کر راج بہادر گوڑ نے لکھا ہے کہ ''مخدوم کا ہنر یہی ہے کہ وہ قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر سکتے ہیں۔''

مخدوم کے شعری مزاج میں بے باکی اور وارفتگی نمایاں ہیں۔ ان کا ترنم خوب تھا شعر پڑھتے ہوئے سماں باندھ دیتے تھے جوش' ولولہ اور انقلابی آواز سے مجمع پر سکتہ طاری کر دیتے تھے۔ ان کی زندگی ذیل کے شعروں کی مانند تھی:

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

بطور ترقی پسند شاعر مخدوم عمر بھر معاشرے کی استحصالی قوتوں سے متصادم رہے۔

مخدوم محی الدین تصانیف کے آئینے میں:۔

بساطِ رومی، گلِ تر، ہوش کے ناخنِ حیدر آباد۔ سرخ سویرا، ٹیگور اور ان کی شاعری

تم نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

......

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ راز الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

ایک نظم:

آج کی رات نہ جا
رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا
زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے

زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دل دار بھی ہے
آج کی رات نہ جا
آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

☆...... پرویز شاہدی (۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء۔۵ مئی ۱۹۶۸ء)

شاد عظیم آبادی جیسے عظیم شہرت کے حامل شاعری کی جنم بھومی سے تعلق رکھنے والے پرویز شاہدی نے ۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء کو عظیم آباد، پٹنہ سٹی، بہار (انڈیا) میں سید احمد حسین کے گھر آنکھ کھولی۔ سید احمد حسین خود بھی ایک شاعر تھے۔ پرویز شاہدی کا اندازِ سخن ترقی پسندانہ ہے، وہ ترقی پسند تحریک کے ایک اہم رکن ہیں۔ پرویز شاہدی نے غزل اور نظم گوئی میں طبع آزمائی کی۔ رباعی بھی کہیں مگر انہیں اس میدان میں پذیرائی نہ مل سکی، اپنے منفرد لب و لہجے کے باعث وہ اشتراکیت پسند، ترقی پسندوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں ناسخ، غالب اور جگر کا رنگ نظر آتا ہے، ایک رنگ ملاحظہ ہو

پردہ وہ اپنے رخ سے ہٹاتے چلے گئے
مجھ کو مری نظر سے چھپاتے چلے گئے

اس رنگ غزل کے بعد پرویز شاہدی کی سوچ میں تبدیلیاں آئیں جو ان کے اندازِ سخن میں بھی جھلکتا ہے:

تنگ آ کے وہ اندازِ جنوں چھوڑ دیا
جب خبر آئی کہ اب دشت میں وحشت نہ رہی

اگر گناہ یہی ہے کہ تجھ سے پیار کیا
تو ہاں گناہ کیا اور بار بار کیا

پرویز شاہدی نے ایک عرصہ تک اپنی شاعری کو ساقی، شراب، حسن اور عشق تک محدود رکھا مگر جب زمانہ کے مسائل اور استحصال نے ان کی طبیعت پر اثر کیا تو ان کا انداز سخن بدلنے لگا اور اشتراکی فلسفہ کے زیر اثر ہوتے چلے گئے اس میں کوئی شک نہیں کہ پرویز شاہدی نے اشتراکیت کے زیر اثر ہونے کے بعد مجموعی طور پر ترقی پسند خیالات کو اپنا محور رکھا مگر اس عرصے میں بھی ایسی غزلیں ملتی ہیں جن میں رومانیت کی چاشنی، سرمستی، فکری لطافت، موسیقیت اور غنائیت ملتی ہے:

اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

☆

کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا

پرویز شاہدی کے شعری مجموعے رقصِ حیات اور تثلیث حیات شائع ہو کر عوام الناس سے مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ پرویز شاہدی تمام عمر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اس حوالے سے وہ ترقی پسند شاعر مانے جاتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں معاشرتی مسائل، سماجی حالات، بے بسی و بے کسی، استحصال جیسے مضامین کا پرچار ہے:

کیوں دار و رسن کے سائے میں منصور کی باتیں کرتے ہو
رکھنا ہے جو اونچا سر اپنا تو اپنے سر کی بات کرو

☆

ہوائے تند میں یہ ریشمی خیمے نہ ٹھہریں گے
کہاں تک آزماؤ گے وفاداری طنابوں کی

عظیم آباد، پٹنہ جس کو اردو غزل کے عظیم شاعر شاد عظیم آبادی کی وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے اسی دبستانِ عظیم آباد نے تین ایسے باکمال شاعر پیدا کیے جو روایت اور رومانیت کے ساتھ انقلابی شاعری کے اہم شعرا مانے جاتے ہیں۔ ان شعرا میں جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی شامل ہیں ان تینوں شعرا نے انقلابی تحریک اور ترقی پسند تحریک میں اپنا تشخص بنایا۔

پرویز شاہدی نے جہاں غزل میں تازہ گوئی کو اپنایا وہیں اس نے اپنے افکار میں ایک عام آدمی کے مسائل اور معاشرے کی استحصالی روش کو طبع آزمائی میں شامل کیا اور اس امتزاج نے پرویز شاہدی کی شاعری کو منفرد تابناک اور پراثر بنا دیا۔ اردو شاعری کا یہ ترقی پسند شاعر ۵ مئی ۱۹۶۸ کو اس دنیا کو خیر باد کہہ گیا:

میں کیوں ساقی سے جا بھیک مانگوں جام زریں کی
کروڑوں انکھڑیوں کے کھل گئے ہیں آج میخانے
ابھی سے صبحِ گلشن رقص فرما ہے نگاہوں میں
ابھی پوری نقاب الٹی نہیں ہے شامِ صحرا نے

نمونہ کلام: پرویز شاہدی کی ایک غزل:

زندگی نے فصلِ گل کو بھی پشیماں کر دیا
جس بیاباں پر نظر ڈالی، گلستاں کر دیا
تو نے یہ کیا کیا اے سکوتِ شکوہ ساماں کر دیا
دل کی دل ہی میں رہی، ان کو پشیماں کر دیا
شکریہ اے موسمِ گل پاسِ وحشت ہے یہی
گلستاں کو تو نے ہم دیوار زنداں کر دیا
کتنے افسانے بنا کر رکھ دیے تھے شوق نے
یوں نقاب الٹی حقیقت نے کہ حیراں کر دیا
کس قدر مضبوط نکلے تیرے دیوانے ہاتھ

شامِ غم کو جب نچوڑا صبحِ تاباں کردیا
پھول برسائے ہیں کیا کیا تیغ خوں آشام نے
تم نے شہرِ گل عذاراں کوگلستاں کردیا
سینۂ صنعت میں بھر کر اپنے دل کا اضطراب
آہن و فولاد کو میں نے غزل خواں کردیا

☆...... علی سردار جعفری (۲۹ نومبر۱۹۱۳ء تا یکم اگست ۲۰۰۰ء)

علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند تحریک کے اہم شعرا میں ہوتا ہے' آپ ایک بلند پایہ شاعر اور حقیقت پسندانہ نقاد تھے۔علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک اور روشن خیالی کی وجہ سے کئی بار پابندِ سلاسل ہوئے' علی سردار جعفری کے ذکر کے بغیر ترقی پسند تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے کے سپاہی نے علی گڑھ اور دیگر شہروں میں اردو ادب کے مشہور ادباء اختر حسین رائے پوری' سبطِ حسن' حیات اللہ انصاری' آل احمد سرور' عصمت چغتائی' جذبی اور مجاز کے ساتھ اچھا وقت گزارا۔علی سردار جعفری کا لگاؤ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی جانب تھا' ان کی کاوشوں کے طفیل اردو ادب' ترقی پسندیت اور کمیونسٹ پارٹی بہت نزدیک آ گئیں۔ان کا ذیل کا رنگ ان کے افکار کا آئینہ ہے:

کعبہ و دہر و کلیسا کی بجھادیں قندیل
ہر طرف مشرق و مغرب میں چراغاں کردیں

☆

چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذروں کو درخشاں کردیں

☆

جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

ادب مزاحمتی ہو یا رومانی ادب ہمیشہ سے معاشرتی رویوں اور اقدار کی پیداوار ہی رہا ہے۔اس کا شمار ریاضی کی ہم زاد مساواتوں کی طرح ہوتا ہے جو بلاواسطہ اور بلواسطہ ایک دوسرے سے متصف رہتی ہیں۔علی سردار جعفری معاشرتی' سماجی اورا خلاقی پامالیوں سے نبرد آزما رہتے ہوئے۔انقلاب کے حامی تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اور دیگر نگارشات عوام کے احساسات کا حقیقی ترجمان ہے۔

سیاسی نظریات کے طور پر علی سردار جعفری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے وابستہ رہے۔ ابتدائی طور پر آپ کا ذہن افسانہ نگاری کی طرف مائل تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''منزل'' ہے بعد ازاں فکری شعور شاعری کی جانب مائل ہوگیا۔۱۹۶۷ء میں انہیں پدما شری کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

علی سردار جعفری ایک اشتراکیت اور ترقی پسند شاعر افسانہ نگار کے طور پر ادب کے افق پر جانے جاتے ہیں' مگر ان کی ابتدائی تربیت لکھنؤ کے روایتی مدرسے سلطان المدارس میں ہوئی ان کا خاندان مکمل مذہبی تھا۔ان کو خاندانی کام کاج شاید پسند نہ ہوا اور ان کی طبیعت میں باغیانہ پن سما گیا اور وہ لینن اور مارکسزم کے پختہ پیروکار بنتے چلے گئے۔اپنی ترقی پسندانہ روش کی وجہ سے وہ کئی بار پابند سلاسل بھی ہوئے۔علی سردار جعفری کے ہاں غزل سے زیادہ نظم پر توجہ ہے ان کے کلام میں سادگی' بے باکی' جوش اور ولولہ ہے۔علی سردار جعفری کا دور رومانوی شاعری کا دور ہے مگر مارکسزم اور اشتراکیت کے اثر نے ان کو رومانی اثر سے دور رکھا۔علی سردار جعفری کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے غزل گوئی میں سیاسی رنگ شامل کیا:

کام اب کوئی نہ آئے گا فقط دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
تیغ منصف ہو جہاں دار ورسن ہوں شاید
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

☆

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گذر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

☆

جعفری کا ایک اور اندازِ سخن ملاحظہ ہو:

حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوگئیں
ہاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں

وسائل پر قابض سماج اور ان کے رویوں کے بارے میں اپنے خیالات کس سادگی اور بے باکی سے بیان کیے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عوام سے براہ راست مخاطب ہیں:

سکوں میسر ہو تو کیوں کر ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل نظام دار و رسن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے سازِ کہن وہی ہے

علی سردار جعفری کا شمار بین الاقوامی طور پر اردو زبان کے تہذیبی سفیروں میں ہوتا ہے جب بھی بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے پاکستان کا دورہ کیا' بھارت کی جانب سے علی سردار جعفری کے لکھے ہوئے گیتوں کا کیسٹ ''سرحد'' بہ آواز سیما سہگل پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم محمد نواز شریف کو پیش کیا، یہ دو ملکوں کو ملانے کی ایک کوشش تھی جو وقت کے آڑے ہاتھوں کامیاب نہ ہوسکی:

جعفری کی ایک نظم
یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے سوچتا ہوں

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمیں کو گود میں اٹھا لوں
اور اُس کی شاداب لہلہاتی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں
(اودھ کی خاکِ حسیں)

ہماری تشنگی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے
جسے ساقی گری کی شرم ہو آتش بہ جام آئے

☆

راہ میں فوجوں کا پہرا سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکت شاہانہ ہم
جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

اپنی انقلابی سوچ کو ایک انتظار ایک امید قرار دیتے ہیں اور حالات کے اچھا ہونے کی نوید سنا چاہتے ہیں اور اپنے شعری مزاج کے مطابق یوں گویا ہوتے ہیں:

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

علی سردار جعفری کی بے باکی درج ذیل نظم ''کون سچ بولے گا'' میں ملاحظہ کیجیے

کون اس عہد میں سچ بولے گا
حرف آتے ہیں قطاروں میں سپاہی کی طرح
حکم شاہی کی طرح
اور پھر آتے ہیں کچھ اور بھی حرف
صف بہ صف دستِ جنوں باندھے ہوئے
ایک بھی حرف نہیں جو دل و جاں بن جائے
عہدِ حاضر کی زباں بن جائے

سچ تو اک درد ہے' اک زخم ہے' اک جرات ہے
قید و زنداں بھی ہے سچ اور رسن و دار بھی ہے
لذتِ شوق بھی ہے پیے ندرتِ اظہار بھی ہے
''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگنِ عشق''

جبر و استحصال' زباں بندی اور بسمل رقصِ حیات لیے اور ایک رنگ ملاحظہ ہو:

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلِ روانِ درد حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں، ہر موڑ پہ بسملِ روضاں ہے
ہر لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

ترقی پسند شاعری' ادب کا یہ خوش اسلوب نقاد اپنی ہمہ جہت شخصیت کا بھرپور سفر عقل و شعور کے ساتھ گزارتے ہوئے یکم اگست ۲۰۰۰ء کو اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپ ممبئی میں مدفون ہیں۔

☆...... وامق جونپوری (۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء تا ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء)

''بھوکا بنگال'' جیسی مشہور زمانہ نظم کے خالق احمد مجتبیٰ زیدی' وامق جونپوری ترقی پسند تحریک کے اہم نظریاتی شاعر تھے' انہوں نے اپنی ساری زندگی ترقی پسند نظریات کے پرچار و تشہیر کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کا تعلق ایک آسودہ حال زمیندار گھرانے سے تھا مگر وہ سامراجی دہشت کے سخت مخالف تھے ان کے شعری مجموعوں میں چیخیں' جرس' شب چراغ اور سفرِ ناتمام شامل ہیں' نمایاں خصوصیت باغیانہ تیور سے بھرپور نظمیں ہیں۔

یاسیت کا ہمیں ملزم نہ بناؤ یارو
آگ جو دل میں لگی ہے وہ بجھاؤ یارو
یہ بھی ممکن نہیں ہو تو رحم نہ کھاؤ یارو
ہم ہیں حق گو ہمیں سولی پہ چڑھاؤ یارو

عشق اور جذبہ محبت کا رنگین شعر ملاحظہ ہو:

جس کا مذہب ہو فقط یادِ صنم دیدِ صنم
وہ نہیں جانتا کافر یا مسلماں ہونا

وامق کی شاعری میں محبوب اور اس کے لب و رخسار کا تذکرہ بھی ملتا ہے لیکن یہ انداز زمانے کے بدلتے ہوئے اقدار کے ساتھ اور جنگِ آزادی اور عوامی زندگی کے استحصال کے زیر اثر آکر ترقی پسندیت کی جانب مائل ہو گیا:

رات بھی مرجھا چلی چاند بھی کمھلا گیا
پھر بھی ترا انتظار دیکھئے کب تک رہے
ہم نہ کہتے تھے شاعری ہے وبال
آج لو گھر گئے حسینوں میں
پابندیوں میں تھے تو دکھاتے تھے معجزے
آزادیوں میں شعبدہ گر ہو کے رہ گئے

ترقی پسند دور کی شروعات اردو ادب میں رومانوی دور سے ہے' وامق جونپوری بھی اُسی دور سے ترقی پسند شاعری کے ہراول دستے میں شریک رہے۔ وامق جونپوری کی ابتدائی شاعری میں حسن و عشق کے معاملات روایت پسندی کے حوالے سے ملتے ہیں مگر شعوری کروٹ نے اسے روشن خیالی اور ترقی پسندیت کی جانب دھکیل دیا اور وہ انقلابی غزل گو شعراء کے گروہ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے اور درج ذیل رنگ اپنایا:

اٹھ کر زمیں سے جھونک دیئے میں نے آسمان
پابند سنگ ہو کے رہوں وہ شرر نہیں
زنجیر ٹوٹنے کی صدا سن رہے ہو تم
کس نے کہا ہماری فغاں میں اثر نہیں

وامق نے زندگی کے ہر ایک رخ پر طبع آزمائی کی۔ چاہے سیاسی ابتری ہو سماجی و معاشی

حالت ۔ بنگال کی قحط سالی یا سیاسی اکابرین کی پرخونی چپقلش ۔ انجمن ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر وامق جون پوری کی نظم ''بھوکا بنگال'' کے لیے لکھتے ہیں کہ ''وامق جونپوری کے اس ترانے سے لاکھوں آدمیوں کا جذبہ حبِ وطن اور اتحاد بیدار ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پیپلز تھیٹر کے پروگرام میں اُس زمانے میں وہ ایک ایسا زبردست وسیلہ تھا جس کے ذریعے لاکھوں روپیہ اور غلہ بنگال کے لیے جمع کیا اور ہمارے ہزاروں ہم وطنوں کی جان بچی ۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں وامق کا یہ ترانہ صحیح معنوں میں سونے کے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔''

وامق کی نظم ''مینا بازار'' شعراء اور ادیبوں' کسانوں' مزدوروں' طالب علموں' امراء اور روٗسا میں بہت مقبول رہی ۔ اس نظم کے بارے میں ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین کی رائے ''وامق کی نظموں میں مینا بازار مخصوص توجہ کی مستحق ہے اس میں شاعری اور مقصد کا حسین امتزاج ہے ۔ مرقع' خوبصورت پر اثر اور متنوع ہیں موسیقی دھیمی اور غمناک ہے ۔ الفاظ رواں اور سادہ ہیں ۔ علامتیں واضح اور خلوص گہرا ہے ۔ اس میں سماجی حقیقت نگاری کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔''

وامق کا ایک اندازِ سخن:

مرے ناصحا مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں
میں حریف مسلکِ بندگی تجھے سنگ در کی تلاش ہے
مجھے عشق حسن و حیات سے' مجھے ربطِ فکر و نشاط ہے
مرا شعر نغمۂ زندگی تجھے نوحہ گر کی تلاش ہے
اسے ضد کہ وامقِ شکوہ گر کسی راز سے نہ ہو باخبر
مجھے ناز ہے کہ یہ دیدہ ور مری عمر بھر کی تلاش ہے

وامق کا تعلق ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تھا ۔ آپ کے والد مصطفیٰ حسین کلکٹر تھے ۔ وامق کے دادا مجتبیٰ حسن عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے ۔ وامق کی بود و باش اچھے ماحول میں ہوئی ۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وکالت کرنے لگے مگر طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوگئی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شعری سفر پر روانہ ہوگئے اور ترقی

پسند شاعری میں ایک مقام پر پہنچے ۔ وامق نے اپنی غزلوں اور نظموں میں سلاسلت اور روانی کو دوام عطا کیا اس وقت کے حالات نے وامق کو انقلابی شاعر بنا دیا یہ تمام رنگ وامق کے اشعار میں نمایاں ہیں:

پابندی میں خون بھی پانی
آزادی میں پسینہ بھی گوہر

وامق جونپوری ایک وضعدار زندگی گزار کر ۱۹۹۸۲۱ء کو جون پور اتر پردیش بھارت میں انتقال کر گئے:

یہ ہم کو چھوڑ کر تنہا کہاں چلے وامق
ابھی تو منزلِ معراج دار باقی ہے

☆...... جاں نثار اختر (۱۸ فروری ۱۹۱۴ء ۱۹ اگست ۱۹۷۶ء)

جاں نثار اختر کی غزلوں میں ترقی پسندیت اور روشن خیالی کے ساتھ ساتھ مضامین و موضوعات کے تنوع' حسن و عشق کی چاشنی' نغمگی اور غزل کے کلاسیکی رچاؤ نے ان کی شاعری میں عوام الناس کی پسند نے چار چاند لگا دیئے ہیں ۔ وہ بیک وقت ترقی پسند بھی ہیں کلاسیکی شاعر و نغمہ نگار بھی ہیں ان کے مزاج میں سچائی' کھرا پن اور بے ساختگی نمایاں ہے ۔

صندل سی مہکتی ہوئی پر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

☆

جب رات گئے کوئی کرن میرے برابر
چپ چاپ سی سو جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

انقلابی سوچ اور رنگ سخن ملاحظہ ہو:

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگین جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

غزل کی تعریف جاں نثار اختر کی زبانی دیکھیے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

شمس الرحمٰن فاروقی جاں نثار اختر کے لیے لکھتے ہیں کہ ''اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہمارے عہد کی شاعری میں جاں نثار اختر کی غزل اپنی مضبوط انفرادیت' شائستگی' دروں بینی اور سکہ بند تصورات سے بےخوف ہو کر شاعرانہ اصرار کی وجہ سے نمایاں ہے۔''

جاں نثار اختر اپنے زمانے کے اور عہد حاضر کے مستند رومانی شاعر ہیں مگر اپنے بدلتے ہوئے افکار کے باعث وہ رومانی سے زیادہ ترقی پسند شاعر کہلانا پسند کرتے تھے آپ کے شعری مجموعوں میں سلاسل' جاوداں اور حرف آشنا شامل ہیں۔

جاں نثار اختر ایک لاجواب شاعر تھے اپنے حلقہ دوستاں میں وفادار دوست مگر افسوس وہ اپنی عائلی زندگی میں نہ اچھے شوہر ثابت ہوئے اور نہ ایک اچھے ذمے دار باپ۔ جاں نثار اختر ایک ترقی پسند شاعر ہوتے ہوئے حسن وعشق سے بھرپور رومانی شاعر ثابت ہوئے انہوں نے غزل میں کوئی نیا تجربہ تو نہیں کیا مگر ان کی مترنم اور مدھر لے والی غزلیں ان کا ہی خاصہ ہیں زمانے کے حالات سے تنگ آ کر وہ یوں بھی گویا ہوئے:

تم پہ کیا بیت گئی کچھ تو بتاؤ یارو
میں کوئی غیر نہیں ہوں کہ چھپاؤ یارو

☆

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے
ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

☆

92

فرق کچھ بھی نظر آتا نہیں زندانوں میں
صرف اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

جاں نثار اختر حقیقت نگاری پر یقین رکھتے ہیں وہ کسی کی تقلید کے بجائے اپنا انداز اپنائے ہوئے تھے۔ مگر شروع کی شاعری میں وہ مقلد نظر آتے ہیں مذکورہ کلام پر جوش' فیض اور مجاز کا اثر نظر آتا ہے۔

علی گڑھ کی ہوشربا ادبی محفلیں جاں نثار اختر کی تربیت گاہ تھیں وہیں جاں نثار اختر کا رنگ سخن نکھرا' ان کی غزلوں میں تازگی' ندرت خیال' امید' یقین بھرے جذبات ملتے ہیں:

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے اب تک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

جاں نثار اختر ۱۹ اگست ۱۹۷۶ء کو بمبئی ہندوستان میں انتقال کر گئے آپ کے یادگار شعری اثاثہ کے علاوہ بیٹے جاوید اختر ہیں۔

☆...... کیفی اعظمی (۱۴ جنوری ۱۹۱۹ء تا ۱۰ مئی ۲۰۰۳ء)

بچپن ہی سے بلند پایہ شاعری کا دعویٰ کرنے والا سید اطہر حسین اردو ادب میں کیفی اعظمی کے نام سے ایک اعلیٰ مقام پر پہنچا۔ یہ اس کے عزم و استقلال کی کامیابی تھی جس نے اس کامرانی سے ہمکنار کیا۔ کیفی اعظمی نے اپنی شاعری اور اس کے پس منظر میں اپنی سیاسی فکر کے ساتھ اپنی زندگی کے نصب العین کو معاشی وسماجی وسیاسی اقدار کے بدلتے رویوں کو مقدم رکھا کیفی اعظمی نے اپنی شاعری خصوصاً نظموں میں انتہائی خوبصورت علامتیں اور استعارے استعمال کیے ہیں' ایک خوبصورت رنگ ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجیے:

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہم عصر شعرا سے زیادہ ممتاز رہے۔ احمد فراز اور محمد علی تاج' کیفی بھوپالی ترقی پسند خیالات رکھنے والے شعرا تھے اگرچہ

کیفی اعظمی رومانوی لہجہ بھی رکھتے تھے مگر ان کے ہاں رومانویت اور حسن وعشق کے مضامین اس انداز میں بیان کیے ہیں کہ ان پر رنگ تغزل نمایاں ہے:

تم اتنا حسن لے کرکیا کرو گے
ارے کچھ تو خدا کے نام کردو
درد سے چہرے کی تابانی بڑھی
گھر جلا تو آسماں روشن ہوا

کیفی اعظمی کی ترقی پسند فکراور رجعت پسندی اور انقلابی فکر کےفکری پرچار ان کی شاعری کا خاصہ ہیں جن میں انہوں نے معاشرے کی بدحالی' ناانصافی کی مخالفت اور وسائل سے محروم لوگوں کی نمائندگی کی:

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

☆

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل میرا
کسی کے ہاتھ اس پر نشاں نہیں ملتا

کیفی اعظمی سخت قسم کے اشتراکیت پسندی کےعلمبردار تھے۔ان کے افکار میں جگہ جگہ سوشلزم اور اشتراکیت کا پرچار ملتا ہے۔کیفی اعظمی کے لیےڈاکٹر مظفرحنفی کی رائے''بات یہ ہے کہ نظریات محض ذہن پر غالب آ گئے ہوں اور شاعر انہیں شعر میں منقلب کرنے کی کوشش کرے تو محض منظوم بیانات سامنے آتے ہیں لیکن جب کوئی نظریہ ذہن کی راہ سے دل میں اتر جائے اور وہاں سے فنکار کے پور پور میں رچ بس جائے تو پھر وہ نظریہ نہیں' عقیدہ بن جاتا ہے اور عقیدہ اکثر شاعروں کے یہاں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے۔کیفی اعظمی کے یہاں بھی اشتراکیت کے تصورات اور نظریات نے عقیدے کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔''

کیفی کی تخلیقات میں جھنکار' آخرِ شب اور آوارہ سجدے شامل ہیں جبکہ ان تمام

93

مجموعوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کیفی اعظمی نظم کے شاعر ہیں جبکہ غزل کم کم کہی ہے۔اول الذکر دوشعری مجموعےنظم پر مشتمل ہیں جبکہ تیسرے شعری مجموعہ''آوارہ سجدے''میں کچھ غزلیں شامل ہیں۔

دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح کیفی اعظمی کا نصیب العین بھی جاگیردارانہ نظام کے خلاف صف آرائی' عوامی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا اور ظلم واستبداد کے خلاف دادرسی کے لیے پکارنا جیسے مضامین ہیں جن سے خیالات ایک دوسرے شعراء سے ٹکراجاتے ہیں اور پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ فن پارہ کس کی تخلیق ہے گویا یہ شعری کاوشیں یکسانیت کا شکار ہوتی چلی گئیں۔

ہندوستان میں آپ کوفلمی دنیا سے بھی کافی پذیرائی ملی۔آپ کوساہیتہ اکیڈمی ایوارڈ سے اور پدم شری اعزاز برائے ادب وتعلیم سے نوازا گیا۔ نیز فلم فیئر اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ ہندوستان کی معروف سماجی شخصیت فلمی اداکارہ شبانہ اعظمی کی کیفی بیٹی ہیں اور جاوید اختر کی اہلیہ:

کیفی کا ایک اندازِسخن ملاحظہ ہو:

مدت کے بعد اس نے جو الفت سے کی نظر
جی خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

بمبئی کی فلمی دنیا میں کیفی اعظمی نے بہت نام کمایا۔درج ذیل چند نغمات ابھی بھی زبان زدعام ہیں:

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں ملو تو آنکھ چرائیں
ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہوگا
دل کی سنو دنیا والو
آج کی رات گرم ہوا چلی ہے

اور بہت سے۔

کیفی اعظمی کی نظمیں پیکر تراشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔کیفی عام فہم الفاظ وتراکیب استعمال کرتے ہیں۔کیفی اعظمی سماجی ومعاشی ناہمواری کو دور کر کے ہر ایک فرد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنا چاہتے تھے۔کیفی اعظمی کی انقلابی شاعر کا ایک پہلو ملاحظہ ہو:

کبھی آگے کبھی پیچھے کئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
ذہن کے واسطے سانچے تو نہ بدلے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں بدلنا ہوگا
یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلادیں گے زمانے کو جلنا ہوگا
راستے گھوم کے سب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کسی رخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا

کیفی اعظمی کے شعری سفر اور خدمات پر افتخار عارف کا خراج تحسین:

’’کیفی اعظمی بھارت کے ترقی پسند شعراء کی آخری نمایاں آواز تھے۔مخدوم محی الدین‘ جاں نثار اختر‘ مجروح کے بعد کیفی اعظمی کا رخصت ہوجانا بھارت کی ترقی پسند تحریک اور اردو کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔‘‘

کیفی اعظمی ترقی پسند تحریک اور اردو زبان کی خدمت کرتے ہوئے ۱۰مئی ۲۰۰۲ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے اور یہ پیغام دے کر رخصت ہوئے:

بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

☆...... مجروح سلطان پوری (یکم اگست ۱۹۱۹ء تا ۱۲مئی ۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق مجروح سلطان پوری کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء جواُن

کے صاحبزادے مجروح سلطان پوری کے سوانحی خاکے میں لکھا ہے جبکہ دیگر جگہ ۱۳ اگست ۱۹۱۵ء اور یکم اکتوبر ۱۹۱۵ء بھی درج ہے۔مجروح سلطان پوری ترقی پسند قبیلے کے رکن ہیں مگر انہوں نے ترقی پسندانہ شاعری کے ساتھ ساتھ تغزل کا دامن بھی زور وشور سے تھامے رکھا۔مجروح سلطان پوری کے کلام میں جتنی بھی نگارشات شامل ہیں ان میں کلاسیکی تغزل کی چاشنی ملتی ہے:

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

اگر دیکھا جائے تو مجروح کلاسیکیت کے پیروکار نظر آتے ہیں وہ اپنی طبع آزمائی میں غزل کی تمام نزاکتوں کو مقدم رکھتے ہیں ان کے کلام میں جگہ جگہ حسن وعشق سے لبریز جذبات سے سرشاری نظر آتی ہے:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

☆

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ڈاکٹر وحید اختر کی نظر میں ’’مجروح کی غزل انحراف اور اجتہاد کی آواز ہے‘‘ اور معین احمد جذبی کے مطابق ’’مجروح اپنے ہم عصر شاعروں میں مجھے سب سے ممتاز نظر آتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ فطری شاعر ہیں۔ان کی شخصیت میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک شاعر کو غیر شاعر سے ممیّز کرتے ہیں۔‘‘

مجروح سلطان پوری بنیادی طور پر طبیب تھے مگر ان کی طبیعت طبابت کے ساتھ ساتھ شاعری کی طرف مائل ہوگئی اور مجروح طبیب کم کم اور شاعر زیادہ ہوگئے۔مجروح کا تعلق بھی ترقی پسند شعراء کے قبیل سے ہے۔یہ بھی سوشلزم اور اشتراکیت کے حامی و پیروکار تھے۔مجروح

کی شعری کاوشوں کو فلمی نغمات کے ذریعے شہرت ملی۔ وہ خود بھی اعلیٰ ترنم کے مالک تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم کارکن اور ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہے ممتاز محقق و تنقید نگار ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ''مجروح کے یہاں فنی پابندیوں کے ساتھ جو ولولہ خیزی اور حوصلہ مندی ہے وہ اسے دوسرے فنکاروں سے الگ کر دیتی ہے۔''

مجروح غزل کے میدان میں کلاسیکی روایت کے پیروکار نظر آتے ہیں مگر انہوں نے سیاسی رمزیت کے ساتھ غزل کو نیا آہنگ دیا۔ معیاری شعر اور حسن بیان کے ساتھ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا جس سے غزل کا حسن سنورتا چلا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے جوش اور ولولہ انگیز عہد میں بھی مجروح اعتدال پسند رہے۔ مجروح کو ان کی ادبی خدمات پر غالب ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، عالمی اردو کانفرنس ایوارڈ، اردو ہندی ساہتیہ ایوارڈ۔ اقبال سمان اور فلمی دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ ''دادا صاحب پھالکے'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پروفیسر محمد حسن مجروح سلطان پوری کی شعری خدمات کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں ''یہ تہذیب، رسم عاشقی، یہ باوقار سرشاری، مجروح کی عشقیہ شاعری کی پہچان ہے۔ یہاں لذت پرستی اور ذات اہم نہیں۔ وقارِ حسن اور جمال کی روشنی اہم ہے۔ یہ انسانی تعلقات کا ایک لطیف مرحلہ ہے جسے مجروح مرقع ساز اشعار میں بیان کرتے ہیں۔''

مجروح کو ترقی پسند غزل گو شعراء میں امتیاز حاصل ہے۔ وہ غزل کی صنف پر دسترس رکھتے تھے جس سے ان کی غزل کا ایک معیار نظر آتا ہے، مجروح کے چند اشعار:

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے ایک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایمان ہے

☆

التفات سمجھو یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

☆

تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
یہ کھلے صبح چلے یہ جھکے شام ڈھلے

☆

میں کہ ایک محنت کش میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

☆

مجروح دیکھ ٹوٹ گئی جنگجو کی تیغ
ابروئے ایشیا کی فقط اک شکن کے ساتھ

☆

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا سکے سر
اڑی زلف چہرے پر اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

☆

دعائیں دے رہے ہیں آبلے مجھ آبلہ پا کے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

☆

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

☆

دیکھ گلشن سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروح اپنی وسعت نگاہ، ولولہ انگیزی، حوصلہ مندی، دلکش تراکیب اور نزاکتِ خیال سے غزل کو سنوارتے ہوئے ۲۴ مئی ۲۰۰۰ء کو ممبئی میں انتقال کر گئے۔

☆...... فیض احمد فیض (۱۳فروری۱۹۱۱ء۔۱۶نومبر۱۹۸۴ء)

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' جیسی شہرہ آفاق غزل کے خالق فیض احمد فیض ایک رومان پرور شاعر تھے مگر ان کی شہرت اور مقام ترقی پسند تحریک بنا۔ فیض احمد فیض اشتراکیت کے علمبردار تھے جبکہ وہ اسٹالنسٹ فکر سے متاثر تھے۔ برصغیر میں آپ کا شمار غالب اور اقبال کی صف میں ہوتا ہے۔ سیاسی اعتبار سے آپ کا جھکاؤ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے تھا جبکہ سجاد ظہیر کے ساتھ ہونے کے رشتے سے آپ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ فیض کے ابتدائی افکار رومانویت پسند تحریک سے وابستہ رہے بعد میں ترقی پسند تحریک کی بدولت آپ کی غزلوں میں احتجاج' جبر واستحصال' انقلابی سوچ اور نظریات کا پرچار ملتا ہے یہ وصف ان کو بین الاقوامی شہرت تک پہچانے میں معاون ثابت ہوا۔ فیض نے عشق اور انقلاب دونوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ فیض کی شاعری کسی اشرافیہ طبقہ یا امراء تک محدود رہنے کے بجائے عوام الناس تک پہنچی اور مقبول ہوئی کیونکہ فیض نے عصری مسائل' بنیادی انسانی اقدار اور رویوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات کی ترجمانی کی اور اپنے دلفریب انداز سے لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ فیض کا رومانوی مشاہدہ، خیالات واحساسات کی نازک خیالی ان کی غزل میں ایک روح میں اترنے والی نغمگی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فیض کا کوئی مصرع یا نظم کا بند بے کیف نہیں ہے

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

☆

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنادیا
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو

منصف ہو تو حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
واعظ ہے نہ زاہد ہے ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کس طرح بسر ہوگی

☆

چشم نم جاں شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں

☆

آج بازار میں پا بجولاں چلو
دشت افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

فیض احمد فیض کے بارے میں ناقدین کی رائے:

آل احمد سرور: ''فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس قزح جلوہ گر ہے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی'' فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی سنجیدگی' شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔''

مجروح سلطان پوری''فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے میر تقی میر تھے۔'' ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فیض کی شاعری دکھی اور استحصال زدہ طبقے کی آواز بن گئی۔ برصغیر کے علاوہ بیرون ملک بھی فیض کے افکار کو بیحد پذیرائی ملی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ فیض نے کلاسیکی شعری روایات کو رومانی اور مزاحمتی تحریک سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ایک نغمگی اور عام فہم شعری آہنگ عطا کیا

ڈاکٹر وقار احمد رضوی:''ترقی پسند شعراء میں فیض کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فیض کا شعری سرمایہ اگرچہ کم ہے مگر اس کمیت میں وزن ہے۔ قلیل کلام کے باوجود جو شہرت فیض کو ملی وہ کسی

اور اردو شاعر کو نہیں ملی۔ فیض اس دور کے سب سے مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔''

فیض کا انداز سخن ایک نیا رنگ و آہنگ لیے ہوئے ہے وہ رومانیت میں ڈوبا لہجہ ہے وہ ہمیشہ سحر کا انتظار کرتے ہیں اور اس کے لیے سعی و جہدِ مسلسل کے قائل ہیں وہ منزل کی راہ کے پتھروں سے خوفزدہ نہیں ہوئے اپنے دل کو افسردگی سے بچا کر اور دلِ بے تاب کو تسلی دیتے ہیں ترقی پسند تحریک اور اشتراکی فکر کے تحت وہ مایوس نہیں ہیں بلکہ ان کو ہمیشہ جبر کی رات کے ختم ہونے کا یقین کامل رہتا ہے فیض بھی اپنے شدید عاشقانہ جذبات سے کھیلتے ہیں۔ وہ سیاسی' سماجی اور نفسیاتی مسائل سے نبرد آزما ہے مگر ایک امید کے ساتھ اور اس میں ان کی چشم بصیرت کا بڑا دخل نظر آتا ہے۔ فیض کی اپنی طبیعت کا ٹھہراؤ اور دھیما پن ان کا سرمایہ حیات ہیں جس کے سبب ان کے کلام میں جاذبیت' رومانیت اور موسیقیت کا ایک منفرد انداز ہے۔

فیض کی شاعری میں محبوب کا عکس جمال ایک اچھوتے انداز میں ہے ان کا عشق کوئے یار سے شروع ہو کر سوئے دار تک پا بجولاں رقصاں ہے:

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

☆

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

☆

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں صبا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

☆

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

فیض کی شاعری میں موج سخن' نئے جزیرے آباد ہیں انہوں نے اپنے شعری تجربات سے اپنی نگارشات میں نئی معنویت پیدا کی ہے فیض کے ہاں تراکیب میں روایتی لہجہ مگر جدا انداز سے جلوہ گر ہے۔ ان کے کلام میں ذہنی تصورات اور عشقیہ تمثیلات کے تخلیقی عمل کو نیا آہنگ بخشتا ہے۔ ذیل میں فیض کے چند اشعار:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کردے
نہ گل کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مئے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزاری ہے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
ساری دنیا سے دور ہوجائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی
ہم تیری آرزو بھی کھو بیٹھے
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں

☆

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

☆

اٹھ کر آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

☆

جانتا ہے کہ وہ نہیں آئیں گے
پھر بھی مصروف انتظار ہے دل

☆

غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

فیض احمد فیض کو ان کی ادبی خدمات پر ''لوٹس انعام برائے ادب'' (۱۹۷۶ء) میں لینن امن انعام (۱۹۶۲ء) میں۔نشانِ امتیاز (۱۹۹۰ء) اور نگار ایوارڈ (۱۹۵۳ء) عطا کیا گیا۔آپ کے ادبی سرمایہ میں نقش فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، شام شہر یاراں، متاع لوح و قلم، سروادی سینا، مرے دل مرے مسافر، کلیات نسخہ ہائے وفا شامل ہیں جبکہ مضامین کا مجموعہ ''میزان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔فیض احمد فیض نے غزل کو نیا لہجہ عطا کیا اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے

☆...... احمد فراز (۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء تا ۲۵ اگست ۲۰۰۸ء)

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

اور

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے

جیسی معرکۃ الآرا غزلیات کے خالق سید احمد شاہ علی (احمد فراز) کوہاٹ میں ۱۳ جنوری ۱۹۳۱ء کو آغا برن کوہاٹی کے گھر میں پیدا ہوئے آپ کے والد بھی اردو کے مشہور شاعر تھے۔احمد فراز کی شاعری بھی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر رہی مگر جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا احمد فراز نے احتجاج کے ساتھ رومان کو اپنی شاعری میں مشق سخن بنایا۔فراز نے بھی کلاسیکی اندازِ غزل کو

نئے عہد کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔روشن خیالی ترقی پسندیت کے شانہ بشانہ فراز نے کلاسیکی غزلیہ آہنگ کو جدید خطوط پر گامزن کیا۔تغزل، نغمگی وغنائیت سے بھر پور غزلوں میں جہد مسلسل، جبر و استبداد، استحصال، مجرم، قاتل، مسیحا جیسے موضوعات کو نئے آہنگ سے روشناس کرایا:

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

☆

چلو کہ بادہ گساروں کو سنگسار کریں
چلو کہ ٹھہرا ہے کارِ ثواب خوں پینا

☆

اب وہ پہلے سے بلا نوش و سیہ مست کہاں
اب تو ساقی سے یہ کہتے ہیں قدح خوار کہ بس

☆

محفلِ جاناں ہو، مقتل ہو کہ مے خانہ فراز
جس جگہ جائیں بنا لیتے ہیں ہم اپنی جگہ

احمد فراز کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے علاوہ پڑوسی ملک ہندستان کے علاوہ دیگر ملکوں کی مختلف زبانوں کے ادب نواز حلقوں میں بھی اسی طرح مقبول ہیں جس طرح اردو میں، ڈاکٹر نجابت رضوی کے مطابق ''احمد فراز ایران اور ہندوستانی جمالیات کے امتزاجی الہام کے نغمہ گر ہیں۔اس کے علاوہ وہ حالاتِ حاضرہ پر بھی خوب نشتر چبھوتے ہیں۔''

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کہیں بنام وطن
خدا کا نام جہاں لوگ بیچتے ہیں فراز
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

ڈاکٹر محمد احمد دانش کے مطابق ''احمد فراز کے یہاں جمالیاتی حسن کے ساتھ ساتھ انقلابی آہنگ بھی تھا۔مشرق و مغرب کی دنیا کے علاوہ ہر علاقہ میں ان کے مداح اور ان کی شاعری کے شائقین موجود ہیں احمد فراز کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جو بہت آسانی سے زبان زد ہو جاتے ہیں۔ترقی پسند شعراء اور رومانیت پسند شعراء کا جب بھی تذکرہ آئے گا اردو ادب میں فیض احمد فیض اور احمد فراز کا نام بھی ممتاز اور صفِ اوّل کے شعراء میں ضرور آئے گا۔''

ڈاکٹر محمد علی صدیقی احمد فراز کی شاعری کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''فراز اب کوچۂ محبوب اور کوچۂ قاتل میں فرق کرنے لگے ہیں۔فراز شروع شروع میں مخملی لہجے کے رومانی شاعر ہوا کرتے تھے لیکن گذشتہ چند برسوں میں ان کی شاعری کا لہجہ حد درجہ سیاسی ہو چلا ہے لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ان کا سیاسی لہجہ بھی سرتاپا ادبی ہے اور یہی وہ وصف ہے جو فراز کو اس عہد کا ایک اہم شاعر بناتا ہے۔فراز نے اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ شاعری کی اول اور آخر پہچان وہ سچائی ہے جو بے مزہ زندگی سے بھی بے مزہ نہیں ہونے دیتی۔''

احمد فراز کے ادبی اعزازات میں ذیل کے ایوارڈ شامل ہیں:

آدم جی ایوارڈ، اباسین ایوارڈ، فراق گورکھپوری ایوارڈ (انڈیا) اکیڈمی آف لٹریچر ایوارڈ (کنیڈا)، ٹاٹا ایوارڈ، جمشید نگر (انڈیا) اکادمی ادبیات پاکستان کا کمال فن ایوارڈ نیز ادب (شاعری) نمایاں کارکردگی پر ہلال امتیاز (احمد فراز نے شوکت عزیز، جنرل پرویز مشرف دور حکومت میں حکومتی کی پالیسیوں سے ناخوش ہو کر ہلال امتیاز واپس کر دیا تھا اور ستارہ امتیاز بھی۔

احمد فراز کی تصانیف میں تنہا تنہا، دردآشوب، نایافت، جاناں جاناں، شب خون، مرے خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، پس انداز موسم، خوابِ گل پریشاں ہے، سب آوازیں میری ہیں (منظوم تراجم) غزل بہانہ کروں، کلام کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (انتخاب و تلخیص) اے عشق جنوں پیشہ، کلیات احمد فراز شہرِ سخن آراستہ کے نام سے شائع ہوئی۔

فیض کی شاعری کا شہرہ بین الاقوامی سطح کا ہے۔فراز کی کئی ایک نظمیں دنیا بھر میں مقبول ہو چکی ہیں۔ان کا شعر سفر سنہرے جذبات کی روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔فراز کی شخصیت عمدہ

لباس، مسکراتی آنکھیں، پراعتماد لہجہ، ان کی شعری جمالیات میں جھلکتا ہے۔فراز کی شاعری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی شعری کاوشوں کی مقبولیت دیکھ لی۔

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

☆

پھر نعرۂ مستانہ فراز آؤ لگائیں
اہل رسن و دار بڑی دیر سے چپ ہیں

احمد فراز کی شاعری حقیقت نگاری، بیساختگی، شگفتگی، سادگی اور پرکاری سے مزین ہے۔
فراز نے نئی نسل اور خاص طور پر نوجوانوں اور نوجوان لڑکیوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی
فراز نے کسی کی تقلید نہیں کی، ان کا اپنا اسلوب ہے اور توانا ہے
احمد فراز کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو زبان زد عام ہیں

ہم بھرے شہر میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

☆

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

☆

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ نہ دھڑکن نہ صدا
غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا ہوا برا ہونا

☆

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے
شمع کی لو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرھانے میرے
قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کے رونے کے بہانے مانگے
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
اب جانے کہاں نصیب لے جائے
گھر سے تو فراز چل پڑے ہیں

☆

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی
منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

جدید لہجے کا مقبول شاعر احمد فراز ۲۶ گست ۲۰۰۸ء کو اپنے پرستاروں کو سوگوار چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئے

اگر تمہاری انا ہی کا ہے سوال تو پھر
چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے

☆...... احمد ندیم قاسمی (۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء تا ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء)

علامہ اقبال کے ہم سبق اور کپاس کا پھول جیسے افسانوں کے خالق احمد ندیم قاسمی کا تعلق دنیا میں مشہور شاہینوں کے شہر سرگودھا سے ہے۔ احمد ندیم قاسمی ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں رنگہ

تحصیل خوشاب میں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو پیر غلام نبی کے گھر پیدا ہوئے جبکہ ان کے ہم سبق علامہ اقبال کے حوالے سے مشہور شہر سیالکوٹ ہے آپ کا نام احمد شاہ جبکہ ندیم تخلص تھا۔ اپنے پردادا محمد قاسم کے حوالے سے قاسمی کہلاتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی ایک مشہور ترقی پسند شاعر، افسانہ نگار، صحافی، ایڈیٹر اور معتبر کالم نگار تھے۔ قاسمی کی ابتدائی عمر مشکلات کا شکار رہی مگر اپنے عزم و استقلال پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ احمد ندیم قاسمی نے تقریباً ہر ایک صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر غزل اور افسانہ نگاری ان کی پہچان ہے۔ تہذیب نسواں اور پھول کی ادارت سنبھالی۔ ادبی رسالہ جات 'ادب لطیف' سویرا اور نقوش کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ روزنامہ امروز، جنگ، حریت، میں کالم نگاری کی جبکہ پاکستان ریڈیو پر بحیثیت اسکرپٹ رائٹر بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۳ء میں ادبی رسالہ فنون کا اجراء کیا جس نے اپنا ایک معیار قائم کیا۔ فنون قاسمی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہا۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنی ادبی کاوشوں کا آغاز ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا بعد میں شعری ذوق نکھر کر سامنے آیا افسانوں کے حوالے سے امتیاز علی تاج آپ کو پنجاب کا پریم چند کہتے تھے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں جلال و جمال، شعلۂ گل، لوحِ خاک، محیط، دوام، دشت وفا، رم جھم شامل ہیں جبکہ افسانوں کے سولہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تنقید، تحقیق، تعلیم وادب پر تقریباً آٹھ کتابیں شائع ہوئیں۔

حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی و علمی خدمات کے صلے میں تمغہ برائے حسن کارکردگی، نشان امتیاز، جبکہ اکادمی ادبیات پاکستان نے کمال فن ایوارڈ سے نوازا۔ آپ کا شمار اردو ادب کے عہد ساز شخصیات میں ہوتا ہے۔

فراق گورکھپوری کی رائے: ''ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائلِ زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ ان کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بڑھ کر اہم چیز زندگی کی شکستیں گھرے اور پرخلوص سوچ کے عناصر میں مل کر حل ہو گئے ہیں۔''

احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر جو اُن کی شناخت ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

دیگر اشعار میں:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات ہے کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

☆

رزق کی خاطر زمیں کھو دی مگر پتھر ملے
اور ادھر پتھر میں کیڑے کو غذا ملتی رہی

☆

یہ روزِ حشر ہے لیکن مرے حساب سے قبل
مجھے خدا کی عنایات کا حساب ملے

اردو کے مشہور شاعر گلزار (ہندوستان) نے اپنے ادبی ''بابا'' کے انتقال پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے نظم لکھی جس کا عنوان ''بابا'' تھا:

حواس کا جہان ساتھ لے گیا
وہ سارے بادباں ساتھ لے گیا
بتائیں کیا وہ آفتاب تھا کوئی
گیا تو آسمان ساتھ لے گیا
تمام داستان ساتھ لے گیا
میں سجدے سے اٹھا تو کوئی بھی نہ تھا
وہ پاؤں کے نشان ساتھ لے گیا

ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے: ''ندیم کی شاعری کا سماجی حصہ اپنی جگہ احترام کے لائق ہے

مگر میں جب ندیم کو ایک بلند پایہ شاعر کہتا ہوں تو اس کے سماجی حصے کی وجہ سے نہیں (ہر چند کہ آخری فیصلے میں اس بھی کچھ حصہ ہوگا) بلکہ اس وجہ سے کہ ندیم کے کام میں خود ندیم بھی موجود ہے۔ اس کا دل (اس کا اپنا دل) ابھی یہ انداز خاص دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس طرح سے کہ ندیم تصویریں بھی اچھی بناتا ہے اور پھر اس وجہ سے بھی کہ اس کی تصویریں ایسے نغموں سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتی ہیں جو قاری کے تخیل میں تحریک پیدا کر دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے میں ندیم کو جلیل القدر شاعر مانتا ہوں۔''

جمیل الدین عالی کی رائے: ''موجودہ پاکستانی ادبی دنیا میں آخری بڑے آدمی تھے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے ''اردو ادب ایک تناور درخت سے محروم ہوگیا'' اردو افسانے کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی اردو شاعری کی جدید غزل کے بلند پایہ شاعر ہیں انہوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ پنجاب کے دیہاتی حسن میں جمالیاتی عنصر کے متلاشی ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں غلامی، مظلومیت اور ذلت کو احسن انداز میں پیش کیا ہے آپ کی زندگی آپ کی شاعری میں جو اسلوب اجاگر ہوا ہے وہ ہے خدمتِ آدم، احمد ندیم قاسمی کے یہاں حسن وعشق کی باتیں بڑی عام فہم اور آسان پیرائے میں بیان کی گئی ہیں ان میں تازگی بھی ہے اور شعری نکھار بھی۔ وہ روایت پسند اور جدید رنگ سخن کے غزل گو ہیں ان کے داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے جس سے شعری لطافت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے جو قاسمی کا انفرادی حسن بیان اور تازہ کاری ہے۔

نمونۂ کلام:

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پر اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

☆

انداز ہو بہ ہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

☆

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

☆

اپنا نعرہ بھی اناالحق ہے مگر فرق یہ ہے
ہم وہی بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں

☆

خدا کے کام جو آئے ' خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

☆

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
میرے ہم راہ دریا جا رہا ہے

☆

کچھ کھیل نہیں عشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے

☆

وہ کتنی سادگی سے اپنی جاں گنوا بیٹھے
مکان گرنے کے ڈر سے چھتوں پہ جا بیٹھے

احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری انسان کی نس نس کو چھو کر گذرتی ہے وہ مزدور کسان کی بات کرتے ہیں تو حسن وعشق میں بہ اندازِ دگر ہجر وفراق کی باتیں کرتے ہیں۔ اختر شماری بھی کرتے ہیں اور صبحِ نو کی امید بھی رکھتے ہیں۔ جو بات کرتے ہیں وہ ایسے سادہ انداز سے کرتے ہیں اور یہی ایک تخلیق کار کی پہچان ہے کہ اس کا کلام اس کی کاوش لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ پاکستان کا یہ ادبی روشن مینار اور حقیقت کی ترجمانی کا شاعر ادیب'

مصنف' محقق ۱۰ جولائی ۲۰۰۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

☆...... قتیل شفائی (۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۱۱ جولائی ۲۰۰۱ء)

قتیل شفائی کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے ان کی وجہ شہرت نغمہ نگاری بنی۔ قتیل ترقی پسند خیالات کے مالک ہونے کے باوجود اشتراکیت سے دور رہے۔ ان کے افکار میں انسان دوستی' وسائل کی برابر تقسیم امن اور استحصال جیسے مضامین شامل ہیں۔

قتیل شفائی کے فکری' وفنی سفر کے بارے میں فارغ بخاری لکھتے ہیں ''قتیل شفائی کو میں روایتی شاعری کا روایت شکن' اس لیے سمجھتا ہوں کہ اس نے کلاسیکل رنگ میں غزل اور نظم کہنے کے باوجود کچھ ایسے غیر محسوس طور پر ردیف شکنی کا ارتکاب کیا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی' دوسرے لفظوں میں اس نے قلم چلایا لاٹھی نہیں چلائی۔ تجربہ کیا ہے دھما کہ نہیں کیا۔''

حامد کاشمیری کے مطابق'' تاہم یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے شخصی درد وسوز کے ساتھ اپنے موضوعات کو برتا ہے اور ان موضوعات کی اوپری سطح کو چیر کر تہہ میں ان کے عالمگیر انسانی جذبے کی موجِ رواں کا خوشگوار احساس ہوتا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جو قتیل شفائی کو اپنے وقت سے منسوب کرتے ہوئے آئندہ کا شاعر بناتی ہے۔''

قتیل شفائی کا فلمی دنیا سے گہرا یارانہ رہا۔ فلم سازی کی جانب بھی گئے مگر اصل شہرت نغمہ نگاری سے ملی۔ قتیل شفائی نے ۲۰۱ فلموں میں ایک محتاط اندازے کے مطابق نوسو (۹۰۰) سے زائد گیت تحریر کیے۔ قتیل شفائی کا لہجہ ہر دلعزیز اور مقبول عام ہے۔ قتیل شفائی کے مشہور گیت:

بانٹ رہا تھا جب خدا سارے جہاں کی نعمتیں
اپنے خدا سے مانگ لی میں نے تیری وفا صنم

☆

اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بیقرار کیوں

☆

حسن کو چاند جوانی کو غزل کہتے ہیں
اُن کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

قدرت اللہ شہاب نے قتیل کے لیے لکھا کہ ''قتیل شفائی غزل اور گیت کے بڑے شاعر ہیں۔غزل میں ان کا انداز فنی روایات کے حامل ہونے کے باوجود ایک خاص انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔'' قتیل کے چند اشعار

تمام شہر میں کیا ایک بھی نہیں منصور؟
کہیں گے کیا رسن و دار آؤ سچ بولیں

☆

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیل
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

☆

بھولا نہیں میں آج بھی آدابِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

☆

دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

☆

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

☆

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

منی بیگم نے درج ذیل غزل کو اپنی سدا بہار آواز میں گا کر موسیقی کی دنیا میں امر کر دیا

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

قتیل شفائی کے گیتوں، غزلوں کا چینی، روسی، انگریزی، ہندی اور گجراتی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔اس طرح سے آپ ایک قومی اور عالمگیر شاعر اور ادیب ہیں جن کا تذکرہ اردو شاعری میں سدا یادر ہے گا۔قتیل شفائی ۱۱ جولائی ۲۰۰۱ء کو لاہور میں اپنے چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر ابدی نیند سو گئے

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ شام رکھ دیا

☆...... حسن حمیدی (۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء تا ۲۶ اپریل ۱۹۸۸ء)

حسن حمیدی کا شمار حقیقی جدوجہد کرنے والے ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے ان کی پوری زندگی سامراجیت، جبر و تشدد، استحصال اور مزدوروں کے حقوق کی جدوجہد میں گزری۔آپ کے والد محترم حمید عظیم آبادی برصغیر کے عظیم اردو/ فارسی شاعر شاد عظیم آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی پیدائش شاعری کے ماحول میں ہوئی۔پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں شریک رہے۔کئی بار پابند سلاسل ہوئے۔فالج کی صورت میں بھی حکومت وقت نے انہیں ان کی مزاحمتی و باغیانہ شاعری کی وجہ سے قید رکھا۔صہبا لکھنوی نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے'' وہ انسانی عظمت کے علم بردار ہیں اور آزادیٔ اظہار اور جمہوریت اور انصاف کو سب کے لیے مقدم سمجھتے ہیں انہوں نے جبر و استحصال کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی ہے اور زندگی کے تضادات کو پوری قوت سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔وادیٔ مہران جن صاحبانِ فکر نظر اور جیالے شاعروں پر فخر کر سکتی ہے ان میں حسن حمیدی سر فہرست ہیں۔

ذیل کے اشعار میں ان کا رنگ شاعری ملاحظہ ہو

لب پہ جب کیف کوئی آتا ہے
خوف کے دشت میں کھو جاتا ہے

اب نہ سودا ہے نہ سودائی ہے
صرف کہنے کی یہ رُسوائی ہے

حسن حمیدی کی سندھ سے محبت کا ایک انداز ملاحظہ ہو

یہ سندھ کی پاک سرزمیں ہے یہاں سے سورج نکل رہا ہے
یہاں پہ انساں ہر اک توہم کی آج تکذیب کر رہا ہے
یہ ماروی کا چمن ہے اس کے خمیر میں الفتِ وطن ہے
یہ ہوشیوں کا طرح کدہ ہے یہ سرفروشوں کی انجمن ہے

راقم الحروف نے حسن حمیدی کی شخصیت پر ایم فل اردو کا مقالہ ''حسن حمیدی، احوال وآثار، بحوالہ ترقی پسند تحریک'' تحریر کر کے ایم فل کی سند ۲۰۱۹ء میں حاصل کی۔

☆...... پروفیسر سحر انصاری (۲۷ دسمبر ۱۹۴۱ء)

ترقی پسند فکر سے مالا مال سحر انصاری کا شمار عصرِ حاضر کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ شہزاد منظر کے مطابق ''قیام پاکستان کے بعد منظر عام پر آنے والے ترقی پسند ناقدین میں سب سے ذہین ناقد سحر انصاری ہیں۔'' سحر انصاری اپنی شاعری میں ترقی پسند میلانات رکھتے ہیں۔ وہ حالات اور مصائب کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں سامعین اسے خود پر بیتا ہوا واقعہ سمجھتے ہیں جیسا کہ:

عجیب ہوتے ہیں آدابِ رخصتِ محفل
کہ اٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی
جسے گذار گئے ہم بڑے ہُنر کے ساتھ
وہ زندگی تھی ہماری ہنر نہ تھا کوئی

اور خود اپنے بارے میں:
فصیل شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

پروفیسر سحر انصاری کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ بھی رہے اور اپنی فہم و فراست اور علمی قابلیت کی بدولت شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید نگاری میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں آپ کا شمار اکابرین اردو میں ہوتا ہے۔

حکومت پاکستان نے آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۱۵ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا۔ سحر انصاری حقیقی قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کے حامی ہیں۔ سحر انصاری کا رجحان نعت نگاری کی جانب بھی ان کی عقیدت کا مظہر ہے:

کسی نے اس سے پہلے معجزہ ایسا نہیں دیکھا
کہ شق ہونے کی خواہش خود مہِ کامل میں آجائے
محفل ہو کہ دربار، سدا رشک کریں گے
اے غارِ حرا کیا تجھے تنہائی ملی ہے

☆...... مسلم شمیم (۳ جنوری ۱۹۳۹ء)

مسلم شمیم کا تعلق عظیم آباد، پٹنہ، بہار (ہندوستان) سے ہے۔ ہجرت کے بعد لاڑکانہ، سکھر اور اب کراچی میں مقیم ہیں آپ لاڑکانہ سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ اسے اپنی جنم بھومی کا درجہ دیتے ہیں۔ ترقی پسند دانشوروں میں شمار ہوتا ہے۔ تادم تحریر ۱۴ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں شعری مجموعے، مضامین اور تجزیہ نگاری شامل ہے۔ غزل ان کا محبوب موضوع ہے نظم بھی خوب مہارت سے کہتے ہیں:

جنت بدر ہوا، کبھی مصلوب میں ہوا
ایسے کئی مقام میری داستاں میں ہیں

☆

سب اہل بزم مرے حسن شعر تک پہنچے
مگر نہ کوئی دلِ سوگوار تک پہنچا

☆

کیفیتِ شکستِ دلِ زار کچھ تو کہو
سوئی ہے آج انجمنِ یار کچھ تو کہو

☆

فضا اداس، ہوئی ہے کبھی تو خود اس نے
دیارِ دل کے در و بام کو صدا دی ہے

☆

عظیم بات ہے زنداں میں زہرِ غم پینا
عظیم تر ہے صلیبوں کی چھاؤں میں رہنا

آپ کا شمار محبت کے سفیروں اور امن کے داعیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں آدرش، امکان۔

☆......☆

اردو غزل۔ جدید دور

جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا رومانویت، ترقی پسندیت، اپنا سفر طے کرتے ہوئے نئے عہد کے نئے تقاضوں میں بٹتی چلی گئی۔ ترقی پسند شاعری میں بے جا نعرے، گروپ بندی اور لادینی عزائم کے پرچار کی وجہ سے ادبا و شعراء نے اس مزاحمتی اور انقلابی شاعری سے اکتا کر اظہار رائے اور جذبات کے اظہار کو ایک نیا رنگ دیا جسے تاریخ کی پرکار نے جدید غزل کا نام دیا۔ یہ ایک اور غزل کا بدلتا ہوا زاویہ ثابت ہوا۔ یہ عہد ۱۹۶۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جدیدیت کا مفہوم مغربی فلسفے کے ماڈرنزم سے ماخوذ ہے۔ اس جدید شاعری کی اساس حالات و احساسات کے ساتھ شاعر کے اپنے ذاتی مشاہدے، مزاج، اور تجربات پر ہے۔ یہی ایک بدلتا ہوا زاویہ تھا جس نے غزل کے مضامین کی وسعت میں اضافہ کیا۔ جدید غزل میں احساسات و جذبات انقلابی اثر رومانی حقیقت اور ترقی پسند یا روشن خیالی کے زیر اثر رہنے کی بجائے نئی راہیں متعین کرنے لگے یہ درست ہے کہ الطاف حسین حالی کی عرق ریزی کے بعد غزل کا ایک نیا رنگ نظر آیا جسے جدید انداز میں حسرت موہانی، اصغر، جگر نے خوب رونق بخشی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اسے ''جدید تر'' کا عنوان دیا۔

بشیر بدر کا کہنا ہے کہ'' جدید غزل وہی ہے جس میں آج کے انسان کے احساسات ہوں۔'' راقم کی ذاتی رائے کے مطابق عصرِ رواں یا متقدمین اور متاخرین کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن کو ہم یکساں طور پر کلاسیکی، روایتی، رومانوی، ترقی پسند، روشن خیالی و مزاحمتی انداز اور جدیدیت و مابعد جدیدیت کے زمرے میں لے سکتے ہیں اور اس کا فیصلہ ناقد بھی نہیں کر پایا کہ کس شاعر کے کلام کو کون سے پیمانے سے ناپا جائے کہ اس کی خصوصیت یا عہد متعین کیا

جا سکے ہاں اپنی اپنی بساط کے مطابق ناقدینِ سخن نے درجہ بندی کی ہے جسے ادبی دنیا نے تقلید کرتے ہوئے قبول کرلیا ہے ذیل کے اشعار میں مندرجہ بالا رنگِ سخن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے:

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

(ولی ۲۶۶۷ء تا ۱۷۵۷ء)

جب سے دل گیا تب سے میر
چیز رکھتے ہیں بھول جاتے ہیں

(میر تقی میر ۱۷۲۳ء تا ۱۸۱۰ء)

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

(انشاء ۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۷ء)

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

(غالب ۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۲ء)

اردو شاعری ہمیشہ سے ہی اپنے اردگرد کے ماحول اور اس میں ہونے والی تبدیلی سے متاثر ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔عصرِ حاضر میں جہاں ابلاغ عامہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ دنیا میں کسی بھی حصے میں ہونے والے واقعہ کی خبر سیکنڈوں میں پہنچ جاتی ہے ایسے حالات میں ادباء و شعراء اپنے خیالات، مشاہدات، جذبات اور محسوسات کو ان حالات سے ہم آہنگ یا متاثر ہونے سے بچا نہیں سکتے اور پھر وہی پیش آنے والے واقعات ہماری ادبی تخلیقات کا حصہ

بن جاتے ہیں اور خصوصاً شاعری میں۔ کیونکہ ناول افسانہ یا تاریخ ایک عمل سے منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ذیل میں ۱۹۶ء سے اردو شاعری میں نیا زاویہ یعنی جدید غزل کے منتخب اور اہم شعراء کے کلام اور خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے۔اس دور کے اہم شعراء میں ناصر کاظمی کا نام اہمیت کا حامل ہے کہ ناصر کاظمی کے عہد سے جدید غزل کی ابتدا کے لیے خط فاصل کھینچا گیا ہے۔

☆...... ناصر کاظمی (۸ دسمبر ۱۹۲۵ء تا ۲ مارچ ۱۹۷۲ء)

ناصر کاظمی کا شمار جدید غزل کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ناقدین ادب انہیں میر جدید کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ان کی شاعری انسانی لطیف جذبات کی بہترین عکاس ہے۔دل و دماغ کی قید سے آزاد ناصر کاظمی کی شاعری رومانوی لفظیات اور محبت بھرے حسیاتی ماحول سے مزین ہے چھوٹی بحروں میں بڑا مفہوم یا مضمون بیان کرنا ان کا اپنا انفرادی فن ہے۔ وہ کسی تحریک میں شامل نہ رہے ان کا اپنا انفرادی رنگ ہے

تو جو اتنا اداس ہے ناصر
تجھے کیا ہوگیا بتا تو سہی

ناصر کاظمی میر تقی میر سے بہت متاثر تھے لیکن وہ ایک امید اور روشنی کی تلاش میں زندہ رہے۔مایوسیوں کے ساتھ ساتھ وہ امید کی کرن کے متلاشی رہے۔

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

☆

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے

شاعری کے بارے میں ناصر کاظمی کا موقف ''شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے۔وقت جو مر گیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا شاعر زندہ کرسکتا ہے۔شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں

بلکہ خیالات وافکار کو اچھوتے اور دلکش انداز سے شعر کا روپ دینے کا نام شاعری ہے۔‘‘

ساز ِ ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

ناصر کاظمی کے افکار میں تحریک پاکستان‘ قیام پاکستان کے دوران پیش آنے والے واقعات کا گہرا اثر محسوس ہوتا ہے‘ انسانوں کی ہجرت کے ساتھ ساتھ رشتوں کے بچھڑ جانے کا غم اور سلگتی یادوں کا تذکرہ شامل ہے۔

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

☆

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

☆

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

☆

میں سو رہا تھا کسی کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

☆

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

☆

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گذرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

ناصر کاظمی کے ابتدائی دور میں ترقی پسند ادب کا چرچا تھا لیکن ناصر کاظمی نے ترقی پسند ادب کا اثر قبول ہیں کیا ان دنوں میں ناصر کاظمی کی تخلیقات کو پسند کرنے والوں میں ایک بڑی تعداد ترقی پسندوں کی تھی۔ ناصر کاظمی کے شعری اثاثے میں برگِ نے‘ دیوان‘ پہلی بارش‘ سر کی چھایا‘ نشاط خواب شامل ہیں آپ نے ایک بھرپور زندگی گزاری شاعر ہونے کے ساتھ ایک صحافی‘ مدیر بھی تھے جبکہ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری دھیمے سروں میں رچی بسی تغزل کی شاعری ہے۔ اس بات کو کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ناصر کاظمی اپنے عہد کے نمائندہ غزل گو شاعر ہیں جسے تاریخ اردو ادب ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ناصر کاظمی ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اردو شاعری کا یہ انمول شاعر خود اپنی شاعری کے بارے میں ذیل کا شعر کہتے ہوئے رخصت ہو گیا اور ایک فکر چھوڑ گیا:

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

☆...... ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (۹ اگست ۱۹۲۷ء تا یکم جون ۱۹۷۸ء)

خلیل الرحمٰن اعظمی ۹ اگست ۱۹۲۷ء کو سراٹ میر ضلع اعظم گڑھ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ خلیل ایک وسیع النظر شاعر تھے۔ شروع میں رجحان ترقی پسندیت کی طرف تھا جو بعد ازاں کلاسیکیت اور روایت کی جانب مائل ہوا۔ خلیل ایک سیلف میڈ شاعر اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ آپ کی علمی و تحقیقی کاوش ترقی پسند تحریک پر پی ایچ ڈی ہے‘ خلیل کی زندگی کا سفر ایک عزم اور سلیقے کا سفر ہے ان کی شاعری میں ترقی پسندیت کے اثرات ملتے ہیں کلاسیکی اعتبار سے آپ میر کے پیروکار ہیں۔ ترقی پسند شاعر اور نقاد ہوتے ہوئے بھی خلیل کی وجہ شہرت جدید غزل ہے۔ وہ اردو شاعری میں داخلیت کے عنصر کو بطور اضطراب زندہ کرنے والے شاعر کے

طور پر مانے جاتے ہیں۔ان کی ابتدائی شاعری گو کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تھی مگر ان کی شاعری میں روایتی اور کلاسیکی انداز ہی ان کا خاصہ ہے رنگ ملاحظہ ہو:

شراب ڈھلتی ہے شیشے میں پھول کھلتے ہیں
چلے بھی آؤ کہ اب دونوں وقت ملتے ہیں

☆

میرا لہو بھی پی کے نہ دنیا جواں ہوئی
قیمت مرے جنوں کی مرا سر نہ ہوسکی

☆

وہ آ گئے ہیں تو اب چھوڑو اس فسانے کو
کہاں کہاں میں پھرا' کس طرح خراب ہوا

☆

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

ممتاز نقاد عبدالمغنی لکھتے ہیں کہ ''اردو شاعری میں جدیدیت کا زور بڑھنے سے پہلے ہی اعظمی نے اپنے کلام میں خود شکستگی کے اس احساس کا اظہار کیا جو بعد میں جدیدیت پسند شعراء کا ایک معیاری نشان بن کر ابھرا۔اس طرح خلیل اعظمی کو اردو شاعری میں جدیدیت کا ایک قریبی پیش رو بھی کہا جا سکتا ہے۔

اپنے افکار کے ذریعے خلیل اعظمی نے غزل کو نیا لہجہ دیا اور شعری وفکری اعتبار سے نئی راہیں متعین کیں خلیل نے مخصوص استعاروں سے غزل کو نئی راہ پر گامزن کیا اور غزل میں جمالیاتی آہنگ کو مقدم رکھا ایک اور رنگ ملاحظہ کیجیے

جل جل کر ہم خاک ہوئے تب جا کے نگاہیں ٹھہری ہیں
ہائے وہ جسم نازک جس میں آئینے کی صفائی ہے

خوار ہوئے بدنام ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے

خلیل کی غزلوں میں سر بلندی اور سنجیدگی نمایاں نظر آتی ہے ان کی شاعری خالصتاً رومانیت کا عکس نہیں ہے انہوں نے حالات حاضرہ' وقت کے تقاضوں اور معاشی وسماجی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنی غزل کو سنوارا ہے:

شبِ گزشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے

......

دنیا عجب جگہ ہے کہیں دل بہل نہ جائے
تجھ سے بھی دور آج تری آرزو گئی

آپ کے شعری اثاثے میں آئینہ خانے اور فکر وفن شامل ہیں۔خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی تحقیقی' تخلیقی اور شعری نگارشات سے کھیلتے ہوئے یکم جون ۱۹۷۸ء کو علی گڑھ میں وفات پا گئے۔

خلیل کی ایک غزل:

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن مری دہلیز پر اُتار مجھے
اُبلتی دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زر نگار مجھے
کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آ کے سنگسار مجھے
وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گذرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

☆...... ظفر اقبال (۲۷ستمبر۱۹۳۲ء)

میاں ظفر اقبال ۲۷ستمبر۱۹۳۲ء کو بہاولنگر میں پیدا ہوئے آپ کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔آپ شاعری اور نثر نگاری دونوں پر یکساں گرفت رکھتے ہیں۔ابتدائی تعلیم کے بعد ایف سی کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔گریجویشن کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔اوکاڑہ میں شعبہ وکالت میں خدمات انجام دیں صحافت کے میدان میں بھی نمایاں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ایک بار اوکاڑہ ایسوسی ایشن اور دو مرتبہ پریس کلب اوکاڑہ کے صدر بھی رہے ہیں آپ کا شمار عصرِ حاضر میں مستند جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے آپ کے کالم متعدد اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں اردو شاعری پر گہری نظر رکھتے ہیں کتب ورسائل پر تبصرہ کرتے وقت صرف معیار پر نظر رکھتے ہیں انتقادیات کے حوالے سے آپ کا نام ایک معتبر نام ہے۔بعض ادبی حلقے آپ کو سفاک نقاد کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں آپ جو بات کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک وخوف کہہ ڈالتے ہیں۔ذیل میں دو اشعار آپ کی شعری سفر کے آئینہ دار ہیں۔

قصوروار نہیں پھر بھی چھپتا پھرتا ہوں
وہ میرا چور ہے اور سامنے سے گذرے گا

☆

یوں ہے کہ کہیں نام و نشاں تک نہیں تیرا
اور تجھ سے بھری رہتی ہے تنہائی ہماری

ظفر اقبال کا شمار پاک وہند میں جدید غزل گو شعراء میں کیا جاتا ہے آپ نے اپنے اندازِ فکر سے غزل کے موضوعات میں نت نئے تجربات کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میرا کوئی استاد ہے نہ میرا شاگرد......وہ کہتے ہیں میں نے اپنی مرضی سے شاعری کی ہے اور کر رہا ہوں مجھے کسی نقاد کی پروا نہیں۔

پڑھنے بیٹھوں تو ابھر آتی ہے ہر صفحے پر
بات کرتی ہوئی ہنستی ہوئی تصویر کوئی

آپ کے اثاثہ جات میں آبِ رواں، اطراف، عیب وہنر، گلافتاب، رطب ویابس، سر عام، نوادر، تفاوت، غبار آلود سمتوں کا سراغ، تجاوز، تساہل، اب تک (کلیات) اور وہم وگمان شامل ہیں۔حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری سادہ، عام فہم ہے کوئی فارسی یا ثقیل الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں وہ مشکل سے مشکل مضمون کو انتہائی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے:

اس کو آنا تھا کہ وہ مجھ کو بلاتا تھا کہیں
رات بھر بارش تھی اس کا رات پھر پیغام تھا
یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

ظفر اقبال کے لیے شمیم حنفی کی رائے ’’روایت میں اتنی دور جانے اور اس سے فیض اٹھانے کے باوجود ہمارے عہد کے کسی دوسرے غزل گو نے روایت کی فرسودگی پر اتنی ضرب کاری نہیں لگائی جتنی کہ ظفر اقبال نے۔‘‘

عصرِ رواں میں ظفر اقبال کی شاعری نو آموز اور کہنہ مشق دونوں ہی کے لیے مشعلِ راہ ہے۔اپنے اخباری کالم دال دلیا میں بھی مطلع پیش فرماتے ہیں تو کبھی مقطع سپرد قلم کر دیتے ہیں اور آپ کے پرستار پوری غزل کی تلاش میں اخبارات ورسائل چھانتے رہتے ہیں۔اگر کسی کو غزل مل گئی تو خوش قسمتی ورنہ مجموعہ کلام یا کلیات میں۔

ظفر اقبال کے چند نمائندہ اشعار جو جدید غزل کا سرمایہ ہیں۔

غریبِ شہر ہوں، سڑکوں پہ ہے سفر میرا
ہوا کی طرح کوئی گھاٹ ہے نہ گھر میرا

☆

بس ایک بار کسی نے گلے لگایا تھا
پھر اس کے بعد نہ میں تھا نہ میرا سایا تھا

☆

باہر گلی میں چلتے ہوئے لوگ تھم گئے
تنہائیوں کا شور تھا خالی مکان میں

☆

جھوٹ بولا ہے ظفؔر تو اس پہ قائم بھی رہو
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

ظفر اقبال نے جدید غزل کے دور میں جو تجربات کیے ہیں وہ روایت‘ کلاسیکیت‘ کی روح سے متصادم نہیں ہیں۔ ان کے اسلوب میں جدّت مضامین تازگی اور روانی کا سمندر موجزن ہے۔

☆...... شہزاد احمد (۱۶اپریل۱۹۳۲ء تا یکم اگست۲۰۱۲ء)

شہزاد احمد نام بھی ہے اور تخلص بھی۔ آپ۱۲اپریل۱۹۳۲ء کو امرتسر (مشرقی پنجاب) میں ڈاکٹر حافظ بشیر کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ادیب ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ سلسلہ درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ کیپٹل انڈسٹریز آرٹس کونسل لاہور اور پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی منسلک رہے اور ایک متحرک زندگی گزاری۔ مجلس ترقی ادب کے صدر بھی رہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ۱۹۹۷ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ ۱۹۴۹ء میں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جبکہ ہجرہ (اقبال) ایوارڈ بھی آپ کے حصے میں آیا۔ شہزاد احمد ایک سچی اور کھری غزل کے شاعر تھے۔ ان کا انداز بیان سادہ اور سلیس ہے۔ امجد اسلام امجد لکھتے ہیں کہ ”جدید شعرا میں جن شعراء کے ہاں غیر معمولی تمثیل کاری نظر آتی ہے ان میں شہزاد احمد کا نام نمایاں ہے۔ اس نے کیفیات کو سمعی وبصری روپ میں

کچھ ایسی مہارت سے پیش کیا ہے کہ بعض اوقات شعرا اپنی تفہیم سے محض تمثال کے حسن کی وجہ سے قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔“

جیسا کہ ذیل کے اشعار میں نمایاں ہے:

شب ڈھل گئی اور شہر میں سورج نکل آیا
میں اپنے چراغوں کو بجھاتا نہیں پھر بھی

☆

شبِ غربت کی ہوا تیز بہت ہے شہزاد
اب کہیں آنکھ کے اندر ہی دیا رکھنا

شہزاد احمد کی شاعری میں حسن ومحبت کے مضامین تو ہیں ہی مگر انہوں نے جدید غزل کو جدید انداز سے اپنایا ہے کہ انہیں محبت کی نفسیات کے ماہر غزل گو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ شہزاد کی طبع آزمائی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کوئی منصوبہ بندی کے شاعر نہیں بلکہ بیساختگی کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم اور پیشہ ورانہ بصیرت کو بروئے کار لایا ہے ان کے وسیع تجرباتی اور علمی پس منظر کی پرکاریاں ان کے شعری اثاثے میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ وہ اپنی غزل میں کسی فرد کی بات نہیں کرتے بلکہ اجتماعی طور پر معاشرے کا تذکرہ کرتے ہیں۔

شہزاد احمد غزل کے ساتھ نظم میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ ان کی نظم میں بھی غزل کا حسن ہے جو نظم کی ہیئت کو متاثر نہیں کرتا۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے مطابق ”شہزاد احمد ان جدید غزل گو شعراء میں ہیں جنہوں نے زندگی کے نئے تقاضوں کو اپنا کر انہیں اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔“

شہزاد احمد کے ادبی اثاثے میں صرف‘ جلتی بجھتی آنکھیں‘ ادھ کھلا دریچہ‘ خالی آسمان‘ مذہب تہذیب‘ موت‘ تخلیقی رویّے۔ آپ کی شاعری کی کلیات ”دیوار پر دستک“ کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ شہزاد احمد کے منتخب اشعار

گھبرا کے آسماں کی طرف دیکھتے تھے لوگ
جیسے خدا زمیں پر موجود ہی نہ تھا

☆

تلاش کرتے ہوئے انگلیاں جلا ڈالیں
وہ تیرگی تھی کہ میں شمع بھی نہ دیکھ سکا

☆

کس لیے جاگتے کس لیے بھاگتے
اتنے بڑے شہر میں کوئی ہمارا نہ تھا

☆

یار ہوتے تو مجھے منہ پہ برا کہہ دیتے
بزم میں میرا گلہ سب نے کیا میرے بعد

☆

میں اکیلا ہوں یہاں میرے سوا کوئی نہیں
چل رہا ہوں اور میرا نقش پا کوئی نہیں

☆

دور سے دیکھ کے میں نے اسے پہچان لیا
اس نے اتنا بھی نہیں مجھ سے کہا ' کیسے ہو

☆

جو دل میں کھٹکتی ہے کبھی کہہ بھی سکو گے
یا عمر بھر ایسے ہی پریشان پھرو گے

محولہ بالا اشعار میں ایک بے چینی ٗ ایک اضطراب کا عنصر ہے جو شہزاد احمد کی طبیعت کی سوچ ہے ان کے اشعار میں یہ اضطراب سماج کی نفسانفسی اور ہنگامہ خیزی سے عبارت ہے۔ وہ کوئی تک بندی کے شاعر نہیں تھے بلکہ صاحب فہم و ادراک تھے۔ وہ اپنی مرضی سے شعر نہیں کہتے تھے بلکہ وہ لمحہ وارد کے منتظر رہتے تھے۔ شہزاد احمد اسی سوچ کے تحت اپنے شعری وجدان کو

ہمارے درمیان چھوڑ کر یکم اگست ۲۰۱۲ء کو راہی عدم ہوئے:

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

☆...... شاذ تمکنت (۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء تا ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء)

شاذ تمکنت کا شمار اپنے عہد کے جدید غزل لکھنے والوں میں ہوتا ہے وہ حیدر آباد دکن کے نمائندہ شاعر تھے۔ ان کے کلام میں ان کا ذاتی دکھ درد بھی جھلکتا ہے گو کہ ان کے ہاں نیم کلاسیکیت اور نیم رومانیت کا عنصر نمایاں ہے مگر ان کے کلام میں جدّت کا رنگ اور نمایاں ہے وہ اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے حالات کو نہایت باریکی سے شعری قالب میں ڈھال لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو جدید اردو شاعری کی دھڑکن کہا گیا

کام آساں ہو تو دشوار بنالیتا ہوں
راہ چلتا ہوں تو دیوار بنالیتا ہوں

☆

ایک دنیا کی سنا کرتا ہوں چپ رہتا ہوں
تو منالے تو من جاؤں گا سچ کہتا ہوں

آپ کا نام سید مصلح الدین اور جائے پیدائش حیدر آباد دکن ہے۔ آپ نے تحقیق کے میدان میں مخدوم محی الدین پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر سید مصلح الدین کے مسند پر پہنچے۔ آپ کی نگارشات میں نیم خواب ٗ ورق انتخاب ٗ تراشیدہ اور بیاض شام شامل ہیں۔

آپ کے کلام میں دلکش تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے وہ اپنی شاعری میں اپنے اردگرد پیش آنے والے واقعات کو سمونے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غزل کی جدید روش کی آمیزش و احساسات ہیں۔ ایک رنگ ملاحظہ ہو

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا رہا
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

شاذ کی غزلوں میں رومان کا عنصر نئے اور دلکش انداز میں ملتا ہے قدرت کی صناعی سے ارمانوں اور خوابوں کی دنیا کی تمثیل نگاری سے غزل کو سنوارا ہے۔ اپنی ذاتی کیفیت کو بھی غزل کا حصہ بنایا ہے

صبح پھر ہوگی کوئی حادثہ یاد آئے گا
شام پھر آئے گی پھر شام سے گھبرائیں کیا

☆

یہ کون شخص ہے کیا نام ہے خدا جانے
اندھیری رات ہے کس کو پکارتا ہے کوئی

☆

کوئی آواز کہیں گونج کے رہ جاتی ہے
کوئی آنسو کسی عارض پہ ڈھلک جاتا ہے

شاذ تمکنت کی غزل پر مخدوم کے افکار کا اثر نظر آتا ہے اس طرح وہ مخدوم کی تقلید بہ انداز آرائش وسجاوٹ اور غزلوں میں سرخوشی سے کرتے ہیں۔ شاذ مکمل طور پر غزل کے شاعر نظر آتے ہیں احمد ندیم قاسمی شاذ کی شعری جہت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''شاذ کی غزل اور نظم نے آس پاس پھیلے ہوئے جدّت برائے جدّت کے پینتروں اور تجریدیت ونثریت کے سوانگوں پر بھرپور فتح حاصل کی ہے یہ فتح شاذ کی استقامت فن کی دلیل ہے اسے معلوم ہے کہ انسانی زندگی اور کائنات کے اسرار کھوجنا ہیں مگر ایک حسن کار کی حیثیت سے کھوجنا ہیں۔''

میں اہلِ انجمن کی خلوتِ دل کا مغنی ہوں
مجھے پہچان لے گی انجمن آہستہ آہستہ
دھواں دل سے اٹھے چہرے تک آئے نور ہو جائے
بڑی مشکل سے آتا ہے یہ فن آہستہ آہستہ

تمثیل نگاری اور حسن کی پیکر تراشی آپ کی غزل کا خاصہ ہے انداز انتہائی دلنشیں ہے:

پڑتی ہے سات رنگوں کی تیرے بدن پہ چھوٹ
جو رنگ تو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے

شاذ تمکنت کی ایک غزل:

رنگ اڑتا ہوا بکھرے ہوئے گیسو تیرے
ہائے وہ رات کے تھمتے نہ تھے آنسو تیرے
کیا خبر کون سی وادی میں ہے محمل تیرا
جانے کس دشت میں گم ہوگئے آہو تیرے
ساز اقرار سے بھی نغمۂ انکار کی گونج
آنکھ جھکتی رہی کھنچے رہے ابرو تیرے
کیا نیا پیکر تقدیسِ حیا صبحِ ازل
کن بہانوں سے تراشے گئے پہلو تیرے
ہم کہاں ڈھونڈنے جائیں تجھے اے تشنہ دہن
اب فقط نقشِ کفِ پا ہیں لب جو تیرے

حسن ورومانیت کے دھیمے لہجے کا یہ پیکر تراش ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء کو حیدرآباد دکن میں انتقال کر گیا اور اپنی شاعری وفکر اہلِ سخن کی غور وخوص کے لیے چھوڑ گیا۔

☆...... مخمور سعیدی (۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء تا ۲۰۱۰ء)

مخمور سعیدی کا تعلق ٹونک راجستھان سے تھا وہ ایک بنیادی وابتدائی طور پر رومان پرور شاعر تھے۔ آپ کا تعلق صحافت' کتابت اور ترجمہ نگاری سے رہا ہے مخمور سعیدی نے جدید غزل کی ابتدائی دور میں نمائندگی کی۔ ان کا کلام جہاں روایت سے متاثر نظر آتا ہے وہیں ان کی شاعری عصرِ دوراں کی تیز رفتار زندگی سے ہم آہنگ بھی ہے ان کی شاعری ان کی ذاتی زندگی کے تجربات سے بھرپور نظر آتی ہے:

ہر نئی رت میں ہم افسردہ و دلگیر رہے
ہاتھ گذرے ہوئے موسم کی جوانی آئی

☆

پرانے خواب پلکوں سے جھٹک دو سوچتے کیا ہو
مقدر خشک پتوں کا ہے شاخوں سے جدا ہو جانا

☆

جواب اس کے سوالوں کا دے کوئی کب تک
یہ زندگی تو مسلسل سوال کرتی ہے

☆

مدتوں بعد ہم کسی سے ملے
یوں لگا جیسے زندگی سے ملے

آپ کا نام سلطان محمد خان اور تخلص مخمور تھا۔ ایم اے اردو تھے۔ اردو اکادمی نئی دہلی میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز رہے سہ ماہی فکر و تحقیق میں مدیر بھی رہے آپ کی طبع آزمائی پر اقبال، اختر شیرانی اور جوش کی فکر کا اثر نظر آتا ہے آپ کے کلام میں غزل، رباعی، قطعات، گیت اور دوہے شامل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سب رنگ، سیاہ پر سفید، آواز کے جسم، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، گفتنی، دیوار ودر کے درمیان، راستا اور میں، گھر کہیں گم ہوگیا۔ شیرازہ، بانس کے جنگل سے گذرتی ہوا۔ تجدید جنوں۔ عمر گذشتہ کا حساب شامل ہیں آپ کی کاوش ''راستا اور میں'' کو ۲۰۰۷ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مخمور سعیدی کو قلم کا مزدور کہا گیا۔ انہوں نے دہلی میں ایک درجن سے زیادہ ادبی رسالوں کی ادارت کی مخمور سعیدی نے پاکستان، امریکہ، انگلستان، دبئی، شارجہ اور سعودی عرب میں عالمی مشاعروں میں شرکت کی مخمور سعیدی کو اپنے وطن کی مٹی سے گہرا عشق تھا وہ اپنے وطن کی مٹی کی محبت کے گیت لکھا کرتے تھے نقل مکانی، ہجرت اور سلسلۂ روزگار میں جو لوگ اپنا وطن چھوڑتے ہیں اس دکھ کا اظہار ان چار مصرعوں میں نمایاں ہے:

اپنی زمیں کو چھوڑ کے جانے والو اتنا دھیان میں رکھنا
آوازیں دیتی آئے گی پیچھے پیچھے یہاں کی مٹی

اس دھرتی پہ چلتے پھرتے آتے جاتے کتنے مسافر
کس کا سفر کب ختم ہو جائے پائے کون کہاں کی مٹی

مخمور کی غزلوں میں زیادہ تر ذاتی تجربہ اور حسن وعشق کی کیفیت شامل ہے۔

اتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہوگیا دیوار ودر کے درمیاں

☆

فسادی جاچکے اپنے گھروں کو
محافظ شہر کے چوکس کھڑے ہیں

☆

لوگ ملتے ہیں مگر مل کر بچھڑ جاتے ہیں
شہر بسنے نہیں پاتے کہ اجڑ جاتے ہیں

بلاشبہ مخمور سعیدی اپنے عہد کے معتبر اور منفرد شاعر تھے انہوں نے ترقی پسندیت کو اپنی شاعری اور ذاتی مشاہدات پر حاوی ہونے نہیں دیا ان کی شاعری میں روایت اور کلاسیکی لہجہ و مضامین شامل ہیں۔

مخمور سعیدی کا دوہا رنگ:

صاف بتادے جو تو نے دیکھا ہے دن رات
دنیا کے ڈر سے نہ رکھ دل میں دل کی بات

مخمور سعیدی اپنے دلی جذبات اور سچے احساسات کی عکاسی کرتے ہوئے ۲ مارچ ۲۰۱۰ کو اپنے پرستاروں کو سوگوار چھوڑ گئے۔

☆...... ڈاکٹر بشیر بدر (وفات ۱۹۳۵ء)

سید محمد بشیر بدر المتخلص بشیر بدر ۱۵ فروری کو یوپی کے شہر کانپور میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم علیگڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی آپ نے ''اردو غزل' کا تنقیدی مطالعہ'' مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی

کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر بشیر بدر کا شمار غزل کے ایسے جدید شعراء میں ہوتا ہے جن کی کسی مشاعرے میں شرکت کامیابی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ آپ جدید غزل کے مشہور شاعر ہیں۔ مشاعرے کے سامعین آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

بشیر بدر نے بڑی باریکی سے عصری مسائل کی نشاندہی کی ہے نرم وملائم جذبات کو بھی بہ احسن انداز سے اپنے اشعار میں سمویا ہے:

وہ دریا میں نہانا چاند کا
کہ چاندی جیسے گھل کر بہہ رہی ہو

مصروف اور مشینی زندگی جس کے گرداب میں پھنس کر انسان خود کو بھی بھلا بیٹھتا ہے مگر شبانہ روز محنت جیسے مضامین کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے:

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

☆

میں تمام دن کا تھکا ہوا، تو تمام شب کا جگا ہوا
ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پہ ترے ساتھ شام گزار لوں

پروفیسر قمر رئیس ڈاکٹر بشیر بدر کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''بشیر بدر جیسا شائستہ، منکسر المزاج اور مشرقی تہذیب کا پروردہ شخص جو بارہ پندرہ برس پہلے تک اپنی شاعری کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا اور اپنے تجربات کو اینٹی ہزل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا اچانک ایسی جارحانہ خودستائی پر کیوں اتر آیا؟ اس کا جواب گزشتہ پندرہ سال میں مشاعروں میں ان کی بے پناہ مقبولیت میں ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔''

بشیر بدر واقعی عہد حاضر کے مقبول شاعر ہیں۔ وہ سادہ سے سادہ موضوع کو بھی اس انداز

میں پیش کرتے ہیں کہ ایک حسین مجسم اور تراشیدہ پیکر سامنے آجاتا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار

تمہارے شہر کا موسم بہت سہانا لگے
میں ایک شام چرا لوں اگر برا نہ لگے
تم محبت کو کھیل کہتے ہو
ہم نے برباد زندگی کرلی
نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے
سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہوجائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہوجائے گا
میں خدا کا نام لے کر پی رہا ہوں دوستو
زہر بھی اس میں اگر ہوگا دوا ہوجائے گا

بشیر بدر کی شاعری میں انفرادیت کے ساتھ غنائیت ومترنم لہجہ سامعین کو ایک عرصے تک مسحور رکھے گا۔ آج کل علالت کی وجہ سے وہ کسی مشاعرے یا ادبی تقریب میں نہیں جاتے۔ آپ کی تصانیف میں اکائی، آسمان، امیج، آہٹ، اللہ حافظ، آمد، بیسویں صدی میں اردو غزل، کلیات بشیر بدر۔ حکومت ہندوستان نے آپ کو پدما شری ایوارڈ سے نوازا ہے جبکہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور سنگت ناٹک ایوارڈ بھی آپ کے حصے میں آیا ہے فی زمانہ آپ غزل کے میدان میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں کائناتِ غزل بشیر بدر کو اپنے ماتھے کا جھومر بنا کر رکھے گی۔ بشیر بدر کے چند اشعار

رات کا انتظار کون کرے...... آج کل دنیا میں کیا نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی...... یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں......کیا کریں، حوصلہ نہیں ہوتا

☆

مجھ سے بچھڑ کر خوش رہتے ہو......میری طرح جھوٹے تم بھی ہو

بشیر بدر نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات کو ذیل کے شعر میں خوب نظم کیا ہے

جو ہوا اڑا کے لے گئی وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا' کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

☆...... جوہر سعیدی (۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ تا فروری ۱۹۹۷ء)

سید محمد علی جوہر سعیدی ولد سید سلامت علی سلامت کا تعلق راجستھان کی ریاست ٹونک سے تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے ٹنڈو آدم (سندھ) میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں کراچی تشریف لے آئے۔ آپ کی شاعری میں کلاسیکیت وروایت کی چاشنی کے ساتھ جدید غزل کا لہجہ آپ کو معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔ آپ ایک ادب پرور اور ادب نواز شخصیت کے مالک تھے

شب پرستو درِ امکانِ سحر بند کرو
مجھ سے پہلے مرے خوابوں کو نظر بند کرو
اس سے بہتر جواب کیا ہوگا
کھو گیا وہ مرے سوالوں میں

یہی وہ لہجہ ہے جو' جوہر سعیدی کو خود اعتمادی بخشتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ٹنڈو آدم کراچی میں آپ کی عمر شعر وادب کی آبیاری میں گزری۔ آپ کے فرزند اختر سعیدی نامور صحافی اور معتبر شاعر ہیں۔ آپ کا ایک اہم کام احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ و تفسیر بھی ہے۔

شعری سفر میں آپ نے بسمل سعیدی سے اصلاح سخن لی۔ کراچی میں قیام پذیر ہونے کے بعد آپ نے اپنا ایک شعری حلقہ بنایا۔ کامیاب مشاعرے کیے اور کراچی کی فضاؤں میں آج بھی جوہر سعیدی کا نام زندہ ہے۔ یادگار کے طور پر بزم جوہر سعیدی قائم ہے۔ آپ کے

شعری اثاثہ جات میں بادسبک دست اور سفارت گل شامل ہیں۔

جوہر سعیدی کے چند نمائندہ اشعار:

اک مَے کدے کی شام تو لکھ دو ہمارے نام
ہم بچ بچا کے گردشِ دوراں سے آئے ہیں
کارواں در کارواں ہے بے حسی
رقص کر یاں رقص کر' ہاں رقص کر
برسوں کی انا لرز اٹھی ہے
یہ کس نے ادھر نگاہ کی ہے

ٹونک سے ہجرت کرنے کے بعد ٹنڈو آدم کی سرزمین میں شعری پودے کھلاتے ہوئے دبستان کراچی کو برگ بار کرنے کے بعد جوہر سعیدی ۲۰ فروری ۱۹۹۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کراچی میں مدفون ہیں۔

☆...... شہریار (۱۶ جون ۱۹۳۶ء تا ۱۳ فروری ۲۰۱۲ء)

شہریار کا نام ڈاکٹر کنور اخلاق محمد خان تھا آپ ہندوستان کے شہر انوالہ (بدایوں) کے ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی وجہ شہرت شاعری کے ساتھ ساتھ ایک ماہر تعلیم اور نغمہ نگار کی بھی تھی۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو کے سربراہ بھی رہے۔

ڈاکٹر کنور اخلاق محمد خان ''شہریار'' ہندوستان کی جدید فکر سے وابستہ رہے مگر انہوں نے کلاسیکیت سے بھی رشتہ جوڑے رکھا آپ کی شاعری کا مزاج دھیما پن' نرمی اور آہستگی ہے۔

آل احمد سرور کے مطابق ''شہریار اس دور کے ممتاز شاعروں میں سے ہیں جو اپنی غزلوں اور نظموں کو خواب آلود فضا' اپنے مخصوص لہجے اور اس میں معانی کی نت نئی پرتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔''

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زودِ پشیمان' پشیمان سا کیوں ہے

☆

سنتے ہیں سبھی غور سے آوازِ جرس کو
منزل کی طرف کوئی روانہ نہیں ہوتا

☆

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے
تیرے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے
یہ دیکھو آ گئی میرے زوال کی منزل
میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے

شہر یار دھیمے لہجے میں بہت مختصر بات کہتے تھے جو طویل پر شور آوازوں کے درمیان بھی اپنی انفرادیت اور شناخت رکھتی تھی۔ شہر یار نے اردو میں پی ایچ ڈی کیا اور حیدر آباد یونیورسٹی (ہندوستان) نے ان کی تعلیمی، علمی و ادبی تحقیق و تصنیف پر ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ غزل اور نظم کے شاعر تھے۔

شہر یار کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔ یہ بھارت کا اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ ہے جو اس سے پہلے فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، اور قرۃ العین حیدر کو عطا ہو چکا تھا جبکہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ، میرا اکیڈمی ایوارڈ، ساہتیہ منچ ایوارڈ، جالندھر ادبی سنگم ایوارڈ، شرف الدین یحییٰ منیری ایوارڈ، فراق سمّان اور اقبال سمّان سے نوازا گیا۔

شہر یار کی تصانیف میں اسم اعظم، ساتواں در، حاصل سیر جہاں، ہجر کے موسم، خواب کا در بند ہے، ن م راشد فن و شخصیت، کلیاتِ شہر یار۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے مطابق ''ان کی غزلوں میں جذبہ اور احساس کی شدت ہے۔ ان کی غزلوں میں نفسیات، حسن و عشق کی جلوہ گری ہے، فکر و احساس کا نیا عالم ہے ان کی غزل میں ٹوٹے ہوئے دل کی صدا اور روحانی کرب ہے'' یہ صدا اور روحانی کرب ذیل کے اشعار میں نمایاں ہے:

عجیب سایہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو
کون سی بات ہے جو اس میں نہیں
اس کو دیکھے مری نظر سے کوئی
ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے
جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے
کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

شہر یار نے ماضی کی اعلیٰ ادبی روایات کو تھامے رکھا اور اپنی انفرادیت قائم کرتے ہوئے غزل میں نیا آہنگ تخلیق کیا۔ اور آخر کار زلف و رخسار، چشم غزال، حسن کافرانہ، فکر و احساس کی جلترنگ میں محبت میں شکست، پسپائی، ناکامی، ذہنی کرب اور اپنے عزم و حوصلے سے نئی منزلیں اور نئی کامرانیوں سے غزل کو ہمکنار کرتے ہوئے ۱۴ فروری ۲۰۱۲ء کو علی گڑھ میں ان تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو گئے۔

☆...... ندا فاضلی (۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء تا ۸ فروری ۲۰۱۶ء)

پدما شری ایوارڈ حاصل کرنے والے جدید شاعر ندا فاضلی کا اصلی نام مقتدا حسین ہے آپ کا شمار مشہور نغمہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ فلمی مکالمہ نگاری کا بھی معتبر نام تھے ندا فاضلی کے کلام کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے جو بھی لکھا ہے، ڈوب کر لکھا ہے ان کے انداز میں سطحی شاعری نہیں ہے ان کے کلام میں پیکر تراشی اور ترکیب سازی نے جدید آہنگ پیدا کیا ہے۔

ان کی غزل کا مشہور شعر زبان زد عام ہے:

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھوجائے تو سونا ہے

☆

کچھ بھی بچا نہ کہنے کو ہر بات ہوگئی
آؤ کہیں شراب پئیں رات ہوگئی

☆

یوں تو قدم قدم پہ ہے دیوار سامنے
کوئی نہ ہو تو خود سے الجھ جانا چاہیے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی ندافاضلی کے بارے میں رائے: ''ندافاضلی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دیہی زندگی کی فراغت، معصومیت اور ایمانداری کو شہری زندگی کی کاروباریت، شاطری اور بے ایمانی سے متصادم ہوتے دیکھ کر اذیت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

ندافاضلی کے شعری سفر می بدلتے زاویے کے متعلق مظفر حنفی لکھتے ہیں کہ'' پہلے ندا کی غزلوں میں ایک قسم کی نسائیت کے ساتھ دیہاتی رس کا ذائقہ ملتا تھا اب ان کے یہاں ایک نوع کی صلابت، بردباری اور مشینی شہر کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں۔غزل وہ اب بھی ڈوب کر کہتے ہیں لیکن اس میں معصومیت اور محویت کی جگہ حزنیہ لااُبالی پن اور شاعرانہ تدبیر کی آمیزش سے ایک نیا ذائقہ پیدا ہوگیا ہے:

اب کسی سے بھی شکایت نہیں رہی
جانے کس کس سے گلہ تھا پہلے

ندافاضلی کی تصانیف میں لفظوں کا پل، کھویا ہوا سا کچھ، دیواروں کے باہر، دیواروں کے

بیچ (خودنوشت) شہر میرے ساتھ چل، مورناچ، ملاقاتیں شامل ہیں۔

ندافاضلی کو حکومت ہندوستان نے ۲۰۱۳ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۹۸ء میں ساہیتہ اکیڈمی ایوارڈ ۔۲۰۰۳ء اسٹا اسکرین ایوارڈ ۔۲۰۰۳ء ہی میں بالی ووڈ مووی ایوارڈ (بہترین فلمی نغمہ نگار)

ندافاضلی نے فلمی نغمہ نگاری کے علاوہ اپنے غزلوں میں نت نئے تجربات کیے جیسے معصوم بچوں کی حرکات وسکنات کا ذکر، گھر آنگن کی فضاؤں کا ذکر، جیسے کہ وہ خود کو اپنے بچپن اور گھرانے سے جوڑ رہے ہوں:

کہیں رک گئے راہ میں بے سبب کہیں وقت سے پہلے گھر آئی شب
ہوئے بند دروازے کھل کھل کے سب جہاں بھی گیا میں گیا دیر سے

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہیں ہم

ندا فاضلی کے والدین نے پاکستان ہجرت کی اور خود ندا ہندوستان میں رہ گئے اس حوالے سے انہوں نے ہجرت اور تنہائی کے کرب کو بڑے قریب سے دیکھا ہے یہ تنہائی کا کرب ندا کی زندگی کا حصہ ہے:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

بھیڑ سے کٹ کر بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اجڑ جاتے ہیں

اس کے دشمن ہیں بہت آدمی اچھا ہوگا
وہ بھی میری ہی طرح شہر میں اچھا ہوگا

ہجرت، ذات کے کرب، شخصی تنہائیوں سے نبرد آزما، فلمی گیت گنگناتا ہوا ندا فاضلی ۸ فروری ۲۰۱۶ کو ممبئی میں اپنے مداحوں کو سوگوار چھوڑ گیا

کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

☆...... ساقی فاروقی (۲۱دسمبر ۱۹۳۶ء تا ۱۹جنوری ۲۰۱۸ء)

آپ کا نام قاضی محمد شمشاد فاروقی تھا۔ آپ کا تعلق یوپی انڈیا کے شہر گورکھپور سے تھا آپ اپنے خاندان کے ہمراہ ۱۹۵۲ء میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں قیام پذیر ہوئے بعدازاں انگلستان منتقل ہو گئے جہاں آپ اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مصروف رہے۔ ساقی فاروقی کا لہجہ اپنے ہم عصروں سے مختلف تھا وہ افسردگی اور قنوطیت میں گم رہنے کی بجائے جوش اور ولولہ کے قائل تھے وہ کبھی بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے فراری نہیں تھے وہ ہمیشہ ایک نئی سوچ نئی امید کی تلاش میں رہتے تھے:

ایک چہرہ ہے کہ اب یاد نہیں آتا ہے
ایک لمحہ تھا وہی جان کا بیری نکلا

☆

ساقی فاروقی کے انداز میں نئی جہت نئے انداز کا دور دورہ ہے وہ منافقت سے نفرت کرتے تھے اور ہمیشہ حقیقت کی جستجو میں رہتے تھے۔

یہ کہہ کے ہمیں چھوڑ گئی روشنی اک روز
تم اپنے چراغوں کی حفاظت نہیں کرتے

☆

اے کاش ایسا کر سکیں آنکھوں کو زندہ کر سکیں
یہ کیا کہ دل میں گرد ہو آنکھوں میں آئینے نہ ہوں

نظیر صدیقی ساقی فاروقی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں ''جو لوگ جدید غزل کے نام پر خرافات گوئی کر رہے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ساقی فاروقی جیسے شاعروں کی غزلوں کو غور سے پڑھیں اور ان سے سیکھیں کہ غزل کے مزاج کو مجروح یا اس کے مطالبات کو

نظر انداز کیے بغیر جدید تجربات کو غزل کے سانچے میں کس طرح ڈھالا جا سکتا ہے۔''

ان کا ایک رنگ:

ساقی یادوں کی فصلوں سے جتنا جتنا خون بہے
میں رنگوں کی فصلیں کاٹ کے آج اپنے گھر لایا ہوں

ساقی فاروقی جدید غزل کے کارواں کے اہم رکن ہیں۔ ان کے دوریا ہمعصروں میں اردو زبان کے مشہور شعراء ناصر کاظمی، منیر نیازی، مشتاق احمد اور جمیل الدین عالی شامل ہیں۔

ساقی فاروقی کا ایک مشہو شعر

میں تیرے ظلم دکھاتا ہوں اپنا ماتم کرنے کے لیے
میری آنکھوں میں آنسو آئے تیری آنکھیں نم کرنے کے لیے

ساقی فاروقی کی تصانیف وشعری اثاثہ جات میں پیاس کا صحرا (نظم)' برام کی واپسی (شعری مجموعہ) رازوں سے بھرا بستہ' سرخ گلاب' بدرِ منیر' غزل ہے شرط' زندہ پانی' حاجی بھائی پانی والا' رات کے مسافر' راز دار' ہدایت نامہ شاعر' شامل ہیں۔

ساقی فاروقی کے منفرد اسلوب میں مشرقی روایات کی پاسداری اور مذہبی ماحول کے زیرسایہ تمام پابندیوں کے باوجود محبت کی باتیں شامل ہیں وہ اس ماحول میں اپنے محبوب سے مل نہیں سکتا محبت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اسے بدنامی اور سنگسار ہونے کا خوف رہتا ہے اس لیے ساقی نے ان جذبات کی ترجمانی یوں کی ہے:

وہ سخی ہے تو کسی روز منا کر لے جائے
اور مجھے وصل کے آداب سکھا کر لے جائے
ہجر میں جسم کے اسرار کہاں کھلتے ہیں
اب وہی سحر کرے پیار سے آ کر لے جائے

ساقی فاروقی انگلستان میں رہتے ہوئے بھی اپنی روایات سے جڑے رہے اور انہوں نے انسانی تاریخ کے تاریک رخ کو شاعرانہ کرامت سے بیان کیا ہے اور یہ کرامت ساقی فاروقی کے حصے میں آئی کیونکہ اسے منافقت سے نفرت تھی۔ وہ اپنی ذات میں سات سمندروں

کی گونج سنتا تھا:

میرے اندر سات سمندر شور مچاتے ہیں
ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

ساقی فاروقی لندن میں ۱۹ جنوری ۲۰۱۸ کو طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆...... افتخار عارف (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء)

جدید عہد میں زندگی گزارنے والے افتخار عارف نے اپنے مشاہدے کو برملا اپنے شعری سفر میں ساتھ رکھا۔ دنیائے ادب کے بدلتے ہوئے افکار کا بھرپور مطالعہ کیا اور ارد گرد بکھرے ہوئے جذبات، احساسات اور مشاہدات کو نئے انداز اور نئی معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے آپ کا شمار پاکستان کے اہم جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مطابق ''انہوں نے کلاسیکی روایت سے خوش سلیقگی سے روشنی لی ہے اور اسے غیر رسمی بے تکلف تازہ لہجہ سے پیوند کیا ہے۔ ان کی آواز میں نرمی، رس اور لوچ ہے۔ جو اودھی کی گھلاوٹ اور زمینی پن کی راہ سے آیا ہے۔ کہیں کہیں طویل بحروں میں ارکان کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ بعض جگہ آوازوں کو بڑھایا گھٹایا گیا ہے جس سے لہجہ ہندی آہنگ کی داخلی موسیقی سے قریب تر آ گیا ہے۔ انسان سے ان کا لگاؤ اور محرومیوں سے پیدا ہونے والا درد محبت احتجاجی لے میں اس طرح رچ بس گیا کہ ایک کیفیت سے کئی کیفیتیں پیدا ہوگئی۔'' ان کا رنگ سخن ملاحظہ ہو

خلق نے ایک منظر دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
وہ ہم نہیں تھے پھر کون تھا سرِ بازار
جو کہہ رہا کہ بکنا ہمیں گوارا نہیں
ہم اہل دل ہیں محبت کی نسبتوں کے امیں
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارہ نہیں
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

افتخار عارف کی شعری ادب کے علاوہ ایک شناخت بھی ہے اور وہ ہے عبید اللہ بیگ کے ساتھ کسوٹی کا پروگرام جو کہ پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش کیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں آپ نے پی ٹی وی چھوڑ کر بی سی سی آئی لندن سے وابستہ ہوگئے پاکستان میں ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات اور صدر نشیں مقتدرہ قومی زبان جبکہ چیئرمین اکادمی ادبیات کے عہدوں پر فائز رہے۔

افتخار عارف کی تصانیف میں ''مہر دو نیم''۔ ''حرفِ بار یاب''۔ ''بارہواں کھلاڑی''۔ ''اقلیم ہنر جہانِ معلوم''۔ ''شہرِ علم کے دروازے پر'' ہنوز یہ سفر جاری ہے۔

حکومت پاکستان نے آپ کی علمی و ادبی خدمات پر صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی' ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نوازا ہے جبکہ دیگر اعزازات میں آدم جی ایوارڈ' نقوش ایوارڈ' بابائے اردو ایوارڈ' علامہ اقبال ایوارڈ' عالمی اردو کانفرنس دہلی کی جانب سے فیض انٹرنیشنل ایوارڈ شامل ہیں۔ مشفق خواجہ نے آپ کی صلاحیتوں کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''وہ (افتخار عارف) ان جدید شاعروں میں سے ہیں جن سے شاعری کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔'' جبکہ اختر الایمان کے مطابق ''عصرِ جدید کے شاعروں میں جو نام بہت ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں افتخار عارف کا نام سرفہرست ہے۔''

افتخار عارف کے چند نمائندہ اشعار:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
تھکن تو اگلے سفر کے لیے بہانہ تھا
اسے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا تھا
وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب لگی جو شجر پرانا تھا
تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو
مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
جو ہاتھ اٹھے وہ سبھی ہاتھ تھے میرے
جو چاک ہوا ہے وہ گریباں بھی میرا ہے
وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی
آئے گی ضرور آئے گی صبح
یہ عہدِ ستم نہیں رہے گا

افتخار عارف کہتے ہیں کہ ’’وہ خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنی شرطوں پہ زندگی گزاری اور جو چاہا وہ کیا۔‘‘

☆...... پروین شاکر (۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء تا ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء)

سیدہ پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ آباء و اجداد کا وطن حسین آباد شیخوپورہ بہار تھا۔ جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ایم اے اور لسانیات میں ایم اے کرنے کے بعد عبداللہ گرلز کالج میں انگریزی کی لیکچرار کی حیثیت سے منسلک ہو گئیں۔ ۱۹۹۰ء میں ٹرنٹی کالج امریکہ اور ۱۹۹۱ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۸۱ء میں پاکستان کے اعلیٰ ترین مقابلے کے امتحان میں سی ایس ایس میں کامیابی کے بعد محکمہ کسٹمز اینڈ ایکسائز کے محکمے میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہیں۔ پروین شاکر کا شمار جدید اردو شاعرات میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی ادبی کمال حاصل کیا ان کا

کلام زبان زد عام ہوا۔ نسائی لب و لہجہ میں معاشرتی مسائل، جذبات و احساسات کی ترجمانی اس انداز میں کی کہ قارئین و سامعین کو اپنی آپ بیتی اور کہانی محسوس ہوئی۔ پروین شاکر کی شاعری کی پرکا حسن و عشق، محبت کے گرد گھومتی ہے

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کے ناچتا ہے

پروین شاکر کا زبان زد عام شعر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

☆

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

پروین شاکر کی شاعری میں فطرت کے نظارے، قدرتی حسن کا تذکرہ دل کو بھاتا ہے

تیز بارش ہو گھنا پیڑ ہو اک لڑکی ہو
ایسے منظر کبھی شہروں میں تو پائے نہ گئے

پروین شاکر کے کلام میں الہڑ دوشیزہ، نازک جذبات والی نوخیز جوانی کے احساسات و جذبات پائے جاتے ہیں۔ کامیاب ہو جائے تو خوش کن اور اگر نا کام تو درد کی کائنات۔ یہی وجہ ہے کہ پروین شاکر لڑکیوں اور خواتین میں یکساں مقبول ہیں۔ آج بھی کالج، یونیورسٹی اور عام طور پر ان کے کلام کو ترجیح حاصل رہتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس سے اک بار روٹھوں میں اس کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے

☆

دور رہ کر بھی صدا دیتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اس کی

☆

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

☆

میری خود داری برتنے والے
تیرا پندار بھی ٹوٹا کہ نہیں

☆

اس طرح میرے پاس سے گذرا
جیسے مجھ کو وہ جانتا بھی نہیں

نظیر صدیقی پروین شاکر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''لڑکی یا عورت کے محسوسات و معاملات جس حد تک جتنی خوبصورتی کے ساتھ اور جتنے دل کشا انداز میں پروین شاکر کی بدولت غزل میں آ گئے ہیں اتنے کسی اور شاعرہ کی بدولت کبھی نہیں آئے۔''

پروین شاکر کی شعری کاوشوں میں خوشبو' خود کلامی' انکار' صد برگ شامل ہیں نیز ماہ تمام کے نام سے کلیات بھی شائع ہو چکی ہے۔ پروین شاکر کی ازدواجی زندگی مدوجزر کا شکار رہی ان کی شادی اپنے ہی کزن ڈاکٹر نصیر سے ہوئی یہ رشتہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور آگے چل کر علیحدگی ہوگئی۔ حکومت پاکستان نے پروین شاکر کی شعری خدمات پر تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا جبکہ آپ کے مجموعہ کلام ''خوشبو'' کو آدم جی ایوارڈ بھی نصیب ہوا۔

رکھا ہے آندھیوں نے ہی ہم کو کشیدہ سر
ہم وہ چراغ ہیں جنہیں نسبت ہوا سے ہے

☆

121

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا

لطیف احساسات کی شاعرہ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اسلام آباد میں ایک ٹریفک حادثے میں جانبر نہ ہو سکیں۔

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

☆...... احمد صغیر صدیقی (۲۰ اگست ۱۹۲۸ء تا ۱۲ ستمبر ۲۰۱۷ء)

احمد صغیر صدیقی ۲۰ اگست ۱۹۲۸ء و بہرائچ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کی کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے زرعی ترقیاتی بینک میں ایک ممتاز عہدے پر فائز رہے دوران ملازمت ہی افسانے' کہانیاں' شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ آپ ایک اچھے افسانہ نگار' کہانی نویس' نقاد اور شاعر تھے آپ کی تصانیف میں 'کالی کہانیاں' دنیا کی بہترین کہانیاں (ترجمہ: چار مجموعے) بوجھو تو جانیں (منظوم پہیلیاں' بچوں کے لیے) گوشے اجالے (تنقید) اور اطراف۔ سمندری آنکھیں' کاسنی گلپوش دریچے' لمحوں کی گنتی (شعری مجموعے) شامل ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۲ ستمبر ۲۰۱۷ کو امریکہ میں ہوا۔ احمد صغیر صدیقی اپنی ذات میں ایک انجمن' دبستانِ علم و ادب اور دائرہ المعارف تھے آپ کا اپنا شعری رنگ و آہنگ ہے۔ وہ نہ کسی کے مقلد ہیں اور نہ ہی کسی گروہ بندی کا شکار رہے۔ نثری نگارشات میں وہ عالمی کہانیاں منتخب کیں جو کسی منصب پر فائز رہیں ان کا ترجمہ کیا اور بدیسی ادب کو اردو میں منتقل کیا جبکہ نقاد کی حیثیت سے ایک وسیع النظر انتقادیات کا ثبوت دیا۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

آسماں زاد زمینوں پہ کہیں ناچتے ہیں
ہم وہ پیکر ہیں سر عرشِ بریں ناچتے ہیں
اپنا یہ جسم تھرکتا ہے بس اپنی دُھن پر
ہم کبھی اور کسی دھن پہ نہیں ناچتے ہیں

احمد صغیر صدیقی کے چند اور اندازِ سخن جو ان کا منفرد انداز ہے:

اس دورِ کم نگاہ میں انصاف کی تلاش
صحرا میں جیسے سایہ اشجار ڈھونڈیے

اٹھا کے سب چراغ ہم نے راستوں پہ رکھ دیئے
بلا سے پھر ہمارے گھر میں روشنی نہیں رہی

لمحۂ ہجر لکھنے بیٹھا تھا
اک صدی لکھ رہا ہوں کاغذ پر

اک جسم ہیں کہ سر سے جدا ہونے والے ہیں
ہم بھی زباں سے اپنی ادا ہونے والے ہیں

احمد صغیر صدیقی کا تحقیقی وجدان ہمیں صحت مندانہ تنقید کا درس دیتا ہے اور ان کا شعری اثاثہ اپنی جدّت طرازی سے دلوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔

☆...... حمایت علی شاعر (۱۴جولائی ۱۹۲۶ تا ۱۶جولائی ۲۰۱۹)

حمایت علی المتخلص شاعر ۱۴جولائی ۱۹۲۶ء کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد بمبئی چلے گئے بعد ازاں پاکستان تشریف لے آئے۔۱۹۶۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے ساتھ ساتھ سچل سرمست آرٹس کالج سے بطور جز وقتی لیکچرر منسلک رہے۔حمایت علی شاعر نے کافی اصناف میں طبع آزمائی کی۔انہوں نے اردو شاعری میں ایک نیا تجربہ ''ثلاثی'' کے نام سے کیا۔ثلاثی بعد میں بہت مقبول ہوئی حمایت علی شاعر نے فلمی نغمات بھی تحریر کیے جبکہ آپ کی تصانیف میں ''آگ میں پھول' شکستِ آرزو' مٹی کا قرض' تشنگی کا سفر' حرف حرف روشنی' دودِ چراغِ محفل' عقیدت کا سفر' آئینہ در آئینہ' ہارون کی آواز' تجھ کو معلوم نہیں (فلمی نغمات) کھلتے کنول سے لوگ' محبتوں کے سفر (پانچ سو سالہ سندھی شعراء کا اردو کلام) شامل ہیں۔آپ کی شعری و ادبی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے ۲۰۰۲ء میں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا جبکہ دیگر اعزازات میں نگار ایوارڈ

122

رائٹر گلڈ ایوارڈ' عثمانیہ گولڈ میڈل (بہادر یار جنگ ادبی کلب) کی جانب سے شامل ہیں۔

حمایت علی شاعر کے بیٹے ڈاکٹر اوج کمال ادبی دنیا میں بہت فعال شخصیت ہیں حمایت علی شاعر ۱۶ جولائی ۲۰۱۹ء کو ٹورنٹو کینیڈا میں انتقال کر گئے۔حمایت علی شاعر ایک زود گو شاعر تھے۔ان کا ذہن ہر وقت مائل بہ شعر گوئی رہتا تھا۔آپ کی کلیات میں غزل' نظم' فلمی نغمات' بھجن' قوالیاں' لوریاں' شادی بیاہ کے گیت' مزاحیہ منظومات شامل ہیں ذیل میں چند اشعار:

جو کچھ بھی گذرنا ہے مرے دل پہ گذر جائے
اترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

☆

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

☆

یہ شہرِ رفیقاں ہے دل ذرا سنبھل کے
ملتے ہیں یہاں لوگ بہت روپ بدل کے

☆

نہ جانے یہ شبِ غم صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

☆

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو! میرِ کارواں یارو!

☆...... جاذب قریشی (۱۳اگست ۱۹۴۰ء)

آپ کا نام محمد صابر اور تخلص جاذب ہے' آپ کولکتہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ابتدائی عمر لکھنؤ میں گزری قیام پاکستان کے بعد لاہور منتقل ہو گئے بعد ازاں کراچی آ گئے۔۱۹۶۷ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے کیا پھر سلسلہ تدریس سے منسلک ہو گئے۔شاکر دہلوی سے اصلاح سخن

لی شعر گوئی کے ساتھ ساتھ جاذب کو تنقید سے گہری دلچسپی ہے۔ جاذب قریشی نے اورنٹیل کالج لاہور میں بھی تعلیم حاصل کی۔ حبیب جالب آپ کے ہم جماعت تھے۔ جامعہ کراچی کے ہم جماعتوں میں اقبال حیدر اور سلمیٰ رضا شامل ہیں۔ جاذب نے فلم سازی کی بھی کوشش کی اور ایک فلم ''پتھر کے صنم'' بنائی وہ مکمل نا کام رہی اور جاذب کو بہت خسارہ ہوا۔ جاذب قریشی ایک شاعر' فلسفی' نقاد اور کالم نگار بھی ہیں۔ آپ ادب دوست اور ادب نواز ہیں۔ منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہیں عصرِ حاضر میں جاذب قریشی ڈاکٹر شاداب احسانی' منظر ایوبی ادبی نشستوں کی صدارت فرماتے ہیں۔ جاذب قریشی کی تصانیف کی تعداد خاصی زیادہ ہے جن میں سے چند اہم یہ ہیں۔ تخلیقی آواز' آنکھ اور چراغ' شاعری اور تہذیب' دوسرے کنارے تک' میری تحریریں' میں نے یہ جانا' پہچان' نیند کا ریشم' شیشے کا درخت' آشوب جاں' اجلی آوازیں' شکستہ عکس' شناسائی' جھرنے' عقیدتیں' مجھے یاد ہے' نعت کے جدید رنگ' میری شاعری اور پہلی اڑان۔

پروفیسر سحر انصاری کے مطابق جاذب قریشی نئی شعری فضا کے شاعر ہیں انہوں نے نوجوان نسل کو شعر و ادب کی جانب راغب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جاذب قریشی کے نمائندہ اشعار:

میں نے آزاد کیے تھے جو پرندے جاذب
شام آئی تو وہی شور مچانے آئے

جیسے سورج سے بڑھ کر جانتا ہوں
وہ میرے شہر کا زخمی بدن ہے

وہ مجھ سے ابھی مل کر گیا ہے
ذرا اس شخص کو آواز دینا

کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دعائیں
تم اپنی شکستہ در و دیوار تو دیکھو

دعا مانگی تھی کس نے بارشوں کی
کہ دریا آ ملا میرے مکاں سے

پرندے کیوں پلٹ کر آئیں جاذب
شجر جب کٹ گئے انگنائیوں سے

میری تہذیب کا باشندہ نہیں ہے وہ شخص
جو درختوں سے پرندوں کو اڑا دیتا ہے

وہ جو تھا شورِ سگاں یار گیا
اپنی آواز بچالی میں نے

☆

جسم و جاں چھین رہا ہ جو شخص
دوستی بھی اسی سفّاک سے ہے

جاذب قریشی کی نعت کا ایک شعر

دہلیزِ مصطفیٰؐ کی طلب میں چلا ہوں میں
میں نے بجھا دیے ہیں چراغ اپنے نام کے

جاذب قریشی ۲۱ جون ۲۰۲۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

☆...... سلیم کوثر (۲۴/اکتوبر۱۹۴۷ء)

آپ کا نام محمد سلیم جبکہ قلمی نام سلیم کوثر ہے۔ آپ پاکستان کے مشہور شعرا میں سے ایک ہیں آپ کی پیدائش پانی پت کرنال' ہندوستان کی ہے۔ پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد آپ کا خاندان ہجرت کر کے خانیوال (پنجاب) میں رہائش پذیر ہوا بعد ازاں کبیر والا اور کراچی منتقل ہو گئے اخبارات اور پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے آپ کی مشہور غزل ''میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے'' زبان زد عام رہی۔ آپ کا صحافتی سفر روز نامہ اعلان' آغاز' ہفتہ روزہ اقدام' رازداں اور نئی آواز کا ہے جبکہ تصانیف میں ''محبت اک

شجر ہے (۱۹۹۶ء)' خالی ہاتھوں میں ارض وسما (۱۹۸۵ء)' یہ چراغ ہے تو جلا رہے (۱۹۸۷ء)' ذرا موسم بدلنے دو (۱۹۹۱ء)' دنیا مری آرزو سے کم ہے (۲۰۰۷ء) جبکہ کلیات 'جنہیں راستے میں خبر ہوئی' (۲۰۱۷ء) اور نعتیہ مجموعہ 'میں نے اسمِ محمد ﷺ کو لکھا بہت ہے' اشاعت پذیر ہوا۔ سلیم کوثر نے صنفِ نظم میں کمال حاصل کیا۔

صابر ظفر نے سلیم کوثر کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''سلیم کوثر کی شاعری کسی نظریاتی تحریک کی تابع ہے نہ کسی سیاسی منشور کے زیر اثر۔ اس کے موضوعات ذات اور کائنات کے حوالے سے جنم لیتے ہیں اس کے ہاں محبت کے جذبے نے عجیب شدت اختیار کر رکھی ہے وہ جسے چاہتا ہے ٹوٹ کر چاہتا ہے بظاہر یہ شدت اظہار وقتی یا عارضی ہو سکتی ہے لیکن بباطن وہ اپنے احساسات وجذبات میں بے پناہ سچا اور کھرا ہے۔ یہی سچائی اور کھرا پن اس کی شاعری کا خاصا ہے۔ اسے اپنی لکھت بنت اور اظہار پر یکساں قدرت حاصل ہے اس کا یہی وصف اسے دیگر ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

سلیم کوثر کی غزلیات میں انسانیت سے پیار ہے وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں' زخمی احساسات' صادق جذبوں کی ترجمانی کو مقدم رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سلیم کوثر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم خود کو ایک ایسے جہان میں محسوس کرتے ہیں جہاں نفسا نفسی' خود غرضی اور ناکامیوں سے دوری محسوس ہوتی ہے اور ہر ایک اور خود کو اپنے حصے کی شمع جلانے کی تلقین کرتے ہیں آپ کے کلام میں جاذبیت' سادگی' روانی' خلوص دل اور دردمندی کا جوہر موجزن ہے حکومت پاکستان کے آپ کی ادبی خدمات پر ۲۰۱۴ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا کراچی میں بسنے والے شعراء اور شاعری کے پرستار سلیم کوثر سے احسن انداز میں واقف ہیں مگر ٹیکسلا کے رہنے والے صاحب اسلوب شاعر رانا سعید دوشی جب کراچی تشریف لائے تو مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا اور اس خدمت کی وجہ سے مجھے بھی رانا سعید دوشی کے ہمراہ سلیم کوثر سے تفصیلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ طبیعت ناساز ہونے کے باوجود سلیم کوثر میر محفل رہے۔ رانا سعید اور سلیم کوثر کی محبت کا اندازہ ہوا۔ ملاقات کے بعد رخصت کا وقت آیا تو دونوں

اصحاب آبدیدہ تھے۔ گھر سے باہر نکل کر رانا سعید دوشی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ زار و قطار رونے لگے۔ کافی دیر تک ساون کی جھڑی لگی رہی جب طبیعت کو قرار ہوا تو ہم وہاں سے سیدھے کراچی ائیر پورٹ روانہ ہوئے۔ سلیم کوثر کی شخصیت ہمارے عہد کا ایک بھرپور ادبی وشعری اثاثہ ہے۔ سلیم کوثر کا توانا لہجہ اسے مدتوں شعری سفر میں یاد رکھے گا۔

سلیم کوثر کے چند منتخب اشعار

اب یہ موسم مری پہچان طلب کرتے ہیں
میں جب آیا تھا تو تازہ ہوا لایا تھا

وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پہ آبیٹھا ہے

رویا تھا ایک یاد کی شدت سے میں کبھی
آنکھوں میں آنسوؤں کی ابھی تک نمی سی ہے

در و دیوار سکتے میں ہیں اب تک
یہاں جو کچھ ہوا لوگوں سے پوچھو

اور اب کبھی مجھے فرصت ملی تو آؤں گا
کہ تو نے دیر لگا دی مجھے پکارنے میں

کیا یہ بھی رسم رقابت ہے کہ جس میں
تم ملتے ہو مجھ سے تو زمانہ نہیں ملتا

اسے بلا دو وہ جو میرا یار پرانا تھا
اس سے باتیں کرنی تھی' کچھ یاد دلانا تھا

قہقہے سنگ ملامت کی طرح برسے ہیں
ہم تری بزم سے اٹھے بڑے اعزاز کے ساتھ

تو نے اک مجھ کو پکارا تھا سر راہ گزر
رک گیا سارا زمانہ تری آواز کے ساتھ

ملاتو آنکھ میں چاہت کا اک زمانہ تھا
وہ شخص جس سے تعارف بھی غائبانہ تھا
تصویروں کا روگ بھی آخر کیسا ہوتا ہے
تنہائی میں بات کروتو بولنے لگتی ہیں
میں سچا مرے لفظ بھی سچے مجھ کو ڈر بھی کیا ہے سلیم
اوپر ایک خدا رہتا ہے، نیچے ماں کا سایا ہے
اب تو ساون میں بھی بارود برستا ہے یہاں
اب وہ موسم نہیں بارش میں نہانے والے
سلیم اتنی شناسائی بھی غنیمت ہے
گلی کے لوگ مرا گھر تو بتا دیتے ہیں

سلیم کوثر کہتے ہیں کہ وقت بیت جاتا ہے بات یاد رہتی ہے۔ یہ صدی ہماری صدی ہے اس کے آخر میں ایسے کام کر جائیں جو ہمیں بھی آئندہ نیک نام کر جائیں۔ میرے خیال میں سلیم کوثر نے اس صدی میں اپنے حصے کا کام کر دیا ہے جو سلیم کوثر کو آئندہ صدیوں میں بھی یاد رکھے گا۔

☆...... خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی (۳ ستمبر ۱۹۳۹......۲۹ جولائی ۲۰۲۱)

محسن علی خان ولد امجد حسین خان ۳/ستمبر ۱۹۳۹ء کو ملیح آباد ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک وسیع النظر اور وسیع المطالعہ شاعر، ادیب، نقاد ہیں۔ آپ کی تعلیمات ایم اے اردو، ادبیات، ایم اے فارسی ادبیات، ایم اے تاریخ، ایم اے اسلامیت فاضل علوم شرقیہ اور بی ایڈ شامل ہیں آپ کا شعبہ درس وتدریس تھا آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں مگر اپنی بساط کے مطابق نوجوان شعراء کی تربیت کر رہے ہیں نیز عصرِ حاضر کے ادباء شعراء کو مشورہ سخن سے نوازتے رہتے ہیں۔ ادبی دنیا میں خیام العصر کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں وجدان، بسیط، جوہر اندیشہ، حرف آغاز، ماسوا، میرا پیغام، میرا کلام۔ دانش وبینش

(رباعیات)، جاوداں، ورفعنا لک ذکرک، پھولوں کی زبان، میرا پیغام ایک طویل نظم، پاکستانی نوجوانوں سے خطاب، بچوں کی نظمیں، بینات، دوہا آرام (یہ خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی کے دوہوں کی ضخیم کلیات ہے) نیز ۳۵ شعری مجموعوں کو سات کلیات میں جمع کیا ہے دوہا آرام ۱۰۴۸ اصفحات پر مشتمل ہے اس میں پانچ ہزار سے زائد دوہے شامل ہیں۔

خیام العصر کی شاعری میں وہ جذبہ غنائیت ہے جوان کی روح کی گہرائی میں چھپا ہوا ہے جس کو ہر شخص اس انداز سے محسوس نہیں کرسکتا جس شعور وآگہی اور تمام تر توجہات کے ساتھ ایک فطری شاعر محسوس کر لیتا ہے بلاشبہ محسن اعظم کی شاعری اور افکار اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق احمد خان کے مطابق ''محسن اعظم بڑے کس بل کے شاعر ہیں، ان کے ہاں بڑا تنوع اور ہمہ گیری ہے۔ اپنے ہم عصر بڑے شعراء میں بہ حیثیت غزل گو اور نظم نگار دونوں ہی لحاظ سے بڑے قد آور شاعر ہیں۔ ان کے اشعار شوکت الفاظ اور ایجاز و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جو براہ راست دل کو چھوتے ہوئے روح میں اتر کر روح بن جاتے ہیں۔ لطافت معانی اور اسلوبِ بیان میں ان کی غزل کا ایک ایک شعر ان کی پختگیٔ فن اور مشاقیٔ سخن کی شہادت دیتا ہے۔ ان کی شاعری زندوں کی شاعری ہے مُردوں کی نہیں۔ محسن اعظم ایک بالغ النظر شاعر ہیں۔''

ڈاکٹر عبدالخالق محسن اعظم کے دوہوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''محسن اعظم صاحب رباعی کے ممتاز شاعر تو ہیں ہی مگر میری نظر میں وہ دوہے کے بھی عظیم شاعر ہیں اردو اور جدید بندی کے میل سے جو فکر انگیز دوہے لکھے ہیں وہ اردو، دوہا ادب میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ''محسن اعظم ملیح آبادی میں شاعرانہ طباعی اور بہت سے شعراء سے منفرد نظر آتی ہے ان کی شاعری فکر وخیال کی بلندی اور فنی صلاحیتوں سے معمور ہے وہ نظم اور غزل کے تو اہم شاعر ہیں ہی مگر رباعیات میں خصوصیت کے حامل شاعر ہیں اس وقت تک انہوں نے سب سے زیادہ رباعیاں کہی ہیں ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ رباعیات کا پہلا مجموعہ (کلیات) دانش وبینش سے جو اپنی فکر انگیزی، تنوع اور تخیل کی بلندی میں خوشگوار

حیرت سے دوچار کرتا ہے۔'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری دوہا کے حوالے سے اپنی سندیوں عطا کی ہے کہ '' یہ دوہے جدید ہندی الفاظ کے استعمال سے ذرا مشکل تو ضرور ہو گئے ہیں مگر روانی اور شگفتگی برقرار ہے۔ انہوں نے دوہوں میں بھی فنی قیود کو پیش نظر رکھا ہے جدید ہندی الفاظ کا تلفظ بھی درست نظم کیا ہے۔ دوہوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ محسن اعظم ملیح آبادی دور حاضر کے دوسرے دوہا نگاروں سے اپنے اسلوب کے اعتبار سے الگ نظر آتے ہیں ان کے دوہے بھی بیحد فکر انگیز نوعیت کے ہیں:

دوہے کے رنگ

آپ سے پہلے پانی، اس جگ میں تھی رات
ہے جگ والوں کے لیے سورج آپ کی ذات

☆

مایا جس کے پاس ہے سب اس کے ہیں داس
دھن ہی کے سب متر ہیں دھن کی سب کو پیاس

☆

تھامے ہوئے بس سانس ہی تو ہے، ہے مانش یہ کائے
جانے کب رک جائے ترا دم، دھم سے تو گر جائے

غزل کے چند اشعار

میں جتنا چاہوں مری ذات پھسلتی جائے
میں جتنا چاہوں مری ذات مختصر ہو جائے

☆

دولت بھی ملتی حسن بھی، شہرت بھی نظر بھی
اے کاش! کہ ملتا تمہیں چننے کا ہُنر بھی

☆

میں بھی اک آگ ہوں اس آگ میں جلنے دو مجھے
راکھ ہونے دو مجھے، خود ہی بکھر جاؤں گا

☆

جو بام و در نہ مرے گھر کے کر سکیں روشن
میں کیا کروں گا بھلا ایسے رہگزر کے چراغ

رباعیات:

جو ان سے تعلق تھا نہ وہ توڑا کبھی
یہ ہے وہ عبادت نہ جسے چھوڑا کبھی
تا عمر میں دیوانہ حسینوں کا رہا
اصنام پرستی سے نہ منہ موڑا کبھی

☆

بھیگے ہوئے موسم کا وہ حسنِ رنگیں
منظر وہ دھنک کا وہ جمالِ نمکیں
اللہ رے تاحد نظر پھیلے ہوئے
گلشن کے وہ مہکتے گل شعلہ آگیں

☆

زلفوں سے ٹپکتی ہوئی صہبا تیری
مکھڑے کی دمکتی ہوئی صہبا تیری
اے جاں! مجھے مسرور کیے دیتی ہے
آنکھوں سے چھلکتی ہوئی صہبا تیری

☆

میں سوچتا ہوں آدمی کیسا ہے وہ
احسان فراموش و کمینہ ہے وہ

مدت سے کلام اپنا دکھاتا ہے مجھے
استاد کسی اور کو کہتا ہے وہ

☆

اس شہرِ پر آشوب میں جینا ہے محال
بے رونق و بے رنگ سراسر بے حال
پھرتے ہیں لیے لوگ کلاشنکوفیں
سڑکوں پہ نظر آتا نہیں کوئی غزال

☆

گھر آکے میرے کیسے عبادت کرتا
بے وجہ کوئی کیوں یہ عنایت کرتا
اک گوشہ نشیں شخص ہے محسن اعظم
پھر کون ملاقات کی زحمت کرتا

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کہتے ہیں کہ ”محسن اعظم اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ ابتدائے شاعری میں بھی سوچ سمجھ کر اور سلیقے سے شعر کہتے تھے ۔ ان کی شاعری کا دور پچاس سال کے عرصے پر محیط ہے۔اس عرصے میں انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔“

محولہ بالاتحریر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی جانب سے محسن اعظم کے لیے ایک سند کا درجہ رکھتی ہے جبکہ احمد ندیم قاسمی کے مطابق ” کیسے کیسے ذہین اصحاب کو حالات کی گرد دیر تک چھپائے رکھتی ہے۔“

خدا اس مردِ قلندر کو صحت و سلامتی اور عمرِ خضر عطا فرمائے۔آمین

☆...... رفیع الدین راز (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء)

رفیع الدین کی جائے پیدائش بیگوسرائے۔ دربھنگہ، بہار ہندوستان ہے آپ کی تاریخ پیدائش ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء ہے۔ ماشاءاللہ آپ ۸۳ سال کی عمر میں بھی جواں جذبوں کے شاعر

ہیں آپ کے والد گرامی کا نام مرزا فرید الدین بیگ تھا آپ کا بچپن، لڑکپن، جوانی مد و جزر کا شکار رہی میٹرک ڈھاکا سے کیا کراچی سے ایم اے تاریخ کیا۔آپ کی شاعری کا سفر کافی طویل ہے میری ذاتی شناسائی ان سے ۱۹۸۲ء سے ہے جب میں بزم حمید لانڈھی کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ان سے پہلی ملاقات انہی مشاعروں میں ہوئی تھی۔راز کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات کی عکاس ہے۔ان کے لہجے میں کھرا پن اور ندرت خیال ہے۔ پروفیسر جاذب قریشی کہتے ہیں کہ ”رفیع الدین راز کی شاعری سچے جذبوں سے عبارت ہے۔ پاکستان و ہندوستان جہاں جہاں بھی اردو شاعری ہو رہی ہے وہاں سب سے الگ، منفرد اور توانا آواز رفیع الدین راز کی ہے۔ان کی شاعری میں عزم و ہمت کا بے کراں سمندر دیکھا جا سکتا ہے۔“ سعید الظفر صدیقی نے رفیع الدین راز کی شاعری کو عالمی منظر نامے میں ایک نام قرار دیا ہے۔راز کے یہاں موضوعات ذاتی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں جو ان کے فنی و تخلیقی تجربات کو عیاں کرتے ہیں۔ راز کی غزلوں میں وسعت، گہرائی اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔”سخنِ سرمایہ“ کے نام سے رفیع الدین راز کی کلیات جبکہ نظم کی کلیات ”آبشارِ سخن“ زیر اہتمام رنگ ادب پبلی کیشنز ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی جو غزلوں کے سات مجموعہ جات اور نظم، قطعات، دوہے، رباعیات اور ہائیکو کے سات مجموعہ جات شامل ہیں۔رفیع الدین راز کے منتخب اشعار:

حصارِ ذات سے باہر نکل جانے کی ٹھانی ہے
ذرا میں بھی تو دیکھوں مجھ میں کتنی بیکرانی ہے
عین ممکن ہے گواہی دوں میں خود اپنے خلاف
اعتبار اتنا تو رکھتا ہوں میں اپنی ذات پر
کب ان کو خبر تھی کہ یہ گر جائے گی ان پر
دیوار تک آئے تھے جو سائے کی طلب میں
تا حد نظر کچھ بھی نہیں اپنی جگہ پر
اور بات ہے اتنی کہ میں گھر بھول گیا ہوں

ترکِ تعلقات پر پھر ہوگی اس سے بات
پہلے وہ میرے سارے خطوں کو جلا تو ے

بات تہذیبِ کہن کی میں اب کروں کس سے
جو بھی سنتا ہے یہ کہتا ہے کہاوت ہوگی

حقیقت کیا ہے اور کیا ہے فسانہ
یہ سب کچھ منحصر حالات پر ہے

ایسا نہ ہو کہ خون میں نفرت کا زہر گھول دیں
اپنے خیال و فکر کو ایسی محبتیں نہ دو

رفیع الدین راز کی ایک نظم ''نوٹ اور پھول''

نوٹ سے تم
خرید سکتے ہو
نرگس ولالہ وگلاب
مگر
نوٹ کو گل کے پہلو میں رکھنا
قتلِ حسنِ جمالیات ہے رازؔ

قطعات:

بتوں کے شہر میں یہ عزم لے کے آیا تھا
نقابِ گردشِ دوراں الٹ کے دیکھوں گا
خبر نہ تھی کہ طلسماتِ صوت میں گھر کر
صدا کی سمت میں خود ہی پلٹ کے دیکھوں گا

☆

ہیں چاروں طرف یاس کی گھنگھور گھٹائیں
امید کی اس لو کو ذرا اور بڑھاؤ

اس شب کے لیے صرف دیا کافی نہیں ہے
اطراف میں ہیں سانپ، بہت آگ جلاؤ

☆

حق طلب کرنے لگے ہیں سارے ہی حقدار
کیا خبر تھی روزِ محشر اس طرح آ جائے گا
گھر تو بٹتے ہیں وراثت میں مگر لگتا ہے یوں
وارثوں کے درمیاں اب ملک بانٹا جائے گا

☆

نڈھال کب نہیں اپنا ہے یہ پیکر
بدن پہ ایسی تھکن تو سدا سے طاری ہے
اسیرِ گردشِ دوراں ازل سے ہیں ہم لوگ
زمیں کے ساتھ ہمارا سفر بھی جاری ہے

دوہے:

اک ناری ہے لاج میں، اک کو ہے ارمان   اک نے لڈو چکھ لیا، دوجی ہے انجان
کھل کر آیا سامنے اب ہستی کا روپ   چھالے دونوں پاؤں میں سر پر غم کی دھوپ
شعلہ رخ سے ہوئے موسم کے جذبات   اس کی اک اک زلف میں در آئی ہے رات

رباعیات:

جذبات و خیالات کی یہ در بدری
لے آئی ہمیں آج کہاں کم نظری
خود سے ہیں شناسا نہ زمانے کی خبر ہے
اللہ رے انسان کی یہ بے خبری

☆

لہجہ ہے الگ تیرا جدا تیری زباں
کھلتا ہی نہیں ہے یہ ترا طرزِ بیاں
اس وصف میں کوئی نہیں ثانی تیرا
ہر شے میں عیاں ہو کے بھی سب سے ہے نہاں

ہائیکو:

بھائی اور بہنا
جیسے من کی ڈالی پر
کھولی اور مینا

☆

خوشبو اکلوتی
مٹی پہلی بارش کی
سوندھی سوندھی سی

تنہائی کی آگ
یوں ڈستی ہے گوری کو
جیسے کالا ناگ

☆

یارب تیرا دہر
اب ہے میری نظروں میں
اک چھوٹا سا شہر

رفیع الدین راز کے ہاں سلاست، روانی اور انداز کا دھیما پن مگر معنویت کے ساتھ ان کو معاصرین میں ممتاز کیے دیتا ہے۔ رفیع الدین راز کا شعری اثاثہ ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ راز کی شخصیت پر ہندوستان میں پی ایچ ڈی ہو چکی اور مقالہ اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

☆...... جون ایلیا (۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ تا ۸ نومبر ۲۰۰۲)

سید سبط اصغر نقوی ابن علامہ شفیق حسن ایلیا جن کو عالمی اردو ادب میں جون ایلیا کے نام سے جانا جاتا ہے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو امروہہ، اتر پردیش (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ جون، سید محمد تقی اور رئیس امروہوی کے بھائی تھے۔ ازدواجی زندگی میں آپ زاہدہ حنا کے ہم سفر رہے مگر کچھ ناگزیر وجوہ کی بنا پر علیحدگی ہو گئی۔ جون کی ابتدائی تعلیم و تربیت امروہہ میں ہوئی۔ سید المدارس کی تدریس ان کی تعلیم و تربیت کا حصہ رہی۔ عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں پر دسترس حاصل تھی جون ایک شاعر، فلسفی، سوانح نگار، عالم نیز ماہر لسانیات تھے اور تنقید

نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔

جون بچپن ہی سے حسن، عشق و محبت کے گرویدہ ہوئے وہ اپنی خیالی محبوبہ صوبیہ کے خیالوں میں گم رہتے تھے ان کا پہلا شعر اس بات کی غمازی کر رہا ہے

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

جون ایلیا وطن اور وطن میں بسنے والوں سے گہری محبت و عقیدت رکھتے تھے وہ ملکی تقسیم کے خلاف تھے وہ برصغیر کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید یہ ان کی کمیونسٹ لابی سے رغبت کی وجہ سے تھا۔ جون ۱۹۵۷ء میں کراچی منتقل ہو گئے اور بہت جلد ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنا لی۔ ان کا شعری اثاثہ خالد انصاری نے بھی جمع کر کے شائع کیا ہے ان میں یعنی، گمان اور شاید شامل ہیں۔ دیگر کتب میں لیکن، گویا، فرنود شامل ہیں جون ایلیا کی نثری تخلیقات کسی خفیہ خانے میں قید ہیں۔ جون ایلیا نے اپنی وضع اور تراش خراش سے اپنا تصور ایک اقدار شکن، نراجی اور باغی، بلا کا مے نوش اور لاابالی کا پیش کیا ہے۔ جون ایلیا کے چند منتخب اشعار:

شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی
لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں

مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجیے

یوں تو ہم دم بہ دم زمیں پہ رہے
عمر سب آسمان میں گزری

شاید وہ پہلا دن تھا پلکیں بوجھل ہونے کا
مجھ کو دیکھتے ہی جب اس انگڑائی شرمائی ہے

آج بہت دن بعد میں اپنے کمرے تک آ نکلا تھا
جوں ہی دروازہ کھولا اس کی خوشبو آئی ہے

وہ جو تھا وہ کبھی ملا ہی نہیں
سو گریباں کبھی سلا ہی نہیں
میرے اندر ہی تو کہیں غم ہے
کس سے پوچھوں ترا نشاں جاناں
گرم گفتار ہے وہ کم گفتار
کیا اُسے میں نظر نہیں آیا

جون ایلیا اپنی ہمہ جہت متنازعہ شخصیت کے رنگ بکھیرتے ۸ نومبر ۲۰۰۲ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

☆......☆

غزل کا ایک اور زاویہ:
مابعد جدید غزل ۱۹۸۰ء کے بعد

کلاسیکیت، روایت، رومانیت، ترقی پسندیت، جدیدیت کا سفر جب وسیع النظر اور وسیع المطالعہ ادباء کے قریب پہنچا تو مابعد جدیدیت کا سفر شروع ہوا یعنی پوسٹ ماڈرنزم۔ یقیناً یہ جدید عہد کا ردِعمل بھی ہے مابعد جدیدیت نے ہمیں مختصر اور چھوٹے بیانیے سے روشناس کرایا اس کے پس پشت کوئی تحریک یا گروہ نہیں ہے اس تناظر میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مابعد جدید سے مراد وہ تمام طبع آزمائیاں یا تحقیقی و تخلیقی رجحانات ہیں جو جدید غزل کے دور کے بعد شروع ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے۔

کیا مابعد جدیدیت کے بعد جدیدیت، روشن خیالی، ترقی پسندیت یا کلاسیکیت نے دم توڑ دیا......نہیں، کیونکہ مابعد جدیدیت کا دائرہ متعین کرنا یوں ممکن نہیں کہ یہ ترقی پسندیت اور جدیدیت کے افکار میں ایک شعوری کروٹ ہے اور یہ موضوع/مضمون خاصا وسیع اور متنوع ہے اسے ہم کسی واحد جملے میں بیان نہیں کر سکتے یہ ایک کثیر الجہتی میدان ہے ذیل میں ہم مابعد جدید غزل کا جائزہ لیتے ہیں اور غزل کے جدیدیت کے دور کے بعد طبع آزمائی کرنے والے شعرا کے کلام، محاسن اور مزاج پر روشنی ڈالیں گے۔ مابعد جدید غزل کو ہم کسی فکری حصار میں قید نہیں کر سکتے۔ مابعد جدید غزل خود شعوریت پر مبنی ہے اس میں مضامین کی بندش اور وسعت خیال پر کوئی پابندی نہیں ہے اس دور کی شاعری نئے امکانات کی شاعری ہے۔ اپنے ارد گرد بکھرے حالات، احساسات و مشاہدات کو زیادہ سے زیادہ زاویوں سے دیکھنا اور حقیقت کو سمجھنا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر سے شروع ہونے والا یہ سفر جب اکیسویں صدی میں داخل ہوا تو اس نے اپنی شناخت مابعد جدید غزل کے نام سے کروائی۔ ٹی ایس ایلیٹ کے مطابق ''ہمارا شعور، ادراک جیسے جیسے ہمارے گردوپیش کی دنیا بدلتی ہے خود بھی بدلتا ہے۔ مثلاً اب ہمارا شعور و ادراک وہ نہیں ہے جو جینیوں کا ہندوؤں کا تھا بلکہ اب وہ ویسا بھی نہیں ہے جیسا کئی سو سال قبل ہمارے اجداد کا تھا۔ یہ ویسا بھی نہیں ہے جیسا ہمارے باپ دادا کا تھا بلکہ ہم خود بھی وہ شخص نہیں جو ایک سال پہلے تھے۔''

یہ درست ہے کہ مابعد جدیدیت کی ادبی اصطلاح ہماری ادبی دنیا میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکی ہے مگر ابھی بہت سے نکات تشریح طلب ہیں ہر بار ایک نئی روشنی اور نئے امکانات پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ نئے امکانات اور نئی روشنی زندہ معاشرے کی پہچان ہیں یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہم مابعد جدیدیت کی تعریف کو مکمل کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ بحث اس بات کی متقاضی ہے کہ مغربی مابعد جدیدیت اور اردو ادب/ شاعری کی مابعد جدیدیت کے اسباب اور دائرہ کار پر کام کریں یعنی تحقیقی کام۔

☆...... فرحت احساس (۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء)

فرحت اللہ خان المعروف فرحت احساس ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو محلّہ قاضی پورہ جنوب شہر، بہرائچ اتر پردیش ہندوستان میں پیدا ہوئے آپ کے والد بشارت اللہ خان ایک مشہور وکیل اور اعزازی جج تھے۔ ابتدائی تعلیم بہرائچ اور ایم اے انگریزی اور ایم اے اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ فرحت نے اپنا ادبی سفر ایک اخبار قومی آواز نئی دہلی سے کیا اور ادبی ضمیمے کے نگراں کی حیثیت سے کام کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی، سیاسی اور تہذیبی موضوعات پر ایک اندازے کے مطابق ۲۵۰ سے زیادہ مضامین لکھے۔ نیز آل انڈیا ریڈیو کے لیے حالات حاضرہ پر تبصرے، تجزیے اور فیچر بھی لکھتے رہے۔ فرحت احساس کی شاعری میں معاشرتی مسائل، سماجی ناہمواری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے جو دیکھا، جو محسوس کیا بڑی سادگی اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے فرحت

احساس کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''فرحت احساس نئے لوگوں میں خاصا امتیاز رکھتے ہیں کہ ان کی علمی استعداد کے ثبوت ملتے رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس لیے ان کے شعور کی بالیدگی اکثر موقعوں پر نمایاں ہوتی ہے۔ اپنے حلقہ کے معاصرین کے درمیان پر وقار نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ان کے علم و کلام کی چھاپ ان کی نثری تحریروں میں بہت نمایاں ہے گا ہے بہ گا ہے جو مضامین لکھتے ہیں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا تیور پایا جاتا ہے جو ان کی راہ دوسروں سے الگ کرتا ہے لفظوں پر اچھی گرفت ہے اور ان کے جدلیاتی استعمال کے گر سے واقفیت رکھت ہیں پرانے خیالات اور تصورات نئے سانچے پر ڈھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔''

فرحت کے کلام میں ایہام، ابتذال یا مبالغہ آرائی نہیں ملتی سیدھے سادے مضامین خوش کن لہجے میں ملتے ہیں۔ اپنی شاعری کو نئی تراکیب سے مزین کرنے کا ہنر جانتے ہیں زمانے کے دکھ درد، آلام کا ذکر بڑے سلیقے سے کرتے ہیں:

ترے قدموں پہ رکھ دی دیکھ یہ دستار میں نے
کہ اپنے آپ سے معزول ہونا چاہتا ہوں

عمارتوں کے بدن میں جڑے لاکھوں سر
گھروں کا سلسلہ شاید کسی مزار میں ہے

اک رات وہ گیا تھا جہاں بات روک کے
اب تک رکا ہوا ہوں وہیں رات روک کے

ہر گلی کوچے میں رونے کی صدا میری ہے
شہر میں جو بھی ہوا ہے وہ خطا میری ہے

چاند بھی حیران دریا بھی پریشانی میں ہے
عکس کس کا ہے اتنی روشنی پانی میں ہے

کبھی خدا کبھی انسان روک لیتا ہے
میں جب بھی جاتا ہوں دربان روک لیتا ہے

فرحت احساس کی غزل میں حالات حاضرہ اور بے کسی و بے بسی زندگی کے تجربوں کے تابع ہیں ان کی فکر ایک وسیع امکان لیے ہوئے ہے۔

☆...... مہتاب حیدر نقوی (یکم جولائی ۱۹۵۵ء)

میں نے سو طرح سے سو بار جتن کر دیکھا
اس نے اک بار مگر بات نہ مانی میری

مہتاب حیدر نقوی یکم جولائی ۱۹۵۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے آپ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔ اردو ادب میں ڈاکٹریٹ میں مہتاب حیدر نقوی مابعد جدید غزل دور کے شاعر ہیں جن کی ذات سے کوئی گروہ یا تحریک منسلک نہیں۔ ان کی اپنی ایک شناخت ہے۔ ان کے اسلوب سخن میں معصومیت اور سادگی کا عنصر اپنی انفرادیت لیے ہوئے ہے جن میں ان کا وسیع مطالعہ شامل ہے۔ جس طرح علی گڑھ کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی اس طرح مہتاب حیدر نقوی کے ذکر کے بغیر مابعد جدید غزل کی بنیاد ادھوری ہے مہتاب حیدر کی ادبی نگارشات میں ماورائے سخن، شب آہنگ، نیا شعری احساس شامل ہیں۔ منتخب اشعار:

کیا کیا نہ مجھ سے سنگ دلی دلبروں نے کی
پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

ایک میں ہوں اور دستک کتنے دروازوں پہ دوں
کتنی دہلیزوں پہ سجدہ ایک پیشانی کرے

اداس رات کے گداز جسم کو ٹٹول کر
کسی کی زلفِ سایہ دار کی گردہ میں گھر کرو

پانی پانی کہنے والے دریا دریا ڈوب گئے
کس منہ سے ساحل والوں سے تشنہ لبی کی بات کریں

132

کنور شہریار آپ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”مہتاب حیدر کی شاعری میں پابندی سے سنتا اور پڑھتا رہا ہوں اور ان کو ایک اچھا شاعر سمجھتا رہا ہوں مجموعے کی شکل میں جب ان کے کلام کو یکجا پڑھا تو ایک عجیب انکشاف کا احساس ہوا یعنی یہ شاعری میرے تاثر اور اندازے سے کہیں زیادہ اچھی نکلی میرا دعویٰ ہے کہ آپ اگر اس مجموعے کو ہمدردی اور بغیر تعصب کے پڑھیں گے تو یہ شاعری آپ کو بھی ضرور متاثر کرے گی روایت اور نئے پن کا ایسا امتزاج آج کی شاعری میں خال خال نظر آتا ہے اس مجموعے کی پذیرائی اس لیے بھی ضروری ہے کہ:

پرندوں سے کہو ان کی اُڑانیں ہوں سلامت
کمانوں سے کوئی دم تیر نکلا چاہتا ہے

گھر لٹے گا وہی جو روشنیوں والا ہے
سر قلم ہوگا وہی سب سے جو اونچا ہوگا

کوئی آئینہ لیے شہر میں یوں پھرتا ہے
ہم تو ڈر جاتے ہیں خود دیکھ کے صورت اپنی

آنکھوں سے کہو کوئی نیا خواب نہ دیکھیں
پلکوں پہ بہت بوجھ اٹھایا نہیں کرتے

نہ کوئی بات ہی ہوتی نہ مسئلہ کوئی
قصور وار ہے یہ آنکھ دیکھتی کیوں ہے

مہتاب حیدر کی شاعری میں روح کی ویرانی اور دکھ کے احساس کا رشتہ وسیع ہے اور بہت گہرا ہے ان کی شاعری میں سراب، وہم خواب و خیال کے تجربات شامل ہیں۔ پروفیسر قاضی جمال حسین مہتاب کی شاعری کے لیے لکھتے ہیں کہ ”اپنی اس منفرد آواز کی آبیاری میں نقوی نے نہایت احتیاط اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ روایت کے مستحکم حصار میں انفرادیت کے دریچے کھولنا اور مانوس لفظیات کے ذریعہ سیاق و سباق کی خفیف تبدیلی سے پیش منظر میں لطیف

ارتعاش پیدا کر دینا نقوی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔''

بات تو تب ہے کہ تو بھی مقابل میرے
جانِ من! پھر ترا خنجر، مرا سر ہے سب کچھ

وہ بدن صحرا بڑھا دیتا ہے پہلے میری پیاس
اور بن جاتا ہے پھر آبِ رواں میرے لیے

کیسے لکھوں میں شاعری کیسے کروں یہ ساحری
ایک زمانہ ہوگیا لفظوں کے جال میں ہوں گم

شاعری کیا ہے مجھے بھی نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ یہ دل کی لگی ہے کوئی چیز

☆...... اسعد بدایونی (۱۳ اگست ۱۹۵۷ء تا ۲۰۰۳ء)

آپ کا نام بھی اسعد اور تخلص بھی اسعد تھا۔ ۱۳ اگست ۱۹۵۷ء کو سہسرام ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بدایوں علم و ادب کے حوالے سے ایک مردم خیز خطہ ہے یہاں پیدا ہونے والے ادباء شعراء اور علما نیز مجاہدین نے کمال حاصل کیا۔ آپ ایک تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے ذہن کے ادیب تھے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے اور پھر وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بیخود پر مقالہ لکھ کر حاصل کی۔ آپ علیگڑھ یونیورسٹی سے بسلسلہ درس و تدریس منسلک رہے آپ کی تصانیف میں دھوپ کی سرحد، ضمیمہ خواب، جیون کنارا (شعری مجموعے) جبکہ نئی منزل نئی آوازیں، کاروانِ رفتہ، نثری نگارشات میں داغ کے اہم تلامذہ، جنوں کنارا، کلیات اسعد بدایونی بھی اسعد بدایونی کی یادگار ہیں۔

اسعد بدایونی اپنے عہد کے تمام شعراء میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے ان کے کلام میں مایوسی نہیں جھلکتی وہ امید کے سہارے زندہ تھے۔ ان کا اصل میدان جدید و مابعد جدید غزل ہے۔ اسعد نے ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے ان کے دامن میں کلاسیکیت بھی ہے اور جدید غزل کے تیور بھی۔ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔ ان کی شاعری ایک تازگی لیے ہوئے ہے۔ اسعد کی

133

غزل میں عشق و حسن کا تذکرہ ایک اچھوتے انداز میں ہے۔

ڈاکٹر شہپر رسول اسعد بدایونی کی ادبی خدمات و شعری اسلوب کے لیے لکھتے ہیں کہ ''اسعد بدایونی غزل کی نئی وسعتوں کا استعارہ ہے۔ مابعد جدید غزل کے دور میں اسعد کی اپنی ایک انفرادی شناخت ہے ان کے کلام میں اردگرد کے ماحول اور بدلتے ہوئے انسانی رویے اور جدید استعاروں کا استعمال ملتا ہے۔ ان کی شاعری نیچرل اور حقیقت سے قریب تر معلوم ہتی ہے۔''

نمونہ کلام:

جہاں رقم تھی دھنک اب وہاں نوشتہ خاک
جہاں گلاب کھلے تھے ببول ہوگئی ہیں

لکھا ہے سب کے مقدر میں تہ نشیں ہونا
بھنور نصیب سفینے بھی، میری آنکھیں بھی

اپنی رفاقتوں میں کوئی کھوٹ تو نہیں
اب تک ہوا ہے شہر میں رسوا نہ تو، نہ میں

جو اس دھماکے میں دب گئی ہے جو اس دھویں میں الجھ گئی ہے
وہ چیخ میری ہے یا تمہاری کسی پہ کب انکشاف ہوگا

ہر سیہ رات میں روشن تھا میری جاں کا چراغ
ہر چمکتے ہوئے ذرے میں نشاں تھا میرا

اسعد بدایونی ۵ مارچ ۲۰۰۳ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

☆...... سراج اجملی (۱۹۶۶ء)

اسے بے حساب دیکھا جائے
آئینے کا جواب دیکھا جائے

پروفیسر سید سراج الدین اجملی نومبر ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ (انڈیا) میں پیدا ہوئے ان کا تعلق ایک علم دوست خانوادے سے ہے وسیع النظر اور باشعور لکھاری ہیں اردو غزل پر گہری نظر

رکھتے ہیں آپ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو غزل کے رموز وعلائم کا سماجیاتی اور تہذیبی مطالعہ'' ہے۔سراج اجملی کا شمار اس عہد کے ان شعراء میں ہوتا ہے جن کی شناخت غزل ہے، انہوں نے اپنی طبع آزمائی میں نئے دور کے نئے مضامین اور نئے تقاضوں کو اہمیت دی ہے ان کی فکر اور شعری صلاحیتوں کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق صدف کی رائے ''روایت کی روشنی میں سراج اجملی نے جدید شعری دنیا کی ایک ایسی فضا قائم کی ہے جس سے ان کی شاعری کی لو ٹمٹمائے گی نہیں بلکہ سدا جلتی رہے گی کہ اس چراغ میں ہمارے بزرگوں کا لہو روشن ہے'' سراج اجملی خاص غزل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ان کا مابعد جدید غزل میں ایک اہم کردار ہے۔سراج کی غزلوں میں فکر، سوز وگداز ایک نکھرے ہوئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ذیل میں سراج اجملی کے چند اشعار بطور نمونہ

جن بازوؤں پہ چارہ گری کا مدار تھا
وہ تو کبھی کے ہوگئے شل ، جاگتے رہو
کوئے ملامت کے باشندے تم کو سجدہ کرتے ہیں
کس نے اس بستی میں آخر ایسے سرفراز کیا
مدت سے پتہ اس کا معلوم نہیں کچھ بھی
مشہور بہت تھا جو آشفتہ نوا کر کے
جھکا کے سر کو چلنا جس جگہ کا قاعدہ تھا
مرے سر کی بلندی سے وہاں محشر بپا تھا
جو سراپا التجا بن کر ملا تھا پہلے روز
اتنی جلدی وہ خدا ہوجائے گا سوچا نہ تھا
جن کی جڑوں میں دفن تھیں یادیں تمہاری
اس بار گاؤں جا کے وہ اشجار بیچ آئے
آفت کیسی بھی ہو اس کو میرا نام ہے از بر کیوں
میں ہی آخر اس دنیا میں ہر گردش کا محور کیوں

سراج اجملی سوز وگداز، محرومی کے تذکرے، ٹوٹتے بکھرتے خواب مگر گیسوئے جاناں سے کھیلتے ہوئے اپنی طبع آزمائی جاری رکھے ہوئے ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ارضِ پاکستان میں ادبی وشعری زاویہ جدید غزل کے دور سے مابعد جدید غزل کی جانب رواں دواں ہے اس دور یعنی ۱۹۸۰ء کے آس پاس بہت سے شعراء نے نیا لہجہ اپنایا ان شعرا نے جدیدیت کے عہد کے لوازمات کے ساتھ نئی کروٹ اور غزل کے نئے زاویے مابعد جدیدیت میں اپنے شعری محاسن کو مزید واضح اور روشن بنایا ہے مابعد جدیدیت میں عصری مسائل کا تذکرہ نمایاں ملتا ہے پاکستان کے مابعد جدیدیت غزل کے دور میں لیاقت علی عاصم، خواجہ رضی حیدر، عزم بہزاد، اقبال نوید، میر احمد نوید، ثمینہ راجہ، قمر رضا شہزاد، اختر عثمانی، اجمل سراج، سلمان صدیقی، ریحانہ روحی، ڈاکٹر شاداب احسانی، ڈاکٹر فرحت عباس، رونق حیات، سحر تاب رومانی، ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی، جمال احسانی، عباس تابش، عارف عبدالمتین، شکیب جلالی، تنویر سپرا، سلیم احمد، منیر نیازی، اقبال ساجد، خالد علیگ، ثروت حسین، سبط علی صبا اور دیگر شامل ہیں۔

☆...... لیاقت علی عاصم (۱۴ اگست ۱۹۵۱ء تا ۲۹ جون ۲۰۱۹ء)

ابھی زندہ ہوں حقیقت کا بیاں مشکل ہے
لوگ لکھیں گے میرے بعد کہانی اچھی

لیاقت علی عاصم نے ۱۴ اگست ۱۹۵۱ء کو حاجی علی کے گھر آنکھ کھولی۔آپ کی ابتدائی تعلیم اور گریجویشن اور ایم اے اردو کراچی میں مکمل ہوئی۔آپ شاعر ہونے کے ساتھ ایک ماہر لسانیات بھی تھے۔اردو لغت بورڈ میں ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۱ تک خدمات انجام دے کر بہ حیثیت ایڈیٹر سبکدوش ہوئے۔ابتدائی زمانہ میں کے پی ٹی میں بھی ملازمت کی آپ کا پہلا مجموعہ سبط گل اور آخری مجموعہ ''میرے کتبے پہ اس کا نام لکھو'' ہے آپ کی ایک اور خصوصیت پورٹریٹ بنانا تھا آپ کے ہم عصر شعرا میں قابل ذکر سحر انصاری، نصیر ترابی، جون ایلیا، انور شعور، عبیداللہ علیم، سلیم کوثر، جمال احسانی صابر ظفر جیسے سخنور شامل رہے۔آپ پاکستان کی اردو شعری تاریخ

میں اعلیٰ مقام کے حامل شاعر تھے۔ان کی شاعری عصرِ حاضر کی عکاس ہے۔ جمالیات کے ساتھ ساتھ حقیقت کی تلاش وجستجو میں مشغول رہے۔تنہائی کا نوحہ' تنہائی کا دکھ اور بینائی کا کرب ان کے محبوب مضامین رہے۔لیاقت علی عاصم نے روایتی مضامین میں غزل اور مستعمل استعارات کو نئی جہت عطا کی جیسا کہ ذیل کے اشعار:

اپنے والدمحترم کے انتقال پر کہے گئے اشعار میں ایک شعر:

بسترِ مرگ پہ تھی دنیا......اورتم مرگئے کمال کیا

دیگر شعری آہنگ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمائیے:

بادلوں سے کوئی کہہ دو کہ یہیں رک جائیں
اس قدر دھوپ کی شدت میں کہاں جاتے ہیں

کس نے کھینچا مری تنہائی کا نقشہ عاصم
دشت اس شہر کے منظر میں کہاں سے آیا

وہی ہے تو وہی آئینے اور میں تنہا
تری پناہ میں لشکر کا شور سنتا ہوں

ملنے والوں کی جو فہرست بناتا ہوں کبھی
ایک دو دوست بہرحال نکل آتے ہیں

وہ یاد آ گیا تھا اور شام ہوتے ہوتے
ہم بھی رواں دواں تھے رستا بھی چل رہا تھا

میرے کردار پر جو بحث چلی
جانے کس کس کی داستاں تک جائے گی

یہ کون شعلہ بدن ہے بتاؤ تو جانی
جناب جونؔ نے پوچھا نہیں کہ وقت نہ تھا

سبھی ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں چراتے ہیں

جہاں تو ہو وہاں شرمِ شناسائی تو ہوتی ہے
جیسے میرے لمس نے تجھ کو سنوارا تھا کبھی

یوں ہی تیری یاد کو چھو کر سجائی ہے کتاب
ورنہ سقراط مر گیا ہوتا

اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں

لیاقت علی عاصم کے شعری اثاثہ جات میں سبطِ گل(۱۹۷۰ء)' آنگن میں سمندر (۱۹۸۸ء)' رقصِ وصال(۱۹۹۶ء)' نشیب شہر(۲۰۰۰ء)' دل خراشی (۲۰۱۱ء)' باغ تو سارا جانے ہے(۲۰۱۳ء)'نیشِ عشق (۲۰۱۴ء)' اورکلیات یکجان (۲۰۱۷ء) میں رنگ ادب پبلی کیشنز کے پلیٹ فارم سے شائع ہوئی۔ان کا آخری شعری مجموعہ 'میرے کتبے پہ اُس کا نام لکھو' ہے۔لیاقت علی عاصم بلاشبہ مابعد جدید غزل کے سکہ بند شاعر تھے ان کی شاعری میں روایت' جدّت اور مابعد جدید اوصاف نمایاں ہیں۔

پاکستان کی ادبی فضا اور مشاعروں کی پر رونق فضا ایک عرصے تک بلکہ ہمیشہ لیاقت علی عاصم کی کمی محسوس کرے گی راقم کو بھی کئی ایک مشاعرے ان کے ساتھ اور صدارت میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے اور داد دینے میں کنجوسی نہیں کرتے تھے۔لیاقت علی عاصم کا ایک انفرادی اوردل کش کلام

اکثر اپنے قد و قامت سے بڑی لگتی ہو
دھوپ بھی لگتی ہو تم دیوار بھی لگتی ہو تم
کتنی سادہ' کتنی گم صم اپنے ہر انداز میں
شہر کی ہوتے ہوئے بھی گاؤں کی لگتی ہو تم

پروفیسر سحر انصاری کی سند برائے لیاقت علی عاصم ''ان کے یہاں وہ تمام موضوعات بھی اشعار میں بڑی خوبی سے ڈھلے ہیں جن سے ہمارے عہد اور ہمارے عوام کو شب و روز گزرنا اور سہنا ہوتا ہے۔''

لیاقت علی عاصم اپنے ان جذبات، احساسات، تجربات، جمالیات، اذیت، کرب، تنہائی، مگر تازگی کی تاثیر لیے اور صداقتِ اظہار کے ساتھ اپنی فانی دنیا کا سفر ۲۹ جون ۲۰۱۹ء کو اختتام کر گئے۔

حادثے ہو رہے ہیں، ہونے دو
میں بہت تھک گیا ہوں، سونے دو

☆...... اقتدار جاوید (یکم نومبر ۱۹۵۹ء)

اقتدار جاوید یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو باشاہ پور گجرات پاکستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق شعبہ بینکاری سے ہے آپ غزل اور نظم کے شاعر ہیں نیز مترجم اور کالم نگار بھی۔ اردو اور پنجابی میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ آپ نے ایم اے سیاسیات اور محکمہ جاتی امتحان DAIBP بھی پاس کیا ہوا ہے۔

اقتدار جاوید نے اپنے اردگرد بکھری ہوئی انسانی اقدار اور رویوں کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔ اپنی نگارشات میں بڑی سچائی اور جرات سے کام لیا ہے۔ یہی قدرتی منظر نگاری ان کی غزلوں اور نظموں کی شناخت ہے۔ ان کی سوچ اور فکر نئے راستے تلاش کرتے نظر آتی ہے۔

آپ کی تصانیف میں ایک اور دنیا، عین سر پر ستارہ، پیودی وار شامل ہیں جبکہ زیر طبع نگارشات کی فہرست طویل ہے۔ ان میں قلعہ وار، خودنوشت، بکل (نظمیں)، سراج قادری کا کلام پر کلام (پنجابی)، نیل نظمیں (طویل عربی نظموں کا ترجمہ)، سنب رڑی تے بولیا (غزلاں) جبکہ مضامین بھی شامل ہیں۔ ظفر اقبال کے مطابق ''اقتدار جاوید کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کے دم قدم سے جدید اردو نظم کا بھرم قائم ہے یہ ایک طرح کا اجتہاد بھی ہے کیونکہ ہمارے ہاں (آزاد) نظم کا چلن ابھی بوجوہ عام نہیں ہوا اور نظم کو ذوق وشوق سے نہیں پڑھا جاتا جس آمادگی سے ہمارے یہاں غزل پڑھی جاتی ہے۔''

اقتدار جاوید کے چند منتخب اشعار

تمام مسئلے نوعیت سوال کے ہیں
جواب ہوتے ہیں سارے سوال کے اندر

یہ سلسلہ ذرا موقوف ہو تو دیکھوں گا
خیال اور ہیں کتنے خیال کے اندر

☆

وہ ساتھ تھا تو مقدس تھے میرے سارے حروف
بچھڑ گیا ہے تو لفظوں کا اعتبار اٹھا

☆

مرے آگے انوکھے راستے ہیں
مرے آگے سے ہٹ میرے زمانے

☆...... خواجہ رضی حیدر (۵ فروری ۱۹۴۶ء)

خواجہ رضی حیدر کی پیدائش ۵ فروری ۱۹۴۶ء کو پیلی بھیت ہندوستان میں ہوئی آپ کا خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گیا اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ صحافتی میدان میں آپ پندرہ سال روزنامہ حریت سے منسلک رہے، بعد ازاں آپ کا تقرر قائد اعظم اکیڈمی میں ہوا اور آپ اکیڈمی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ پاکستانی شعراء میں آپ کا نام یوں بھی اہم ہے کہ تحقیق و تصنیف کے ساتھ شعری سفر بھی دلکش انداز میں جاری ہے۔ حسن و عشق آپ کے بنیادی مضمون ہیں بلکہ حسن و عشق پر مبنی شاعری ان کی شناخت ہے۔ خواجہ رضی حیدر اپنے تراشیدہ محبوب کے حسن و عشق میں کھو کر لذتِ وصال میں گم رہتے ہیں مگر ہجر کے آزار سے بھی باخبر ہیں۔ آپ کا خاص رنگ رومان پروری ہے، آپ کے کلام میں کلاسیکیت اور جدّت کا امتزاج ہے۔ خواجہ رضی حیدر کا شمار عصرِ حاضر کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے آپ سے تحقیق کے طالب علم نثر و نظم دونوں میں یکساں اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ نمونہ کلام:

آنکھ سے دل نے کہا رات کے سناٹے میں
کون بولے گا اگر ہو گئے دونوں خاموش
کوئی رت ہو مری تقدیر ہے بہتے رہنا
وقت ہوں، اشک ہوں، دریا ہوں مجھے کیا معلوم

☆

کسی کے جسم کی خوشبو کہاں کہاں نہ گئی
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ گیا

☆

وہ آنکھ جس میں کوئی خواہشِ وصال نہ تھی
ہزار بار اٹھی حسن کی سلامی کو

☆

وہ لوگ جن کی حمایت میں خود سے لڑتا رہا
وہ لوگ ہوگئے میرے خلاف سب کے سب

☆

ترا وجود تھا یا پھول تھے چنبیلی کے
مہک اٹھے تھے دروبام حویلی کے
طلسم قوسِ قزح پر تو بدن تھا ترا
حنا میں رنگ تھے شامل تری ہتھیلی کے

☆

پھر تیر ہوئی دل میں کوئی نیم نگاہی
پھر رات ہوئی زخم سلے نرام ہوا سے

☆

اظہار محبت کا کروں کیسے کہ تجھ سے
اک اور تعلق ہے محبت سے زیادہ
ہم وصل کی تہذیب سے واقف تھے لہذا
اک ہجر کے آداب کو اوڑھے ہوئے نکلے

خواجہ رضی حیدر تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے ادب کے عالمی افق پر ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ رضی حیدر کے کلام میں کلاسیکیت اور جدّت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے تناظر میں آپ کی شناخت آپ کا خوش کن اور سنجیدہ لہجہ ہے:

آنگن تھا مرا اور نہ در وبام تھے میرے
میں دھوپ میں تھا اور سیاہ در تیری طرف تھا

آپ کی تصانیف میں بے دیار شام، گماں گشت، قائداعظم کے ۳۷ سال، قائداعظم خطوط کے آئینے میں، قرارداد پاکستان، رتی جناح (قائداعظم کی رفیقہ حیات)، قائداعظم: حیات و خدمات تصنیف: شریف المجاہد (ترجمہ)، میرا بھائی: تصنیف محترمہ فاطمہ جناح (ترجمہ)، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی: شخصیت و خدمات، تدوین۔ کلیاتِ سوز (تدوین)۔

محولہ بالا تصانیف۔ تراجم اور تدوین شدہ کتب اس بات کا مظہر ہیں کہ آپ ریسرچ اسکالر، شاعر، نقاد اور موثر کالم نگار ہیں۔

☆...... عزم بہزاد (۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء تا ۴ مارچ ۲۰۱۱)

عزم بہزاد کا نام مختار احمد تھا۔ آپ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک شعری خانوادے سے تھا۔ عزم بہزاد کے والد افسر بہزاد اور دادا بہزاد لکھنوی سکہ بند شاعر تھے۔ عزم بہزاد مابعد جدیدیت غزل کے منفرد شاعر تھے انہوں نے اپنے افکار میں داخلی وخارجی حوالوں کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ عزم بہزاد کا پہلا شعری مجموعہ ''تعبیر سے پہلے'' تھا۔ عزم بہزاد کی شاعری میں نئے عہد کے مضامین شامل ہیں۔ روایت سے بغاوت بھی ہیں اور پہلوتہی بھی نہیں آپ اپنے عہد مابعد جدیدیت کے اہم شاعر تھے

نمونہ کلام:

مجھے کل اچانک خیال آگیا آسماں کھو نہ جائے
سمندر کو سر کرتے ہوئے کہیں بادباں کھو نہ جائے
کہاں گئے وہ لوگ جنہیں ظلمت منظور نہیں تھی
دیا جلانے کی کوشش میں خود جل جانے والے

کس قدر کرب میں بیٹھے ہیں سر ساحلِ غم
ڈوب جانے کی تمنا میں ابھرنے والے

جتنے بھی حریف تھے سب مرے دوست بن گئے
مجھ سے ترے فراق میں یہ بھی گناہ ہوگیا

شام آئی تو کوئی خوش بدنی یاد آئی
مجھے اک شخص کی وعدہ شکنی یاد آئی

ہمارے لہجے میں یہ توازن بڑی صعوبت کے بعد آیا
کئی مزاجوں کے دشت دیکھے کئی رویوں کی خاک چھانی

وہ صبح رہائی تھی یا شامِ اسیری تھی
جب میں درِ زنداں سے زنجیر اٹھا لایا

عزم بہزاد کی ادبی کاوشوں پر خواجہ رضی حیدر کی رائے ''عزم بہزاد بلاشبہ گزشتہ عشرے میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے حوالے سے اعتبار کی سند پانے والا ایک ایسا شاعر ہے کہ آج اس کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ پیش رو بھی اس کے مصرع کی فنی و تاثیری توانائی کو رشک سے دیکھتے ہیں۔ ان کے الفاظ نئی توانائی' نئے ذائقے اور ایک نئے پیش منظر کے ساتھ ملتے ہیں۔ موضوعاتی سطح پر داخلی انکشاف تحیر کو مہمیز کرتے ہیں تو خارجی اظہار اشارات میں بدل جاتے ہیں۔''

☆...... میر احمد نوید (۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

میر احمد نوید نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو غلام الثقلین جعفری کے گھر کراچی میں آنکھ کھولی۔ آپ کا نام سید احمد حسنین جعفری جبکہ قلمی و ادبی نام میر احمد ہے۔ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے اور سلسلہ نسب ددھیال کی طرف سے چھٹی پشت میں میر انیس سے ملتا ہے اور ننھیال کی طرف سے لعل شہباز قلندر سے نسبت رکھتے ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا جسے اسکول کالج کے زمانے میں دوام ملا۔ درویش و قلندرانہ صفت میر احمد نوید کا شمار دبستان کراچی کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری میں عصرِ حاضر کے مسائل کا ذکر انداز تغزل میں جہاں ملتا

ہے وہاں آپ کی شاعری میں تصوف کی آمیزش بھی تغزل کے انداز میں پائی جاتی ہے۔ گویا آپ کے ہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا اظہار فلسفیانہ انداز میں ملتا ہے آپ غزل' سلام' منقبت' قصیدہ' مرثیہ' نظم غرض ہر ایک صنف میں اپنے منفرد نقوش ثبت کیے ہیں آپ کی تصانیف میں ھو' جلد اول تا سوم۔ ازازل گفتم۔ الست۔ جاری ہے کربلا۔ وجوذا الکتاب' درنیم وا' ایسی خلوت کہاں۔ ہاں اور نہیں کے درمیاں' مصحفِ عشق' آئینہ شامل ہیں۔ میر احمد نوید نے مرثیہ' سلام و نوحہ کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے اور رثائی ادب کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آپ کی شاعری پر علمی خانوادے کے اثر کے ساتھ ساتھ آپ کی بود و باش نیز علمی قابلیت کا بھی دخل ہے۔ میر احمد نوید نے ایم اے انگریزی ادب' ایم اے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی یہی وجہ ہے کہ علمی ادراک اور فلسفیانہ سوچ آپ کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

میر احمد نوید کے چند اشعار:

سب نے رد کر دیا تو میں نے
اپنے ہونے کا اعتراف کیا

☆

مان لیتا ہوں جو کرتا ہے خدا کرتا ہے
اب مجھے کوئی یہ سمجھاؤ کہ کرنا کیا ہے

☆

پلٹنا ہے سب کو احد ہی کی جانب
مکمل کرو دائرہ اپنا اپنا

☆

اے وقت تو کہیں بھی کسی کا ہوا ہے کیا
کیا تجھے دیکھنا تری ساعت کو دیکھنا

گھر کی ویران منڈیروں پہ دیا رکھنے سے
کوئی آتا نہیں دروازہ کھلا رکھنے سے

☆

وہ در کھلا نہ ہم پہ نہ دیوار ہی گری
نالے ہمارے با اثر ایسے کہاں کے تھے

احمد نوید کے سلام کے اشعار

پنجہ ہے یہ علم کا کہ غازیؑ کا ہاتھ ہے
زینبؑ کی یہ ردا ہے کہ پرچم حسینؑ کا
سر اپنا مارتی ہی رہی سر پھری ہوا
لیکن ہوا چراغ نہ مدہم حسینؑ کا

میر احمد نوید نے ایک عمدہ انداز اپنایا ہے جو سادگی اور ہنرمندی سے ایسے مضامین کو باندھتے ہیں کہ ان کو پڑھنے والا یا سننے والا تا دیر محظوظ ہوتا رہتا ہے ذیل کے چند اشعار میں ان کا رنگ نمایاں کر رہے ہیں

خود سے گزرے تو قیامت سے گزر جائیں گے ہم
یعنی ہر حال کی حالت سے گزر جائیں گے ہم

☆

کچھ اس طرح سے کہا مجھے بیٹھنے کے لیے
کہ جیسے بزم سے اس نے اٹھا دیا ہے مجھے
دبا سکا نہ صدا اس کی تیری بزم کا شور
خموش رہ کے بھی کوئی صدا بنا ہوا ہے
میرا سوال تھا کہ میں کون ہوں اور جواب میں
مجھ کو ہنسا دیا گیا مجھ کو رلا دیا گیا

میر احمد نوید مابعد جدیدیت کے عہد میں ایک منفرد شاعر ہیں وہ اپنی علمی قابلیت اور شعری

وجدان کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسی شعری داستان رقم کر رہے ہیں جسے اردو ادب تاریخ بھلا نہ سکے گی۔

کیا ڈھونڈتا رہتا ہوں میں یوں ہی دہر میں ثبات
کیا مرگِ ناگہاں کے لیے ناگہاں رہوں

☆...... ثمینہ راجہ (۱۱ستمبر ۱۹۶۱ء تا ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

ثمینہ راجہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۱ء کو رحیم یار خان میں جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئیں ترقی پذیر علاقے میں شعر و سخن کی آبیاری ایک سنگلاخ زمین میں کاشتکاری کے مترادف ہے۔ثمینہ نے اوائل عمر سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور محض بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر گوئی کی۔ثمینہ کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوا جن میں فنون' نقوش' اوراق' نیا دور اور سیپ جیسے معتبر ادبی رسالے شامل ہیں۔ثمینہ راجہ کا تعلق ایک ترقی پذیر علاقے سے تھا لہذا وہ ادبی نشستوں یا مشاعروں میں شرکت نہ کر سکیں۔آپ نے اپنی محنت اور لگن سے ادیب فاضل' ایف اے اور بعد ازاں اردو ادب میں ایم اے پاس کیا۔ثمینہ راجہ کے انداز سخن میں عصری مسائل پر زیادہ توجہ رہی۔ انہوں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور علمی بساط کے مطابق زبان کی سلاست اور فارسی تراکیب کا بر محل استعمال کیا آپ نے ابتدائی ادبی سفر میں افسانے بھی لکھے مگر آپ کی شناخت شاعری ہے پہلا شعری مجموعہ ۱۹۹۵ء میں 'ہویدا' منظر عام پر آیا دیگر میں شہر صبا' اور وصال' خوابنائے' باغ شب دیدۂ ہفت آسماں' پری خانہ۔عدن کے راستے پر' دل لیلیٰ اور عشق آباد شامل ہیں۔ثمینہ کی شاعری کی دو ضخیم کلیات شائع ہو چکی ہیں۔

ثمینہ راجہ کا شمار ان خواتین شاعرات میں ہوتا ہے جن کی مابعد جدید دور میں ایک شناخت ہے آپ کا شمار شاعری کے ساتھ ساتھ براڈ کاسٹر' مترجم' ایڈیٹر اور ماہر تعلیم کے طور پر بھی ہوتا ہے' ثمینہ راجہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

وہ خود کو خدا سمجھ رہا تھا
میں اپنے حضور میں کھڑی تھی

ثمینہ راجہ کی شاعری محبت کی زبان ہے ان کے ہر ایک مصرعے میں محبت کی چاشنی اور ہجر وفراق کا ذکر نمایاں انداز میں ملتا ہے۔ ثمینہ راجہ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

میں تمہارے عکس کی آرزو میں بس آئینہ بنی رہی
کبھی تم نہ سامنے آ سکے کبھی مجھ پر گرد پڑی رہی
وہ عجیب شام تھی آج تک مرے دل میں اس کا ملال ہے
میری طرح جو تیری منتظر تیرے راستے میں کھڑی رہی

☆

ہم میں بھی کوئی رنگ ہو ذوقِ نظر کے ساتھ ساتھ
تم میں بھی کوئی بات ہو شوقِ وصال سے جدا

☆

جانے والے نے مڑ کے دیکھا نہیں
منتظر ہے کوئی کہیں پھر بھی

☆

یہ میرے نصیب کا لکھا تو
پتھر پہ لکیر ہو گیا ہے

☆

جس کا جسم میرا ہے اس کا دل بھی میرا ہو
جب کبھی تجھے دیکھا، یہ خیال آیا ہے

☆

جانے کب سے ترے ہاتھ کی لکیروں میں
میں اپنے نام کی ریکھا تلاش کرتی ہوں
شاعری جھوٹ سہی عشق فسانہ ہی سہی
زندہ رہنے کے لیے کوئی بہانہ ہی سہی

☆

جب کوئی کھو گیا تو لگا تم مجھے
جب کوئی مل گیا لگا تم ہو

ثمینہ راجہ کو ۱۹۹۹ء میں ان کے مجموعہ کلام ''اور وصال'' پر وزیر اعظم ایوارڈ ملا۔ ثمینہ راجہ اپنے عہد میں منافقت' چالاکی اور مصلحت پسندی سے دور اور لوگوں کی بے اعتنائی اور سازشوں سے مقابلہ کرتی ہوئیں ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو راہ عدم سدھاریں۔

☆...... قمر رضا شہزاد (یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء)

قمر رضا شہزاد کا اصل نام سید قمر رضا ہے آپ یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء کو کبیر والا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا حسب ونسب سادات خاندان سے ہے' آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پبلک سروس کمیشن پاس ہیں آپ کی شاعری کے آثار ۱۹۸۰ء سے ملتے ہیں۔ آپ کے شعری اثاثوں میں پیاس بھرا مشکیزہ' ہارا ہوا عشق اور یاد دہانی شامل ہیں جو شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں

بہت مجبور لوگوں میں رہا ہوں
نہیں معلوم کیا تاریک کیا روشن رہے گا

قمر رضا کی شاعری کسی مکتبہ فکر سے نہیں جوڑی جا سکتی۔ ان کی اپنی ایک نئی شناخت ہے وہ سیدھے سادے موضوعات کو خوش اسلوبی سے غزل کی مالا میں پروتے ہیں:

یہ گھاؤ بھر بھی گئے تو کسک نہ جائے گی
محبتوں کی چبھن حشر تک نہ جائے گی
کہاں تھی اتنی مرے دوست وسعتِ دنیا
خدا کا شکر ترا غم سما گیا مجھ میں

☆

نکلنا چاہتا ہوں اپنی ذات سے
مگر یہ دشت پار ہو نہیں رہا

قمر رضا شہزاد نے زبان کی سلاست و روانی کو مقدم رکھا ہے آپ نے خمیدہ مصرعوں کے

بجائے سادہ اور آسان اسلوب کی طرف توجہ دی ہے۔

آئینہ خانۂ گمان کو چھوڑ
تو مرے ذکر، مرے دھیان کو چھوڑ
خلقتِ شہر جھوٹ بولتی ہے
خلقتِ شہر کے بیان کو چھوڑ

بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قمر رضا شہزاد عصرِ حاضر میں جدید ادبی منظر نامے کی موثر آواز ہیں۔آپ کی تخلیقات سے مابعد جدیدیت دور میں اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے:

میں آفتاب نہیں ہوں مگر کبھی شہزاد
مرے مدار میں اس شخص کا ستارا بھی ہو

☆...... اختر عثمان (۱۴ اپریل ۱۹۶۹ء)

اختر عثمان ۱۴ اپریل ۱۹۶۹ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اور ان میں تخلیقات بھی شائع ہو چکی ہیں۔مابعد جدید دور میں اختر عثمان کی شاعری میں مزاحمتی و بغاوتی لہجہ نمایاں ہے آپ کا شمار شاعری کے علاوہ عصرِ حاضر کے ممتاز محققین اور نقادوں میں ہوتا ہے۔آپ کا ایک معتبر حوالہ مرثیہ نگاری بھی ہے۔

تیرا خمیر اٹھاتا ہوں اپنے ملبے سے
تجھے بناؤں تو پھر ٹوٹ کر بناتا ہوں
کوئی لکھتے ہوئے تھکتا نہیں اس عمر کے پرچے
کسی سے ممتحن اوراق چھین لیتا ہے

اختر عثمان بنیادی طور پر کلاسیکل شعر و ادب کے دلدادہ ہیں وہ جدّت پسندی سے کم ہی سروکار رکھتے ہیں۔آج بھی میر، غالب، بیدل، حافظ، خیام اور انیس کو مقدم سمجھتے ہیں۔

یہ کائنات مرے سامنے ہے مثلِ بساط
کہیں جنوں میں الٹ دوں نہ اس جہان کو

نہیں قبول مجھے کوئی بھی نئی ہجرت
کٹاؤں کیوں کسی بلوے میں خاندان کو میں
جھڑتا جاتا ہے جسم روز بہ روز
کوزہ گر کی دکان تک ہو آؤں
رات ڈھلنے کو ہے اور آخری گاڑی والا
مجھ سے کہتا ہے کہ تجھ کو بھی کہیں جانا ہے

اختر عثمان کی شاعری میں جہاں غزل کے روشن مضامین ملتے ہیں وہیں ان کی شاعری میں رثائی ادب بھی جلوہ فگن ہے۔ملاحظہ ہو:

شہر خالی ہے کسے عید مبارک کہیے
چل دیے چھوڑ کے مکہ بھی مدینے والے

آپ کا ایک شعر جو معنویت کے اعتبار سے اپنے عہد کا منفرد شعر ہے

بنتی نہیں ہے عشق کی تبلیغ پر سزا
الزام دوست کوئی سنگین بھی تو ہو

☆...... اجمل سراج (۱۴ اگست ۱۹۶۸......۱۹ ستمبر ۲۰۲۴ء)

گرہ میں دام تو رکھتے ہیں زہر کھانے کو
یہ اور بات کہ فرصت نہیں ہے مرنے کی

منفرد لہجے کے بے باک شاعر اجمل سراج ۱۴ اگست ۱۹۶۸ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک پڑھے لکھے اور صاف گو انسان ہیں۔اجمل سراج کا شمار پاکستان کے ایسے چنیدہ شعرا میں ہوتا ہے، جو اپنے خوش مزاجی اور خوش فکری سے پہچانے جاتے ہیں وہ جب بھی ملتے ہیں، جس سے بھی ملتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے محبت بکھیر رہے ہیں وہ بھی خیریت اور دعاؤں کے ساتھ۔ہر بات پر حوصلہ افزائی ان ہی کا خاصہ ہے۔مابعد جدید غزل کے دور میں ان کی موجودگی ایک اچھے اندازِ سخن کی تکمیل ثابت ہوگی۔اجمل کے خیالات میں پختگی ہے، وہ ایک

ہمدرد انسان اور سادہ دل شاعر ہیں۔ آپ ایک روزنامے میں مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

وہ دن جب اس نے بنایا تھا خاک سے مجھ کو
مرا غرور بھی سب خاک میں ملا دیا تھا

☆

ہمارے سر پہ کوئی آسمان ٹوٹ پڑا
گھڑی جب آئی ستاروں سے مانگ بھرنے کی

خواجہ رضی حیدر کی رائے میں ''اجمل سراج امنگ وترنگ سے غزل کہتے ہیں' ان کے لہجے میں تازہ کاری ہے یہ انتہائی اعتماد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ محسوسات کے شاعر ہیں۔ انہوں نے شعراء کے ہجوم میں اپنی راہیں الگ نکالی ہیں'' اجمل سراج کا انداز سخن ذیل کے اشعار سے جھلکتا ہے:

بہت ملال ہے تجھ کو نہ دیکھ پانے کا
بہت خوشی ہے تری راہ سے گزرنے کی

☆

شام اپنی بے مزہ جاتی ہے روز
اور ستم یہ ہے کہ آجاتی ہے روز

☆

کہہ چکے ہم ہمیں اتنا ہی فقط کہنا تھا
آپ فرمایئے کچھ آپ بھی فرمائیں گے
یہ اداسی کا سبب پوچھنے والے اجمل
کیا کریں گے جو اداسی کا سبب بتلایا

اجمل سراج صحافت سے وابستہ ہیں اور ایک دیانت دار صحافی کی شناخت رکھتے ہیں۔

☆...... سلمان صدیقی (۲۰ نومبر ۱۹۵۷ء)

سلمان صدیقی کا تعلق بدایوں کے مردم خیز خطے سے ہے جہاں کے ادباء وشعراء نے گلشن ادب کی آبیاری دل کھول کر کی ہے۔ سلمان صدیقی کی شاعری مابعد جدیدیت دور میں اسلوب کے اعتبار سے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ساختیات کے رجحان کے معتبر عکاس ہیں۔ آپ ٹی وی اینکر اور بہترین نظامت کار ہیں:

کیسے کیسے رنگ ہیں تنہائی کی تصویر میں
جب کبھی فرصت ملے تب آئینے میں دیکھنا

☆

کتنی چھوٹی سی عمر میں سلمان
گھر سے نکلے تھے ہم بڑے ہوکر

☆

کوئی تدبیر کی تھی یا تم نے
سب دعا ہی پہ رکھ دیا تھا کیا

ڈاکٹر شاداب احسانی کے مطابق ''مجموعی اعتبار سے سلمان صدیقی بحیثیت شاعر کراچی کی آبرو قرار دیے جاسکتے ہیں اور کراچی بھی وہ جسے منی پاکستان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔''

جاذب قریشی کہتے ہیں کہ ''سلیمان محبوب اور محبتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے خواب دیکھتا رہا وہ رات بھر مٹی کا چراغ بن کر پرچھائیوں سے جنگ کرتا اور آسمانوں میں ایسا ستارہ تلاش کرتا جو اس کے حسب حال ہو لیکن خواب ادھورے رہے جسم و جان والے تجربوں نے اسے دکھ ہی دیئے۔''

☆...... ریحانہ روحی

ریحانہ روحی کو شاعری سے عشق ہے۔ اس کے کلام میں روح کی سچائی کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے ریحانہ روحی کی غزل جدیدیت کے رنگ سے سجی ہوئی ہے ڈاکٹر جمیل جالبی نے آپ کو

عہد حاضر کی آواز کہا جبکہ پیرزادہ قاسم کے مطابق ریحانہ روحی بے دھڑک شعر کہنے کا فنکارانہ سلیقہ جانتی ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو تنہا یوں ہی رہتے رہتے
رفتہ رفتہ مجھے تنہائی کی عادت ہو جائے

☆

ہے آدھے شہر میں بارش تو آدھے شہر میں دھوپ
ہوا علاقہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

☆

اب ترے ساتھ مرا جی نہیں لگتا سائیں
تو نے پوچھا تھا نمی آنکھ میں کیوں ہے' یوں ہے

☆

اب سیکھنی پڑے گی ہمیں بھی منافقت
اس کے بنا کہیں بھی گزارا نہیں ہے بھائی

آپ کے شعری اثاثہ میں عشق زاد اور میں تنہا بہت۔تم میری کمزوری ہو۔دوست بنانے سے پہلے سوچا ہوتا' شامل ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی' ریحانہ روحی کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''ریحانہ روحی کی شاعری کا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل کر آہستہ آہستہ اپنی روشنی سے باغ کو منور کر رہا ہے ان کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عہد حاضر کی آواز اتنی واضح ہے کہ ان کا شعر دل میں اتر جاتا ہے۔ان کی شاعری تنہائی کی واردات کی گرہ اس طرح کھولتی ہے کہ تنہائی کا احساس پڑھنے والے کے وجود میں اتر جاتا ہے۔''

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے مطابق ''ریحانہ روحی کا لہجہ زیر لبی نہیں بلکہ نڈر بے روک اور بڑی حد تک جہری ہے۔ تہ داریوں میں پردے پردے بات نہیں کی گئی یہ راست اظہار اور نمایاں

لہجے کی شاعری ہے اور یہی اس کی دل کشی اور شناخت ہے۔''

ایسا نہیں ہے کہ آدمی اچھا نہیں ہے وہ
جیسا ہمارا خواب تھا ویسا نہیں ہے وہ

☆

وہ جو اک شہر ہے پانی کے کنارے آباد
اپنے اطراف میں دلدل نہیں ہونے دیتا

حالات حاضرہ اور عالمی وبا کے حوالے سے ریحانہ روحی کا ایک شعر

زمیں پر خدائی سبق ہے ''کورونا''
کہ انساں یہاں پر خدا ہوگئے ہیں

☆...... ڈاکٹر فرحت عباس (۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء)

میرا شعور ، مری فہم ، تو مرا ادراک
ترے سوا میں کسی اور سے ملوں کیسے

ڈاکٹر فرحت عباس دو طرح سے ڈاکٹر ہیں۔آپ ایم بی بی ایس بھی ہیں اور پی ایچ ڈی بھی۔ڈاکٹر فرحت عباس ۲۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئے بہاول پور اور راولپنڈی' اسلام آباد کی ادبی فضاؤں کا ذکر ڈاکٹر فرحت عباس کے بغیر ادھورا ہے۔آپ کی شاعری میں جذبات کا عنصر نمایاں ہے۔جو دل کے دروازے کھلا رکھتا ہے ان کا کلام دل میں زبردستی اتر جاتا ہے سادگی سے بڑے اور عمدہ مضامین کو شامل غزل کرنا ان کا خاصہ ہے انداز سخن ملاحظہ فرمائیے

تقسیم ہو رہی تھی متاعِ وفائے عشق
ہم مطمئن تھے اور تمہیں دیکھتے رہے
وہ جن میں تذکرہ تھا زندگی کا
وہ گم گشتہ شمارے مل رہے ہیں
فرحت نظر ملا کے اسے دیکھ لوں ذرا
جس نے ابھی کہا ہے مجازی خدا مجھے

میں اپنی ذات کو مسمار کرنے والا ہوں
فنا سفر میں یہ سکے چلے نہ چلے

آپ کے شعری اثاثہ جات میں یہ عشق، بھیگتی پلکیں، زلف دراز، اور فردیات فرحت شائع ہو چکی ہیں جبکہ تنقیدی کتاب خراج خامہ اور معنی کی محبت میں شائع ہو چکی ہیں ڈاکٹر فرحت عباس کا دل عشق نبی سے سرشار ہے اور وہ خوبصورت نعت کہتے ہیں ان کی نعت کا ایک شعر

شہرِ نبیؐ ہو گنبدِ خضریٰ ہو اور میں
پروردگار شان تری دیکھتا رہوں

☆...... ڈاکٹر ذوالقرنین احمد، ڈاکٹر شاداب احسانی (۱۴ اگست ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر شاداب احسانی اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ آپ استاد اساتذہ ہیں آپ کے زیرنگرانی تقریباً ۳۲ ڈاکٹریٹ ہو چکی ہیں۔ آپ مابعد جدید غزل کے دور میں ایک نامور ادیب، نقاد، ماہر علم عروض، شاعر، وسیع المطالعہ استاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ روایت کے امین جبکہ جدید اور مابعد جدید دور کے استاد ہیں حالیہ چند سالوں میں آپ کی ''پاکستانی بیانیہ'' پر کاوش مستقبل میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

نمونہ کلام:

دیا ہوا سے مجھے روز کیا ضروری ہے
کوئی کسی سے ملے روز کیا ضروری ہے
اک تجھے دیکھنے کی حسرت میں
دونوں آنکھوں سے دل کا کام لیا
ہر حقیقت کا خواب ہوتا ہے
غنچہ کھل کر گلاب ہوتا ہے
ہے میسر مجھے چراغ مگر
آفتاب آفتاب ہوتا ہے

معلوم نہیں کون کہاں جاگ رہا ہے
میں جاگ رہا ہوں تو جہاں جاگ رہا ہے
رنج و غم کا سفیر ہو کے دیکھ
آئینہ باضمیر ہو کے دیکھ
خاصیت ہیں عناصر و اسباب
اصل کیا چیز ہے خمیر ہو کے دیکھ
اس کڑی کا بھی سلسلہ ہے کوئی
اب ذرا ناگزیر ہو کے دیکھ
کوئی اپنا نہیں زنداں میں
رفتہ رفتہ اسیر ہو کے دیکھ
کر قناعت سرائے فانی میں
اور جہاں راہگیر ہو کے دیکھ
بادشاہت کے خواب دیکھ ضرور
لیکن ادنیٰ وزیر ہو کے دیکھ
بے یقینی ہے ہر طرف شاداب
خود ہی اپنا مشیر ہو کے دیکھ

☆...... سحر تاب رومانی (۳ مارچ ۱۹۶۵ء)

سحر تاب رومانی ۳ مارچ ۱۹۶۵ کو خیر پور میں پیدا ہوئے۔ سحر تاب رومانی کی شاعری میں وہ بنیادی خد و خال نمایاں ہیں جو حضرتِ انسان امید و یاس کے سمندر میں تلاش کرتا ہے وہ مابعد جدید غزل کے دور میں اپنی شناخت ایک منفرد اسلوب سے بنا رہے ہیں۔ ان کی فکری اساس آس پاس میں رونما ہونے والے واقعات سے جو لازماً معاشرتی احساس سے مالا مال ہے۔ سحر تاب رومانی مابعد جدید غزل کے شاعر ہیں اور غزل میں لہجے اور لفظیات میں جدّت پر

یقین رکھتے ہیں نت نئے قوافی کا استعمال ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ایسے قوافی جو اپنا وجود لغت میں تو رکھتے ہیں مگر لوگوں کی سماعتوں سے مفقود ہو چکے ہیں اور فی زمانہ ان کے ہم عصروں میں کم سے کم پائے جاتے ہیں:

شوق جسے تھا میرے برابر ہونے کا
وہ بھی ہو کر میرے برابر ٹوٹ گیا
☆
شائستگی بھی سیکھیں گے تو بدتمیزوں سے
یعنی ادب پڑھائیں گے کچھ بے تمیز لوگ
☆
مجھے وہ نور میسر ہے جس سے دیر تلک
میں اپنی شب کو سحر تاب دیکھ سکتا ہوں
☆
مشقِ سخن میں لوگوں کی عمریں تو کٹ گئیں
لیکن غزل پہ آج بھی جوبن نہ آ سکا

☆...... ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی (۱۱ مئی ۱۹۶۵ء)

فہیم شناس کاظمی ۱۱ مئی ۱۹۶۵ء کو نوابشاہ میں پیدا ہوئے آپ کا تعلق شعبہ درس و تدریس سے ہے آپ کا شمار جدید نظم کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے صحافت کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہے ہیں جسارت اور قومی اخبار کے علاوہ دیگر رسائل و اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔شناس اپنے مطالعے کو انتہائی باریک بینی سے استعمال کرتے ہیں۔ان کا انداز بیان خوش اسلوب ہے آپ نے ڈاکٹر شاداب احسانی کی زیر نگرانی ''عزیز حامد مدنی کی شخصیت و فن'' پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔آپ کا رنگ سخن ملاحظہ کیجیے:

یہاں سے ٹھیک کچھ بھی دیکھا نہیں
کٹی زندگی اپنی دوپہر میں

☆
غم کی بارش کیسے ٹوٹ کے برسی ہے
دل کے دشت میں ہر جانب ہریالی ہے
☆
خود اپنے ہونے کا ہراک نشاں مٹا ڈالا
شناس پھر کہیں موضوعِ گفتگو ہوئے ہم

ایک نظم سے اقتباس:

ہم کسی راستے پہ چلتے ہوئے
داستاں سے اگر نکل جائیں
پھر ہمیں تم تلاش مت کرنا
داستاں سے نکلنے والوں کو
کوئی رستہ بھی راہ، نہیں دیتا
وہ سمندر زمیں ہو یا افلاک
کوئی ان کو پناہ دیتا نہیں

☆...... جمال احسانی (۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء تا ۱۰ فروری ۱۹۹۸ء)

دھیمے لہجے کے منفرد شاعر جمال احسانی ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔آپ نزاکتِ خیال کے حامل شاعر تھے۔ان کی شاعری میں محرومی' انکسار' عاجزی' بے اطمینانی کا دور دورہ ہے مگر وہ ان واپنی شاعری یا خود پر طاری ہونے نہیں دیتے تھے۔عام فہم اور سادہ الفاظ استعمال کیے اور ایک روایت سے جڑے رہنے کے ساتھ جدید اور مابعد جدید دور میں اردو غزل کے سفر کو چار چاند لگا دیئے ان کا سادہ مگر پر اثر لہجہ مدتوں یاد رہے گا۔

نمونہ کلام:

ہزار طرح کے تھے رنج پچھلے موسم میں
پر اتنا تھا کہ کوئی ساتھ رونے والا تھا

☆

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا
یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا

☆

ہوا نہ جانے کہاں لے گئی وہ تیر کہ جو
نشانے پر بھی نہ تھا اور کمان میں بھی نہ تھا

☆

اک سفر میں کوئی دوبارہ نہیں لٹ سکتا
اب دوبارہ تری چاہت نہیں کی جاسکتی

☆...... عباس تابش (۱۵جون ۱۹۶۱ء)

عباس تابش ۱۵ جون ۱۹۶۱ء وہاڑی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کی پہچان ان کا ماں کی شان میں کہا ہوا شعر بن گیا ہے:

ایک مدّت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

عباس تابش اپنے شعری سفر کے حوالے سے عہد حاضر کی غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ذاتی تجربات کے ساتھ عہد حاضر کے مسائل فراوانی سے زیر بحث رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ عباس کو اپنی زندگی ہی میں پذیرائی مل رہی ہے۔ محبت، ہجر، فراق، کسک، اضطراب، جمالیات غرض کہ ہر ایک موضوعِ سخن آپ کی شاعری کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے بقول عطا الحق قاسمی ''عباس تابش عصرِ حاضر کی شاعری میں برانڈ نیم (Brand name) ہے۔''

نمونہ کلام

جب بن گیا تو اس کی دنیا مثال دے گی
تعمیر ہو رہا ہے ملبے سے گھر ہمارا

عشق نے ظالم کمانے کی اجازت ہی نہ دی
ورنہ یہ شہرِ ستم ایک نوالہ تھا مرا

☆

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

☆

اتنا آسان نہیں ملاح کا بیٹا ہونا
ناؤ ڈوبی تو مرے ہاتھ میں چپو آئے

☆...... عارف عبدالمتین (یکم مارچ ۱۹۲۳ء تا ۳۰ جون ۲۰۰۱ء)

عارف عبدالمتین کا شمار اردو اور پنجابی زبان کے ممتاز شعراء اور نقادوں میں ہوتا ہے نیز آپ کئی رسائل کے مدیر بھی رہے۔ آپ کا تعلق گو کہ بائیں بازو کی ادبی تحریک ترقی پسند تحریک سے تھا مگر آپ کی شاعری میں مزاحمت، تصوف، اور غزل کے مضامین یکساں نظر آتے ہیں۔ ان کے افکار میں حساسیت، ایثار و قربانی کا جذبہ جا بجا ملتا ہے۔ نیز ان کا رنگ تغزل ان کی شاعرانہ ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

زمیں سے تا بہ فلک کوئی فاصلہ بھی نہیں
مگر افق کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں

☆

بانٹ جی بھر کے اسے دہر کے صحراؤں میں
پیار دولت تو نہیں ہے کہ جو گھٹ جائے

☆

ہوئی ہیں خونِ بشر سے جو کھیتیاں سیراب
اگے ہیں ان سے کبھی مہر تو کبھی مہتاب

☆

چلی جو بادِ حوادث تو دل نے تن کے کہا
یہ شاخ ٹوٹ تو سکتی ہے جھک نہیں سکتی

☆

ہے اجالا اس قدر سورج کبھی نکلا نہ تھا
یوں تو شب کو بھی اندھیرا تھا' مگر اتنا نہ تھا

☆...... شکیب جلالی (یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء تا ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء)

سید حسن رضوی جنہیں ادبی دنیا شکیب جلالی کے نام سے جانتی ہے' آپ برصغیر کے علمی گہوارے علی گڑھ میں پیدا ہوئے' ابتدائی عمر میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔شکیب نے اردو غزل کو نیا لہجہ عطا کیا۔اُن کی شاعری ندرت وسلاست کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر جعفر کے مطابق ''شکیب جلالی کا کلام عصری حسیت سے بھرپور ہے' ان کے لہجے میں کلاسیکیت اور جدیدیت بھی ہے' فنی بالیدگی بھی ہے اور انسان دوستی بھی۔شکیب جلالی کی طرح کے شاعر اپنے کلام کی تہہ داری اور معنویت کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

شکیب جلالی کی شاعری میں حقیقت' سچائی کا عنصر نمایاں ہے۔وہ فریب وریاکاری سے دور نظر آتے ہیں۔ان کے کلام میں مبالغہ آرائی یا تصنع کے بجائے سچے جذبات' زندگی کے سوز وگداز' اثر آفرینی کے طور پر ہر جگہ اپنا وجود رکھتی ہے۔

اردو شاعری میں شکیب جلالی کا یہ شعر حرماں نصیبی' ہجر' حزن وملال کی پہچان بن گیا ہے۔

تو نے کہا تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

☆

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ لٹکتی تلوار گرے

☆

موسمِ گل ہے ' بھری برسات ہے
جام چھلکاؤ اندھیری رات ہے

☆

پہلے تو میری یاد سے آئی انہیں حیا
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو

☆

ملبوس خوش نما ہیں مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پہ

☆...... تنویر سپرا (۱۹۲۹ء تا ۱۳ دسمبر ۱۹۹۳ء)

تنویر سپرا کا نام محمد حیات ولد غلام محمد سپرا تھا' وہ پنجاب کے علاقے جہلم میں پیدا ہوئے۔وہ ایک مزدور گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ابتدائی زندگی کا آغاز نہایت کسمپرسی اور مزدوری سے ہوا نیز پاکستان ٹوبیکو کمپنی جہلم سے بھی منسلک رہے۔ طارق عزیز کے مطابق ''تنویر سپرا کی غزل مجروح غزال کی چیخ نہیں بلکہ شیر کی دھاڑ ہے بلاشبہ لفظ کھردرے ہیں مگر اس کی شاعری دنیا بھر کے محنت کشوں کی پہچان ہے۔''

تنویر سپرا کہتے ہیں کہ میری شاعری افلاکی نہیں خاکی ہے کیونکہ میں فلک زاد نہیں خاک زاد ہوں اور یہی میری پہچان ہے۔نمونہ کلام:

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بے بال وپر ہوں میں
پہرے بٹھا رہا ہے وہ میری اڑان پر

☆

میری غزل میں اس لیے دریا کا شور ہے
لکھتا ہوں میں شعر بیٹھ کے جہلم کے گھاٹ پر

☆

جس جس کے پاس جو نہیں کر وہ عطا اسے
ملا کو روح کی مجھے تن کی غذائیں دے

☆

اپنی چادر کی طوالت دیکھ کر پاؤں پسار
بوجھ سر پر لادنے سے قبل سر کو دیکھ لے

☆...... سلیم احمد (۲۷نومبر ۱۹۲۷ء تا یکم ستمبر ۱۹۸۳ء)

منفرد لہجے کے شعری اسلوب کے حامل سلیم احمد اردو ادب میں ایک شاعر، نقاد، ڈرامہ نویس، کالم نگار اور فلمی کہانی نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ ایک روایت پسند شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں مگر آپ کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ جدید اور مابعد جدید شاعری کے لوازمات بدرجہ اتم موجود ہیں کیوں کہ وہ جابجا اظہار رائے کی آزادی اور اختلاف رائے کو انسان کا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد شاعری کے ساتھ ساتھ انتقادی میدان میں اپنا لوہا منوایا اور اپنی ذہانت اور نکتہ رس طبیعت سے نئے اسالیب اور نئے مضامین تلاش کیے اور اپنی ادبی شناخت بنائی:

دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنہیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
غنیمِ وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

☆

اگر کسی سے کہوں بھی تو کون مانے گا
جو گم ہوا ہے زمیں میں وہ ایک دریا تھا

☆

چلی ہے موج میں کاغذ کی کشتی
اسے دریا کا اندازہ نہیں ہے

قطعہ

کسی ذرے کو تابندہ کیا ہے
کسی لمحے کو پائندہ کیا ہے
فنا سے صرف وہ چیزیں ہیں محفوظ
محبت نے جنہیں زندہ کیا ہے

☆...... منیر نیازی (۱۹اپریل ۱۹۲۸ء تا ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء)

کج انج وی راہواں اوکھیاں سَن
کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوگ وی ظالم سَن
کج سانوں مرن دا شوق وی سی

اس کلام کے سماعتوں سے ٹکرانے سے فقط منیر نیازی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے پھر ان کی مشہور نظم ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں، ہر کام کرنے میں'' کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے منیر نیازی کا شمار اردو اور پنجابی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے کلام کے ذریعے اپنی زندگی میں ہی شہرت پائی۔ انہوں نے فلمی نغمے لکھ کر بھی خوب دھوم مچائی۔ ڈاکٹر افتخار شفیع کے مطابق ''منیر نیازی بیسویں صدی کی اردو شاعری کی اہم ترین آواز ہیں ان کا شعری لب ولہجہ اپنی انفرادیت کے ساتھ ہمیشہ انہیں نمایاں مقام عطا کرے گا۔''

منیر نیازی کے کلام میں اپنائیت کے جذبات اور محبت کا احساس جاگزیں ہے:

اپنے گھروں سے دور بنوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لوگو
کبھی کبھی جب وقت ملے تو اپنے گھر بھی جاتے رہنا

☆

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں اک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

☆

جو مجھے بھلا دیں گے میں انہیں بھلا دوں گا
سب غرور ان کا خاک میں ملا دوں گا

☆...... اقبال ساجد (۱۹۳۲ تا ۱۸ مئی ۱۹۸۸ء)

اردو شاعری کے دشت غربت میں رہ کر اپنی شناخت بنانے والے اقبال ساجد نے یو پی ہندوستان میں آنکھ کھولی۔ سرسری تعلیم حاصل کی مگر ان کی شاعری کے فیض سے کئی لوگ قادر الکلام شاعر کہلائے اقبال ساجد نے نازش حیدری کی شاگردی اختیار کی۔ شاعری کے جدید اور مابعد جدید دور میں اقبال ساجد کا شمار ندرتِ خیال اور نکتہ آفریں شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی زندگی مصائب و آلام کی طویل داستان ہے جو ان کی شاعری میں جھلکتی ہے:

نمونہ کلام:

مفت میں تقسیم کی ساجد متاعِ شاعری
جس نے اپنا قرب اپنایا وہ شاعر ہوگیا

☆

لہجے کی تیز دھار سے زخمی کیا اسے
پیوست دل میں لفظ کی سنگین ہم نے کی

☆

اس نے بھی کئی روز سے خواہش نہیں اوڑھی
میں نے بھی کئی دن سے ارادہ نہیں باندھا

☆

مارا کسی نے سنگ تو ٹھوکر لگی مجھے
دیکھا تو آسماں تھا زمیں پر پڑا ہوا

☆...... خالد علیگ (۱۹۲۳ء تا ۱۵ اگست ۲۰۰۷ء)

آپ انجمن ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے والے خالد علیگ پیشے کے اعتبار سے سول

انجینئر تھے مگر انجینئرنگ کے ساتھ انہوں نے صحافت اور شاعری کے میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ آپ ایک خوش فکر ادیب تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مزاحمتی و انقلابی لہجہ اپنایا یہی ان کی شناخت ہے آپ کو عوامی شاعر بھی کہا جاتا ہے آپ کی شاعری پسماندہ اور جبر و استبداد میں پسے ہوئے لوگوں اور سچے جذبوں کی آواز ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمتی رنگ نمایاں ہے آپ کا انداز بیان سادہ اور عام فہم ہے نمونہ کلام:

میرا قصور میری خطا جاگتا ہوں میں
ہاں درمیانِ کرب و بلا جاگتا ہوں میں
اس دور میں گر سو گئے سب مصلحت شناس
ہر چند جاگنا ہے پڑا جاگتا ہوں میں

☆

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

☆

بجھتا ہوا اک دیپ سہی ہم، ہمیں پھر بھی
جب تک کہ نہ ہوجائے سحر ساتھ میں رکھنا
موتی تو نہیں تھے کوئی پلکوں سے جو چنتا
ہم آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح تھے

☆...... سید سبط علی صبا (۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء تا ۱۴ مئی ۱۹۸۰ء)

کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے سید سبط علی صبا کا ذیل کا شعر ان کی شاعری میں ان کی شناخت بن گیا ہے اور شاید ہی اہلِ فن و ادب اس شعر کو بھلا سکیں گے:

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

سید سبط علی صبا کی شاعری کی بنیاد محفل عزا اور رثائی ادب سے ہے۔ سلسلۂ معاش میں آپ پاکستان آرمی اور واہ آرڈی ننس فیکٹری سے وابستہ رہے۔ اپنی شاعری میں مسائل و مصائب میں پسے افراد کے احساسات و جذبات کو سمویا ہے اور ہر شعر میں ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اور ریاضت شامل ہے۔ صبا ایک محبِّ وطن شاعر تھے انہوں نے ارضِ پاک کے لیے جنگ بھی لڑی اور سلسلۂ معاش کے لیے نوکری بھی کی۔ سبط علی صبا کی غزلوں میں جہاں ذاتی محرومیوں کا ذکر ہے وہیں ماحول کی اداسی افسردگی اور اضطراب کی لہر انہیں بے چین کیے رکھتی ہے۔

نمونہ کلام:

زنداں پہ تیرگی کے ہیں پہرے لگے ہوئے
پُر ہول خواب گاہ میں نیند آئے کس طرح
جب چلی ٹھنڈی ہوا بچہ ٹھٹھر کر رہ گیا
ماں نے اپنے لعل کی تختی جلادی رات کو
جو سوت کاتنے میں رات بھر رہی مصروف
اسی کو سر کے لیے اوڑھنی نہیں ملتی
عجیب سوچ ہے اس شہر کے مکینوں کی
مکاں نئے ہیں مگر کھڑکیاں پرانی ہیں

☆...... علمدار حسین اسلم (۲۶ ستمبر ۱۹۵۵ء)

علمدار حسین اسلم کے والد کا نام الٰہ دین تھا۔ آپ کا تعلق لکھنؤ ہندوستان سے ہے علمدار حسین اسلم کی پیدائش کراچی کی ہے، بچپن ہی سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہے دوران تعلیم ذیل کا شعر موزوں کیا:

مثلِ آئینہ گِر کے ہاتھوں سے
ہم تیرے فرش پر بکھر جاتے

آپ نے شعری سفر اذفر زیدی کے زیرِ سایہ شروع کیا: ''علمدار کے مطابق اذفر زیدی

کی صحبت نے میرے ذوق کو کافی حد تک تقویت بخشی اور شاعری کی اونچ نیچ بھی بتائیں مجھے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کا سہرا بھی اذفر زیدی کے سر ہے''

عصر حاضر کے غزل گو شعراء میں علمدار حسین اسلم کو تغزل کے ساتھ جدیدیت میں بھی کمال حاصل ہے۔ آپ ایک ادب نواز اور ادب کی سرپرستی کرنے والے شاعر ہیں۔ اردو لٹریری ایسوسی ایشن کے بانیوں میں آپ کا نام شامل ہے۔ نمونہ کلام:

سچائی کا خوگر ہوں سچ لکھتا رہوں گا میں
جب تک مری گردن سے شمشیر نہیں ملتی

☆

کس طرح عام ہوئیں شہر میں گھر کی باتیں
کون تھا کان لگائے ہوئے دیوار کے ساتھ
دن ڈھلا شام ہوئی پر خمار اس کا نہ گیا
جانے کس شوخ سے یہ آنکھ لڑی تھی کل شب

☆

کیا بتائیں کیا لکھا دیوار پر
آئینہ لٹکا دیا دیوار پر

☆...... اذفر زیدی

سید اذفر زیدی کا تعلق سونی پت کے سادات گھرانے سے تھا' آپ کے بھائی سید شبر علی حیرتؔ صاحبِ بیاض شاعر تھے، جبکہ والد محترم نواب غضنفر علی عنصر بھی قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے والد صاحب کا کلام ''باقیاتِ غضنفر'' کے عنوان سے سید شبر زیدی نے شائع کروایا تھا۔ اذفر زیدی کا شمار زود گو شعراء میں ہوتا ہے۔ رئیس امروہوی کے مطابق ''اذفر کا شمار ہمارے عہد کے جید اور مستند اساتذہ میں ہوتا ہے آپ کا تعلق دلی مرحوم کے ایک ممتاز ترین علمی و ادبی خاندان سے ہے۔ جناب اذفر استادِ فن اور نکتہ طرازِ سخن ہیں۔''

رسا شیروی کہتے ہیں کہ ''جس طرح غالب نے غزل، مثنوی، قصیدہ، منقبت، نعت اور مرثیے میں طبع آزمائی کی ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اذفر نے ان اصناف سخن میں ایک بڑا ذخیرہ تصنیف فرما کر زبان اور ادب میں معتدبہ اضافہ کیا ہے''

مستان جون پوری نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے

اک ہم ہیں کہ بجھا دیتے ہیں چراغ
اک وہ ہیں کہ سرِ راہ جلاتے ہیں چراغ

ظفر زیدی کا خراج تحسین

جامی ، اسلم ، انیس یا قیصر
سب دلوں کا قرار ہے اذفر

نمونہ کلام:

صبح کے وہ طرب انگیز نظارے اذفر
مجھ کو میخانے کے مینار نظر آئے

☆

برہمی چھانے لگی بیگانگی ہونے لگی
ہوش بھی کتنا ہوا رفتار سے کچھ تو کہو
آپ کی یاد آ رہی ہے مجھے
آج فرقت جلا رہی ہے مجھے
یہ چلن ہمارا چلن ہوا یہ جنوں ہمارا جنوں ہوا
جو گذر رہی ہے بری بھلی کوئی تم سے کہنے کی بات ہے
وہ زمانہ اور تھا اپنی ضرورت تھی مجھے
آپ نے سمجھا کہ اب تھی اتفاقاً ایک دن

اور رسالتمآب ؐ سے اذفر زیدی کا اظہارِ مودت ملاحظہ کیجیے

پھر کس طرح سے غیر کی ہم پیروی کریں
جبکہ رسولِؐ پاک کی سیرت ہے آئینہ

☆...... رانا خالد محمود قیصر (راقم الحروف)......(۱۲دسمبر۱۹۶۱)

بندۂ ناچیز کا تعلق پڈعیدن شہر ضلع نوشہرو فیروز۔سندھ سے ہے والد محترم حافظ برکت علی کرنالوی ایک علم دوست اور ادب پرور عالم تھے، آپ مولانا عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا عبدالعزیز صاحب مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد تھے۔ شاعری کے اعتبار سے رموز واوقاف استاد محترم اذفر زیدی نے بتائے، اُن کی شاگردی کا اظہار برملا کیا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد مشورۂ سخن علمدار حسین اسلم سے رہتا ہے۔ میری شاعری کا محور کیا ہے۔ کیا لکھتا ہوں، یہاں لکھنا اصولوں کے خلاف ہوگا کیونکہ یہ کام قارئین اور نقاد حضرات کا ہے۔

نمونۂ کلام حاضر ہے

انسانیت پر آدمی مشکل سے آج کل
معیار پر اترتا ہے ہندسوں کے درمیاں

☆

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے سفر بھی اپنا
اپنا ہر ایک قدم اک نئی منزل سے اٹھا
اک بات اس طرح لکھی نقش ہوگئی
تحریر کہہ رہی ہے کہ وہ بھی ادیب ہے

☆

زاویئے ان کی نگاہوں کے فقط دیکھے تھے
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

☆

یہ اور بات ہے ہم سے ملا رہے ہیں نظر
ابھی تو دیر لگے گی انہیں منانے میں

☆

یقین آئے بھی تو کس طرح یقیں آئے
تمہاری بات اگر یا مگر کی زد میں ہے

☆

یاد آئے تری زلفوں کے بھی سائے ہم کو
تھک کے جب بھی کسی دیوار کو دیکھا ہم نے

☆

یہ دیکھنے میں آیا وہی ٹھوکروں میں ہے
اپنی جگہ سے کوئی جو پتھر بھی ہل گیا

☆...... تابش دہلوی۔۹ نومبر ۱۹۱۱ء تا ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء

مسعود الحسن، تابش دہلوی ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ دبستانِ دہلی کے آخری روایت پسند شعراء میں سے ایک اہم شاعر تھے۔ تابش دہلوی شاعر ہونے کے ساتھ براڈ کاسٹر بھی تھے۔ آپ کی وجہِ شہرت غزل اور ریڈیو پر براڈ کاسٹنگ تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ حیدر آباد دکن سے ثانوی اور ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری ۴۷ سال کی عمر میں حاصل کی۔ آپ ۱۹۳۹ء سے ہی ریڈیو انڈیا سے وابستہ تھے۔ امتیاز کی بات یہ ہے کہ تابش کا آڈیشن پطرس بخاری نے کیا تھا۔ پاکستان ہجرت کے بعد ریڈیو پاکستان کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ ابتدائی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے فانی بدایونی سے اصلاحِ سخن لی۔ غزل، حمد، نعت، مرثیہ، ہائیکو، آزاد نظم، گیت اور قومی و ملی نغموں کے شعبہ جات میں طبع آزمائی کی۔ آپ کے شعری اثاثہ جات میں دیدہ باز دید (مضامین) نم روز (شاعری) چراغِ سحر (شاعری) غبارِ انجم (شاعری) تقدیس (شاعری) ماہِ شکستہ (شاعری) دھوپ چھاؤں (شاعری) شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی علمی، ادبی و شعری خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۹۸ء میں تمغۂ امتیاز سے نوازا۔ آپ کا اندازِ سخن:

مجھ سے کھو گئی شناخت مری
بھیڑ میں ڈھونڈنے کہاں جاؤں

☆

اس کا دامن میرا گریباں ہو
جب کہیں دسترس میں آتا ہے

☆

بارِ حیات اٹھائیے تنہا اٹھائیے
یہ بوجھ آپ سے اٹھتا نہیں اٹھائیے

☆

غم کہاں ملتا ہے دل کے بدلے
اتنی قیمت میں یہ مال اچھا ہے

☆

چھوٹی پڑتی ہے اَنا کی چادر
پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے
محرومیوں میں خوب پناہیں تلاش کیں
میں تھک گیا جہاں اُسے منزل کیا گیا

تابش دہلوی ایک عہد ساز شاعر تھے، وہ روایت کو نبھاتے رہے مگر روایت کے ساتھ عصری موضوعات کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو اپنی آخرت کو جا ملے۔

شاہوں کی بندگی میں سر بھی نہیں جھکایا
تیرے لیے سراپا آداب ہو گئے ہم

☆...... نازش حیدری۔ یکم جون ۱۹۱۴ء تا ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء

محمد خورشید حسن یکم جون ۱۹۹۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی

سے تھا۔آپ کا قلمی/ادبی نام نازش حیدری تھا۔حیدری بہ نسبت جناب حیدر دہلوی استعمال کرتے تھے۔آپ حیدر دہلوی کے جانشین مانے جاتے ہیں جبکہ نازش حیدری کی جانشینی معروف خلائی سائنسدان وشاعر ظفر محمد خان ظفؔر کے حصے میں آئی ہے۔نازش حیدری کے بھائی انور دہلوی بھی شاعر تھے۔ملازمت کے سلسلے میں ایران،عراق اور فلسطین میں خدمات انجام دیں۔آپ روزنامہ جنگ کراچی سے بھی وابستہ رہے۔

آپ کی شعری کاوش صدیوں کا سفر مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہے۔راقم کا نازش حیدری کی صدارت میں اور انور دہلوی کے ساتھ مشاعرہ پڑھنے کا موقع ۱۹۸۲ء میں ملا تھا۔
نازش حیدری کی شعری فکر کے بارے میں خیام العصر حضرت محسؔن اعظم محسن ملیح آبادی کی رائے
''نازش حیدری شعر وادب کی دنیا کا ایک بڑا نام ہے۔اردو شعراء میں ان کا شمار صفِ اوّل کے ممتاز ومنفرد شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ جدید ونیم جدید طرزِ فکر میں جدید اسلوبِ بیان کے شاعر تھے۔شاعری میں اُن کا لب ولہجہ نہایت توانا اور ندرت آفریں ہے وہ اپنے معاصرین میں غزل کے فکر انگیز شاعر تھے۔''

نازش حیدری کی صاحبزادی ناصرہ اختر نے بہ توسط ''خادمِ ادب'' یٰسین خان بہار نازش حیدری کا نعتیہ کلام چراغِ عرش ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔
نازش حیدری کا نذرانہ عقیدت بحضور سرورِ کونینؐ

دُرود اس پہ جو ممدوح ہے، مِرا نازشؔ
سلام اُس پہ ، کیا جس نے دین کو اکمل

نازش حیدری کا غزلیہ اندازِ سخن

موت گذری ہے زیست کو چھو کر نازش
میری تخلیق میں اب جان رہے یا نہ رہے

☆

آتی ہے لڑکھڑاتی ہوئی صبح میری سمت
سورج کے پاؤں سے کوئی کانٹا نکال دے

☆

فریبِ وقت نے گہرا حجاب ڈالا ہے
وہاں بھی شمع جلادو جہاں اجالا ہے

اردو نثر و شعر کا زود گو شاعر ۱۷؍فروری ۱۹۸۴ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔

☆...... ظفر محمّد خان ظفؔر (۱۵؍دسمبر ۱۹۴۲ء)

خاندانی نام ظفر محمّد خان، تخلص ظفؔر اور قلمی نام ظفر محمّد خان ظفؔر ہے۔آپ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی محمّد زبیر خان (زبیؔر حیدری) اور والدہ محترمہ کا نام ذاکیہ بیگم ہے، زبیؔر حیدری، حضرت خیّام الہند سیّد جلال الدّین حیدر دہلوی کے جلیل القدر شاگرد تھے۔ظفر ۱۵؍دسمبر ۱۹۴۲ء کو ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے (۵۶۴) میٹرک فرسٹ ڈویژن میں گورنمنٹ انٹر کالج ٹونک (بھارت) سے ۱۹۵۸ء میں اور انٹرمیڈیٹ ڈی' جے سائنس کالج' کراچی سے ۱۹۶۱ء میں کیا۔بی ایس سی آنرز ایم ایس سی (فزکس) فرسٹ ڈویژن، جامعہ کراچی سے ۱۹۶۵ء میں کیا جبکہ ایم ایس سی (فزکس) کی ڈگری یونیورسٹی آف سیسکچوان، ساسکٹُون کینیڈا سے ۱۹۷۳ء میں حاصل کی۔کینیڈا میں قیام کے دوران (۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء) متذکرہ یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔آپ کو حضرت نازؔش حیدری' دہلوی سے شرفِ تلمذ اور ان کی جانشینی کا اعزاز حاصل ہے۔خلائی سائنسی شاعری ظفر محمد خان ظفؔر کا اختصاص ہے۔ظفر محمد خان ظفؔر نے ۲۴؍دسمبر ۱۹۶۶ء کو قومی خلائی ادارے سُپارکو میں سائنٹفک آفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۱۵؍دسمبر ۲۰۰۲ء کو بحیثیت جنرل منیجر ریٹائر ہوئے۔سُپارکو کی ملازمت سے پہلے ایس ایم سائنس کالج، جناح کالج اور جامعہ کراچی کے شعبۂ فزکس میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔

اَدبی حوالے سے آپ کا شمار سائنسی فکر کو غزل کے رُوپ میں ڈھالنے والے چُنیدہ شعراء میں ہوتا ہے اور فکری وفنی اعتبار سے ترقی کے زینے پر سفر کرتی ہوئی روایت پسندی سے۔غالؔب اور اقبؔال کے کلام میں سائنسی وخلائی موضوعات کی نشاندہی ہوتی ہے مگر ظفر محمّد خان ظفؔر نے سائنسی موضوعات اور اصطلاحات کو مکمل دسترس سے پیش کیا ہے'اِن کی معنویت اور مقصدیت قاری کے

لیے آسان فہم ہے۔ ظفؔر کے کلام کی اہم خصوصیت غزل کا اہم عُنصر رُومانی جذبات ہیں جو مکمّل طور پر تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ نازشؔ حیدری، دہلوی کی تربیت نے اپنا رنگ دِکھایا ہے۔ ظفر محمّد خان ظفؔر کا سائنسی مزاج ملاحظہ ہو:

زمیں کا دل ہِلا ڈالا ہے ایٹم کے دَھماکوں سے
زمیں زادوں کی یا رب! فتنہ سامانی نہیں جاتی

☆

کیوں آگ لگاتے ہو تم آئل کے کنوؤں کو
تیزاب کی برسات کا تم کو نہیں ڈر کیا
نہلا کے لہو میں مری سلمائے زمیں کو
کرتا ہے اَب انسان خلاؤں کا سفر کیا

☆

یہ دنیا بنی ہے گلوبل ولیج اِک
محبت کے نغمے سُنا چاہتا ہوں
نگل نہ جائے کہیں سُرخ دیو سُورج کا
سلامتی کی دُعا مانگیے جہاں کے لیے

سائنسی نظم ''ادنیٰ سا ذرّہ'' سے ایک شعر:

مداروں میں مرے صد جلوہ گاہِ برقیہ موجود
مرے مرکز میں پوشیدہ توانائی ہے لامحدود

ظفر محمد خان ظفؔر کے شعری تخیّل میں آپ کو رُومانی جذبات اور جذبات کے اظہار کی چاشنیٔ سرشاری، وارفتگی، برجستگی و بے ساختگی، ہجر کی کسک، وصل کی جستجو اور خوبصورتیٔ زبان و بیان کی نزاکت و لطافت کے بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ اُن کے شعروں کی بنت مکمّل عروضی احاطے میں ہے، وہ عروض داں بھی ہیں اور اُس پر مکمّل اختصاصی دسترس رکھتے ہیں۔
ذیل میں اُن کے شعری رجحانات کے حامل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

154

مرے چارہ گر تو نہ تکلیف فرما
کہ اَب درد کو دِل دَوا جانتا ہے

☆

بھول کر ذاتی انا، قومی بقا کی خاطر
آیئے! ہاتھوں کی زنجیر بنا لیتے ہیں

☆

ہے بند بیکس و مظلوموں پر درِ انصاف
کُھلی ہیں دہر میں یوں تو عدالتیں کیا کیا
یہ نسلی فسادات کا سُرخ جام!
کہاں دینداروں کو نیند آ گئی

☆

ہماری حق پرستی کا صِلہ اچھّا ملا
ہجومِ دشمناں ہے اور ہم ہیں دوستو!

نامور و معتبر شاعر اور نقاد نقاش کاظمی، ظفؔر کے حق میں یوں رقمطراز ہیں:
''عمر خیام کے بعد بہت سے لوگوں نے مختلف حوالوں سے شہرت پائی، مثلاً خیام الہند وغیرہ مگر میرے ممدوح ظفر محمّد خان ظفؔر 'خیّامُ الپاک' کہلانے کے مستحق ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی لکھتے ہیں کہ: ''ظفؔر صاحب کی شاعری میں انسانیت کی خوشبو ہے اور خلوص کی مہک بھی اُن کی شاعری میں وہی سادگی اور بھولپن ہے جو اُن کی شخصیت کا خاصہ ہے۔'' ظفر صاحب نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف کا حق ادا کیا ہے ظفر محمّد خان ظفؔر کا شعری مجموعہ ''زرتاب'' فروری ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا جو اُن کی فنی مہارت، عروضِ ادب کی کاملیت اور سائنسی میدان خصوصاً خلائی سائنس کے شعبہ میں اُن کی قابلیت اور مہارت کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

☆...... اکرم کنجاہی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء

اکرم کنجاہی کا تعلق ضلع گجرات کے شہر کنجاہ سے ہے۔ اس شہر کا یہ امتیاز ہے کہ وہاں شعر وادب کے حوالے سے ممتاز شخصیات کا تعلق ہے، نیز پاک فوج کے نشان حیدر پانے والے میجر شبیر شریف کا تعلق بھی اسی شہر/ گاؤں سے ہے۔ صاحبانِ علم و ادب میں اکرم کنجاہی غنیمت

کنجاہی شریف، امان کنجاہی، منیر کنجاہی، صابری کنجاہی شامل ہیں اس لحاظ سے ہم کنجاہ کو مردم خیز خطہ کہہ سکتے ہیں۔

اکرم کنجاہی ایک کثیر الجہتی دانشور ہیں۔ وہ شاعر، تنقید نگار، افسانہ نگار، ٹی وی ایکٹر کے ساتھ محکمہ جاتی کتب بھی تحریر کر چکے ہیں۔ ایک تصنیف فنِ خطابت پر بھی ہے۔ اکرم کنجاہی ایک سینئر بینکر ہیں۔ اس اعلیٰ عہدے پر فرائض منصبی نبھاتے ہوئے ادب تخلیق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اردو شاعری، نثر اور فکشن کی ترویج و اشاعت پر آپ کی خدمات اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ آپ کی تصانیف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کسی مکتبہ فکر کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنی راہیں اور منزل خود بنا رہے ہیں۔ آپ کو عظیم المرتبت زود گو شاعر جناب راغب مراد آبادی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

آپ کی تصانیف میں نسائی ادب اور تانیثیت، دامن صد چاک، راغب مراد آبادی (چند جہتیں) لفظ زبان اور ادب (تنقید) اصولِ تقریر، محاسن فکر و فن، امن و امان اور قومی یکجہتی، جوہرِ عروض... Internal Audit in Banks- رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کا تجزیاتی جائزہ، ہجر کی چتا، محبت زمانہ ساز نہیں، بگولے رقص کرتے ہیں، فنِ خطابت، شائع ہو چکی ہیں جبکہ کثیر تعداد میں نگارشات اشاعت کی منتظر ہیں۔ اکرم کنجاہی کا تعلق گجرات کے رومان پرور علاقے سے ہے جہاں حسن و عشق کی داستانوں اور رومانی ماحول کی پرورش ہوئی ہے یہ رومانی عنصر اکرم کنجاہی کے کلام میں نمایاں ہے اور ویسے بھی اکرم کنجاہی شفقت، محبت اور رواداری کے حامل انسان ہیں۔

اکرم کنجاہی کی تنقید بھی تنقید برائے تنقید نہیں ہے ان کی تنقید نگاری میں حقیقت پسندی ہے نہ کہ شخصی پسند و ناپسند، وہ تنقید کرتے ہوئے اصلاح کا پہلو بھی سامنے رکھتے ہیں تا کہ مستقبل میں آنے والے مضامین یا شعری مجموعوں کے خالق ان سے فائدہ اٹھا سکیں جس سے ان کی نگارشات ادب کے عالمی افق پر جگہ بنا سکیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کے مطابق: ''اکرم کنجاہی کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ

شاعری کے اس معیار پر پورا اترتا ہے جس کا تعین فراقؔ نے کیا تھا اس میں عام شاعری سے ہٹ کر زندگی کا عملی تصور پیش کیا گیا ہے جو محنت عمل سے عبارت ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید کی رائے ''اکرم کنجاہی کی شاعری دیہات کی سادگی، رعنائی اور سچائی ہے۔ وہ افقِ سخن پر ترقی پسند تحریک کے دورِ زوال میں نمودار ہوئے، اس لیے اُن کے ہاں اونچی آوازیں نہیں اٹھتیں، نعرہ نہیں اُبھرتا، چیختا چنگھاڑتا نظریہ حملہ آور نہیں ہوتا لیکن ان کی شاعری میں دل کی آواز سرگوشیوں میں ضرور سنائی دیتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اکرم کنجاہی فطرت سے ہمکلام ہیں۔''

اکرم کنجاہی کا اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے:

مجھے بھی تھا وفاؤں پر بھروسہ ایک مدّت تک
مرے بھی دوست جب تک آزمانے میں نہیں آئے

☆

ضروری ہے نصیبوں کی لکیروں کو ابھی بدلو
کہیں ایسا نہ ہو تلخی مقدر میں چلی آئے

☆

اب یہ بسمل تجھے کہتا ہے بڑے کرب کے ساتھ
میرا مرہم بھی تری تلوار میں رکھا ہوا ہے

☆

کرچیاں خواب ہوئے آنکھ سلامت ہے مگر
کانچ کے خواب وہ توڑے گا کہاں تک میرے

☆

زلفِ جاناں کی سنواریں تو ہے زیبا صاحب
زلف جیون کی جو پہلے سنوارے ہوئے ہیں

☆

ٹھہری نہ خوش نصیبی غریبوں کے گھر کبھی
اک عمر اُن کے ساتھ تو دو پل ہمارے ساتھ

☆

ہجر کی شب ہو کہ لذت میں گزارے ہوئے دن
وہ کبھی ہم کو دل و جاں سے پیارے ہوئے دن

اکرم کنجاہی کا ڈاکٹر رتھ فاؤ کو خراجِ عقیدت

تیری جنت میں جو رتھ فاؤ نہیں ہے مولا
پاک روحوں کو فرشتے یہ کہاں ڈالتے ہیں

اکرم کنجاہی اپنے بے پناہ فرائضِ منصبی کی مصروفیت کے باوجود اپنے تخلیقی و تحقیقی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں یہ بہت حوصلے کا کام ہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

☆...... ڈاکٹر پیرزادہ قاسم (۸ جون ۱۹۴۳ء)

پیرزادہ قاسم صدیقی ۸/ جون ۱۹۴۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کا تعلق ایک مشہور علمی خانوادے سے ہے۔کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور نیو کیسل یونیورسٹی (برطانیہ) سے پی ایچ ڈی مکمل کی اور درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور بعدازاں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔پیرزادہ قاسم پچاس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔غزل ان کی محبوب صنف ہے۔کراچی یونیورسٹی میں جشن پیرزادہ قاسم بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔

آپ کے شعری مجموعہ ’’تند ہوا کے جشن میں‘‘۔’’شعلے پہ زباں‘‘ اور ’’بے مسافت سفر‘‘ شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔آپ کی شاعری میں نفیس جذبات و احساسات، نغمگی اور کیفیت ایک دلکش انداز میں جلوہ گر ہے۔غزلیات میں فکر انگیزی، معنی آفرینی اور لفظوں کے برتنے کی قدرت۔منظر کشی، تمثیل نگاری، خوبصورت تشبیہات‘ دلکش استعاروں کا استعمال قاری کو پڑھنے اور سامعین کو سننے کی جانب مائل کرتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیرزادہ قاسم کی شاعری میں قلبی واردات و جذبات شدت سے غالب ہیں کیونکہ یہی ایک سچے اور کھرے شاعر کی پہچان ہے۔آپ کہتے ہیں کہ:

156

مجھے تلاش کرو بھی تو عام لوگوں میں
انہی کے غم میرے غم‘ ان کی شادمانی مری
ہمیں نہیں محفل طرب کی تلاش یعنی
جہاں بھی دل شاد ہوگا ساغر اچھال دیں گے
کبھی ہوا تو کبھی خاک رہ گزر ہونا
مرے نصیب میں لکھا ہے دربدر ہونا
تند ہَوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے‘ مگر
تن سے کوئی قبا چھنی‘ سر سے کوئی ردا گئی
تمام عمر عجب وضعداریوں میں کٹی
اسے عزیز رکھا جو ہمارا تھا بھی نہیں
شہر اگر طلب کرے تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو آگ لگا دیا کرو
خبر نہ تھی کہ بچایا ہے آندھیوں سے جسے
وہی چراغ مرا گھر جلانے والا ہے
تم بادشاہِ وقت تھے کٹوادیئے تھے ہاتھ
اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے

پیرزادہ قاسم کے کلام میں انسانی حیات و فن اور اس پر عصری اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے شگفتہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔آپ کا مترنم لہجہ محفل میں ایک سماں باندھ دیتا ہے۔

مجھے بھلانا اب آپ کے اختیار میں بھی نہیں ہے، یعنی
میں آپ کے در کی صدا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

☆...... پروفیسر منظر ایوبی (۱۴/ اگست ۱۹۳۲ء تا ۲۰ جون ۲۰۲۰)

عزیز احمد ایوبی جسے ادبی دنیا منظر ایوبی کے نام سے جانتی ہے ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو بدایوں

ہندوستان کے مردم خیز خطے میں پیدا ہوئے۔ یہاں کے لوگوں نے تعلیمی میدان میں' حربی میدان میں ایسے مجاہد پیدا کیے ہیں کہ تاریخ ان کو ہمیشہ یاد رکھے گی خاص طور پر علم وادب اور جنگ آزادی کے مجاہدین کو۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ انٹر بدایوں کالج سے اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل (اردو) ۱۹۵۴ء میں اردو کالج سے بی کام کیا اور ۱۹۵۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو پاس کر کے سلسلہ درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج کراچی سے بہ حیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ آپ کا شمار کراچی کے ادبی منظر نامے میں سینئر ترین شعراء میں ہوتا ہے اکثر ادبی نشستوں کی صدارت منظر ایوبی فرماتے تھے۔ آپ غزل، نظم، ڈرامہ، تنقیدی مضامین، خاکے اور ریڈیو فیچرز لکھتے رہے ہیں۔ آپ کے شعری ونثری کارناموں میں تکلّم (شعری مجموعہ) مزاج (نظمیں) چڑھتا چاند ابھرتا سورج (قومی وملی شاعری) نئی پرانی آوازیں (مقالات اور مضامین) متاعِ آخرت (نعتیہ مجموعہ) اور اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش' شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان (۲۰۱۰ء) شامل ہیں۔ آپ کا اندازِ سخن سادہ' سہل اور پُراثر ہے اکثر سادہ پیرائے میں حکیمانہ وناصحانہ باتیں کر جاتے ہیں ۔ آپ کی غزل میں ندرتِ خیال، اندازِ شگفتگی' غنایت، زبان کی چاشنی پائی جاتی ہے:

کسی لب پہ حرف ستم تو ہو کوئی دکھ سپردِ قلم تو ہو
یہ بجا کہ شہر ملال میں کوئی فیض ہے کوئی میر ہے

☆

جس کی قربت کو ترستا تھا زمانہ کل تک
آج وہ شخص اکیلا سرِ بازار ملا

☆

ایک اُداس تیرگی قسمت بام و درہوئی
جب سے تمہاری یاد ہے شام الم سے دور دور

حوصلے تھے ابھی جواں یارو
رک گیا قافلہ کہاں یارو

سرور جاوید کے مطابق ''منظر ایوبی کا سفر دراصل شعور کا سفر ہے ادب تو ان کی زندگی ہے لیکن ان کی تعلیمی اور ریڈیائی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔'' ڈاکٹر شاداب احسانی کے مطابق ''منظر ایوبی کی شخصیت کا ہر رخ متاثر کن ہے انہوں نے قد آور لوگوں کی موجودگی میں اپنی شناخت کرالی یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

☆...... عارف شفیق (۳۱/اکتوبر ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۲۰۱۹ء)

عارف شفیق کا مشہور زمانہ شعر:

غریبِ شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیرِ شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

عارف شفیق کا تخلص عارف ہے آپ ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کراچی کے گنجان آبادی والے علاقے لیاقت آباد المعروف لالوکھیت میں پیدا ہوئے۔ آپ شفیق بریلوی کے فرزند تھے۔ صحافت سے وابستہ رہے۔ شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری' کالم نگاری' قطعات نگاری میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کو حضرت راغب مراد آبادی کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل تھا آپ کی شعری تصانیف میں اندھی سوچیں گونگے لفظ' سیپ کے دیپ' جب زمین پر کوئی دیوار نہ تھی' احتجاج' سر پھری ہوا' میں ہواؤں کا رخ بدل دوں گا' میرا شہر جل رہا ہے' یقین' میری دھرتی میرے لوگ۔ عارف شفیق کو کراچی کا نمائندہ شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دبستان کراچی عارف شفیق کی شعری سوچ اور فکر کو زندہ رکھے گی کہ ان کی شاعری دکھی دلوں کی آواز ہے:

جب کوئی اہم فیصلہ کرنا
اپنے بچوں سے مشورہ کرنا
میں نے سیکھا ہے اپنے بچوں سے
سچ کا اظہار برملا کرنا

☆

آنکھوں میں جاگ اٹھتے ہیں تنہا شجر کے دکھ
گلدان میں جو پھول سجے دیکھتا ہوں

☆

مفلس نے کچھ کیا نہیں رزاق سے گلہ
بچوں کو اپنے آج بھی بھوکا سلادیا

☆

ابھی چادر کا اندازہ ہو کیسے
ابھی تو پاؤں پھیلائے نہیں ہیں

☆

بے بسی پر میں اپنی رویا ہوں
جب بھی سائل کو میں نے ٹالا ہے

☆

زندگی ڈوب گئی موت کے سناٹے میں
باپ لوٹا نہیں بچے کی دوائیں لے کر

شہر آشوب' دکھ درد، رنج والم، محرومی وآسیب زدہ شہر کا نوحہ لکھتے لکھتے عارف شفیق ۱۴دسمبر ۲۰۱۹ کو اپنی زندگی کے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے۔

☆...... مشفق خواجہ (۱۹دسمبر ۱۹۳۵ء تا ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء)

اردو شعری ادب ونثری سرمائے کی خوب سے خوب تر تلاش میں رہنے والے خواجہ عبدالحئ جنہیں دنیائے ادب مشفق خواجہ کے نام سے یاد رکھے گی، ۱۹؍دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ دور اندیش محقق تھے۔ آپ ایک عرصہ دراز تک انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستہ رہے۔ ماہ نامہ قومی زبان' سہ ماہی اردو اور قاموس الکتب کی ادارت

فرمائی۔ آپ کتب کی بہت قدر کرتے تھے۔ ایک مستحکم لائبریری سے زیادہ کتابیں ان کے ذاتی کتب خانے میں تھیں۔ نارتھ کراچی میں ایک شعبہ تحقیق اور مشفق خواجہ کے نام سے لائبریری قائم کی گئی جس سے تشنگان تحقیق فیضیاب ہو رہے ہیں آپ کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کے تحقیقی' تدوینی اور تالیفی کاموں میں خوش کن معرکہ رہا۔ غالب اور صغیر بلگرامی۔ جائزہ مخطوطاتِ اردو۔ خامہ بگوش کے قلم سے۔ سخن در سخن۔ سخن ہائے ناگفتنی۔ سخن ہائے گسترانہ (ادبی کالموں کا انتخاب) ابیات (شعری مجموعہ) کلیاتِ یگانہ (ترتیب و تدوین) اقبال از مولوی احمد دین۔ خوناب (مرثیہ) ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے آپ کو ۱۹۹۳ء میں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا۔

آپ کی علمی وادبی اور تحقیقی کاوشوں کے لیے جمیل الدین عالی رقم طراز ہیں ''مشفق خواجہ نے اپنی تحقیق سے ایک عہد کو متاثر کیا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے حوالے سے ان کی گراں قدر خدمات ہمیشہ یادرکھی جائیں گی'' جبکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے میں ''مشفق خواجہ اردو ادب کا حوالہ تھے۔ انہیں ادب میں منفرد مقام حاصل تھا' وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔''

مشفق خواجہ ایک شاعر' محقق۔ دانشور۔ کالم نویس اور بلند پایہ نقاد تھے۔ آپ اپنی تحریر میں ایک لطیف پیرائے میں بڑی سے بڑی بات کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے تھے، بلاشبہ مشفق خواجہ اردو ادب کے ایک سنجیدہ' باوقار اور شفیق تخلیق کار تھے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ ''مشفق خواجہ اردو کے شاید واحد مزاح نگار تھے جنہوں نے ادب' ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے تھے۔'' مشفق خواجہ نے نثر نگاری کے ساتھ شاعری پر بھی توجہ رکھی ان کے چند اشعار بطور اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے:

کمالِ بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شمار کہیں ہو، مجھے یہ غم تو نہیں

وفا کے باب میں اسے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

☆

خیر، میں تو اسی قابل تھا، مگر یہ تو بتا
زندگی، کیا تو کسی کو کبھی راس آئی تھی

☆

کھلے دریچے سے یوں جھانکتی ہے مایوسی
کہ جیسے اب کوئی جھونکا ادھر نہ آئے گا

☆

ملا تو ایسے ملا جیسے جسم جاں سے ملے
بچھڑ کے یہ بھی نہ پوچھا کہ حال کیسا ہے

مشفق خواجہ کی دل کش گفتگو کا انداز بھی ملاحظہ ہو''ایک بار ایک محفل میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ذکر ہو رہا تھا۔محمود احمد عباسی بھی موجود تھے۔اُن کی یہ عادت مشہور تھی کہ وہ دوسروں سے مستعار لی گئی کتابیں واپس نہ کرتے تھے۔محمود احمد عباسی نے پوچھا''کیا کسی نے بابائے اردو کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا ہے؟''خواجہ صاحب نے فوراً کہا''میں نے دیکھا ہے''عباسی صاحب نے بڑے اشتیاق سے پوچھا''وہ کس حال میں تھے اور کیا کہہ رہے تھے۔''خواجہ صاحب نے جواب دیا''وہ کہہ رہے تھے مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک محمود احمد عباسی انجمن ترقی اردو سے مستعار لی گئی کتابیں واپس نہیں کرے گا۔''ایسا ہی تاثر ان کی اکثر تحریروں میں ملتا ہے۔اردو نثر وشعر کے لیے شبانہ روز محنت سے زندگی گزارنے والے مشفق خواجہ ۲۱ فروری کو دل کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار گئے اور ہمارے لیے تحقیقی دعوت کے ساتھ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

☆...... پروفیسر رضیہ سبحان قریشی (۹ دسمبر ۱۹۴۹ء)

پروفیسر رضیہ سبحان قریشی ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مدراس میں پیدا ہوئیں۔آپ کا شمار عہد حاضر

کی اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعرات میں ہوتا ہے آپ گورنمنٹ عبداللہ گرلز کالج سے بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئیں۔آپ ایک غزل گو شاعرہ کے ساتھ ساتھ مترجم اور مصورہ بھی ہیں۔ان تراجم میں سورۃ فاتحہ عربی سے اردو۔مشہور انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ نیز مولانا روم کے فارسی کلام کا اردو زبان میں دل کش ترجمہ بھی شامل ہے۔رضیہ غزل کے ساتھ ساتھ حمد،نظم،نعت،سلام پر بھی توجہ رکھتی ہیں۔ پروفیسر رضیہ سبحان قریشی کی تصانیف میں سرد آگ (۱۹۹۷ء) خاموش دستک (۲۰۰۲ء) سیپیاں محبت کی (۲۰۰۶ء) مکاں لا مکاں (۲۰۱۵ء) اور آگہی کی منزل پر (۲۰۱۹) شامل ہیں۔آپ فلوریڈا امریکہ میں مقیم ہیں۔ پاکستان گاہے گاہے آتی رہتی ہیں۔ رضیہ سبحان کا کہنا ہے کہ شاعری اور انسان دوستی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں میں انسان دوستی،انسانیت کی بھلائی،بھائی چارہ اور محبت کا پیغام واضح نظر آتا ہے۔

رضیہ سبحان کی نعت کے اشعار:

عکسِ رعنائی جمال میں آپؐ
بے مثالی کی اک مثال ہیں آپؐ

☆

دنیا میں ہے منزل میری دربارِ مدینہ
عقبیٰ میں ہے آقاؐ کی شفاعت مری منزل

غزلیہ اندازِ سخن:

جب بھی پایا ہے سرِ شام اکیلا مجھ میں
پوچھنے تیرا پتہ مجھ سے تری یاد آئی ہے

☆

بس اک دو بول پڑھوا کر کہیں کچھ نام لکھوا کر
زمیں زادے نے عورت کو محض جاگیر سمجھا ہے

☆

اور ہوں گے جنہیں نفرت سے نہیں ہے فرصت
ہم نے تو صرف محبت سے محبت کی ہے

مرا رستہ وہ دیکھو روکتی ہے
تمہاری یاد اک زنجیر بن کر

☆

چاہے تو وہ ساحل سے کرے ایک اشارا
میں ڈوب رہا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں

☆

ہر اک طلب سے ہوئی بے نیاز و بیگانہ
بسا کے دل میں اسے آستاں میں رہتی ہوں

رضیہ سبحان قریشی اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرتی مسائل اجاگر کررہی ہیں اور اپنی آگہی سے اندھیروں میں روشنی پھیلا رہی ہیں۔

☆...... شمیم روش (۲۱ دسمبر ۱۹۵۶)

شمیم روش کا نام محمد شمیم خان ہے جبکہ آپ کا تخلص روشؔ ہے ۲۱ دسمبر ۱۹۵۶ء کو کیٹیمار صوبہ بہار ہندوستان میں پیدا ہوئے بعد ازاں پاکستان منتقل ہوگئے کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ ایک خاموش بردبار اور زود گو شاعر ہیں۔ آپ سوئی سدرن گیس کمپنی میں بطور ڈپٹی منیجر ریٹائر ہوئے۔ میری پہلی ملاقات ۱۹۸۳ء میں ہوئی تھی۔ شمیم روش خود ہی اپنے استاد ہیں۔ انہوں نے شعری سفر میں کسی سے اصلاحِ سخن نہیں لی۔ ان کے شعری اثاثہ جات میں پلکوں کے درمیان۔ رنگ سے تصویر تک شامل ہیں۔ ڈاکٹر وفا راشدی نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں مختلف ادباء کی رائے برائے شمیم روش شامل ہے جبکہ شمیم روش کی تصنیف ''شعری افق علاج طلب۔

کون جانے کل کا سورج دیکھ بھی پائیں گے ہم
جب تلک ہے رات باقی بس یونہی باتیں کرو

☆

میں آج تہی دست ہوں اک خاص سبب سے
ورنہ میں زمانے میں سکندر کی طرح تھا

☆

اک شخص تیری بزم سے خاموش اٹھ گیا
شاید یہ بات تیرے لیے سوچنے کی تھی

☆

کتنے کچے مکان ٹوٹ گئے
ایک پکی سڑک بنانے کے لیے

☆

دل لہو، چہرہ دھواں آنکھیں سپردِ رہ گذر
ایک جیسا سلسلہ ہے مجھ سے میر تک

☆

ہم نے دیا جلا کے دریچے میں رکھ دیا
صورت بس ایک تم سے یہی رابطے کی تھی

شمیم روش کے کلام کے مطالعہ سے ان کے وسعت خیال، مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ جو شعری سفر ہے اس کو ہم ایک صاحب اسلوب اور منفرد شاعر تسلیم کرتے ہیں ان کا انداز سخن ہم عصر شعرا سے جداگانہ ہے۔

☆...... اختر سعیدی (۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۸ء)

سید اختر علی ''اختر سعیدی'' مرحوم جوہر سعیدی کے فرزند ہیں۔ آپ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش، بود و باش اور تعلیم و تربیت علمی گھوارے میں ہوئی۔ ۱۶ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلا شعری مجموعہ ''چراغ جلنے تک'' دوسرا شعری مجموعہ ''فراق

160

سے وصال تک'' جبکہ تیسرا شعری مجموعہ ''ہوا چراغ آئینہ'' ہے آپ شعبہ صحافت سے وابستہ رہے روزنامہ جنگ کراچی میں ادبی صفحہ کے انچارج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ روزنامہ جنگ کراچی میں شائع شدہ انٹرویوز پر مبنی کتاب'' دنیائے سخن کے تابندہ ستارے'' (جلد ا) ۲۰۲۲ء شائع ہوئی۔ حال ہی میں ''غبارِ دانائی'' کے نام سے چوتھا شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آیا ہے۔

نور احمد میرٹھی نے اختر سعیدی کے شعری سفر پر یوں نظر ڈالی ہے ''زبان و بیان کی صحت' رعنائی و جاذبیت، غزل کے روایتی تغزل کی پاسداری، علامتوں کے مفاہیم کو نئے انداز سے نظم کرنے کی کوشش اور زمانہ شناسی کے ساتھ ساتھ خود شناسی کے عمل نے اختر سعیدی کے شعروں میں تازگی اور لطافت کی فضا پیدا کی ہے۔''

اختر سعیدی کا اندازِ سخن:

اب کسی کی بھی پہچان مشکل نہیں
آ گیا ہے مجھے آئینہ دیکھنا

☆

ماں نہیں ہے تو ، زندگی کیا ہے
گھر بھی بے سائباں سا لگتا ہے

☆

کورونا وائرس نے بڑھائے ہیں فاصلے
کم ہوتے جارہے ہیں محبت کے سلسلے

☆

میں زندہ ہوں وسیلے سے کسی کے
وگرنہ مرگیا ہوتا کبھی کا

☆

بچھڑنے والا اک دن آملے گا
میں زندہ بس اسی امید پر ہوں

میں بے خبر ہوں مگر یہ خبر تو رکھتا ہوں
میری نگاہ کا مجھ سے مطالبہ کیا ہے

ایک آس ایک امید سامنے رکھ کر زندگی گزارنے والے اختر سعیدی اپنے والد محترم جوہر سعیدی کے نقش قدم پر قائم ہیں اور اردو ادب کی آبیاری اور ترویج و اشاعت کے لیے شبانہ روز کوشاں ہیں۔

☆...... قابل اجمیری (۲۷ راگست ۱۹۳۱ء تا ۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

عبدالرحیم قابل اجمیری کی پیدائش ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء کو عبدالکریم کے گھر چرلی راجھستان ہندوستان میں ہوئی آپ کا شمار پاک و ہند کے صف اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے آپ نے انتہائی کم عمر پائی۔ اکتیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کا کلام کم ہونے کے باوجود اردو شاعری میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ قابل نے محض ۱۴ سال کی عمر سے شعری سفر کا آغاز کیا۔ حیدر آباد سے نئی قدریں' آفتاب اور روزنامہ جاوید سے منسلک رہے۔ آپ کی تصانیف میں دیدہ بیدار' خونِ رگِ جاں شامل ہیں جبکہ کلیات قابل اور ایک انتخاب کلام قابل ''عشق انسان کی ضرورت ہے'' بھی منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری نے قابل اجمیری کی ادبی خدمات کو اس انداز میں سراہا ہے:

''حسرت موہانی نے تہذیب رسم عاشقی کی جو بنیاد غزل میں رکھی تھی اسے قابل نے بھی اپنایا ہے تہذیب میں عموماً تصنع کا رنگ آجاتا ہے لیکن قابل نے تصنع کی اس منفی کیفیت کو اپنے دائرہ احساس سے خارج کر دیا ہے۔''

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

☆

شکستِ جام پر میخانہ سارا گونج اٹھتا ہے
مگر حیرت ہے آوازِ شکست دل نہیں ہوتی

بڑھ کے ساغر توڑ دے کوئی
روح تشنہ ہے پینے والوں کی

☆

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے تمھیں مجھ سے دشمنی ہوجائے

☆

ہم چراغِ یقیں جلاتے رہے
وقت کو راستہ دکھاتے رہے

☆

لاکھ ہم خانماں خراب سہی
حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں

☆

مرحلے زیست کے بھی کم تو نہیں اے دوست
اور جی لیں گے تیری زلف کے سر ہونے تک

قابل اجمیری کی زندگی مختصر اکتیس سال ہے مگر وہ اس مختصر زندگی میں وہ کام کر گئے کہ اردو شاعری کی تاریخ انہیں فراموش نہیں کر پائے گی۔قابل اجمیری ۱۳ اکتوبر کو تپ دق کے مرض میں انتقال کر گئے۔

☆...... معراج جامی (۱۲/مارچ ۱۹۵۵)

سید معراج مصطفیٰ ہاشمی جامیؔ تخلص کرتے ہیں آپ کی پیدائش ۱۲/مارچ ۱۹۵۵ ضلع دادو سندھ کی ہے، جامی نے دادو اور سندھ یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامک اسٹڈیز۔اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔آپ کاٹن ایکسپورٹ سے وابستہ تھے آج کل صحافت اور اشاعت کتب پر توجہ ہے نیز کتب خانۂ جامی بھی ادب کے تشنہ لب طلبا کے لیے مہیا کیا ہے۔جامی فدا خالدی کے

حلقہ تلامذہ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ابتدائی دنوں میں اذفر زیدی سے بھی اصلاح سخن لی۔آپ مشہور شاعر فیاض ہاشمی کے بھائی ہیں۔آپ کے شعری اثاثہ جات میں روزنِ خیال (شعری مجموعہ) اُردو کے مشہور اشعار (تالیف) بیوی سے چھپ کر (سین ریو نظمیں) شامل ہیں جبکہ سہ ماہی سفیرِ اردو۔ماہ نامہ پرواز لندن۔ماہ نامہ آئینہ مانچسٹر کی ادارت سے وابستہ ہیں۔

معراج جامی کے چند اشعار بطور نمونہ کلام:

ہم تو وابستہ ہیں ایسے دور سے جس دور میں
آدمی کے راستے میں آدمی دیوار ہے

☆

چند آنسو ہیں ندامت کے مری آنکھوں میں
اور تو کچھ بھی نہیں مجھ سے گنہگار کے پاس

☆

بچ بھی جاتا ہے عدالت سے اگر
وقت مجرم کو سزا دیتا ہے

☆

دشمنوں کے لیے بچا ہی نہیں
دوستوں ہی میں بٹ گیا ہوں میں

جامیؔ دوراں اپنے شگفتہ مزاج اور منکسر المزاج طبیعت کے ساتھ ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے۔

☆...... خالد معین (۳جون ۱۹۶۲ء)

خالد معین خالدؔ ۳ جون ۱۹۶۲ء کو میں پیدا ہوئے آپ نے اپنی تعلیم کراچی میں مکمل کی علامہ اقبال ڈگری کالج اور وفاقی اردو آرٹس کالج سے ایم اے صحافت کیا اس وقت بطور صحافی اب تک ٹی وی چینل سے منسلک ہیں اس سے پہلے ایکسپریس نیوز، نیوز ون اور دیگر اداروں

سے وابستہ رہے۔ خالد معین ایک روایت سے جڑے مگر عصرِ حاضر کے منظر نامے میں ہمہ وقت موجود شاعر ہیں۔ مابعد جدید دور میں اپنے منفرد انداز سے اپنے شعری قد کو بڑا رکھتے ہیں۔ آپ کے شعری مجموعوں میں بے موسم وحشت' انہماک' پسِ عشق' ناگہاں' نئی صدیوں کے خمار میں جبکہ نثری وتجزیاتی مضامین رفاقتیں کیا کیا' شامل ہیں جبکہ ایک تازہ اور نئی تصنیف مصورانِ خوش خیال ہے' اس میں کراچی کے پانچ مصوروں وصی حیدر، فرخ شہاب' تنویر فاروقی' فوزیہ خان اور جی این قاضی کے فن وشخصیت پر تجزیاتی تحاریر شامل ہیں۔

خالد معین کا اندازِ سخن:

عجب پُر لطف منظر دیکھتا ہوں بارش میں
بدن جلتا ہے اور میں بھیگتا ہوں بارش میں

☆

محبت کی تو کوئی حد' کوئی سرحد نہیں ہوتی
ہمارے درمیاں یہ فاصلہ کیسے نکل آیا

خالد معین کا اندازِ فکر وسخن ایسا ہے کہ وہ ہر ایک عمر کے لیے موزوں ہے اور خود ان کے لیے بھی ہمہ وقت موزوں رہتا ہے چاہے موسم کون سا بھی ہو خالد معین اپنا موسم خود بناتے ہیں اور وہ اسی کے ماحول میں خوشیاں تلاش کرتے رہتے ہیں' خالد معین کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ کیسا جشنِ چراغاں تھا رات بستی میں
مرے مکان سے نکلا نہیں دھواں اب تک

☆

جن کے دم سے تھی جھیل پر رونق
وہ پرندے تو کوچ کر بھی گئے

☆

اب آئے ہو جب سارے دیے اک اک کر کے بجھ بھی گئے
لیکن لوٹ کے آنے والو' شاد رہو آباد رہو

163

☆...... سلیم فوز (۲۸ر فروری ۱۹۶۵ء)

سلیم فوز کا تعلق کراچی سے ہے آپ ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء کو خانیوال میں پیدا ہوئے جبکہ بودوباش کراچی میں ہوئی ہے عہد مابعد جدیدیت میں کراچی کے ادبی منظر نامے کے اہم شاعر ہیں آپ کی شعری کاوشوں میں کوئی تم سے مخاطب ہے اور سبھی چہرے تمہارے شامل ہیں۔ ان کا ایک نمائندہ شعر:

جانے اس شخص کو یہ کیسا ہنر آتا ہے
رات ہوتی ہے تو آنکھوں میں اتر آتا ہے

سلیم فوز کا اسلوب سخن سادہ اور رواں ہے ہر موضوع پر ہر بات سادگی سلاست اور روانی سے کہہ جاتے ہیں کہ دل میں اتر جائے:

تمہارے حسن کے حیرت کدے میں رہتا ہوں
شراب پیتا نہیں اور نشے میں رہتا ہوں

☆

کبھی اچھا برا سوچا نہیں ہے
محبت عقل کا سودا نہیں ہے

☆

یاد کا پھول سرِ شاخ کھلا دینے کا
اس کو آتا ہے ہنر زخم نیا دینے کا

☆

تو ہی کہتا ہے دعا دل سے ملا دیتی ہے دل
چل تو پھر ہاتھ اٹھا آج دعا ہوجائے
دیر تک اُس سے ملائے نہیں رکھو آنکھیں
ورنہ دنیا بھی چلی جائے گی ایمان کے ساتھ

سلیم فوز اپنی بساط کے مطابق ادب کی سرپرستی کر رہے ہیں نوجوان شعراء کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ اردو ادب کی ترقی کے لیے بنائے گئے ادارے ناکام ہو چکے ہیں آپ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے غزل ہے اور یہ جو نثری نظم ہے‘ اس کی کوئی حیثیت اور مستقبل نہیں ہے۔ سلیم فوز کا ایک اور انداز سخن:

برف کے شہر میں سورج کی دعا مت مانگو
دھوپ نکلی تو در و بام پگھل جائیں گے

سلیم فوز غزل‘ نظم‘ قطعات‘ حمد و نعت تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں آپ کی مابعد جدید دور میں ایک حیثیت اور مقام ہے جسے نقاد احسن انداز میں پیش کریں گے۔

☆...... افضل گوہر (یکم جنوری ۱۹۵۶ء)

راؤ افضل گوہر یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو ملتان کی تحصیل شجاع آباد کے ایک گاؤں غازی پور میں پیدا ہوئے بچپن پھیروان میں گذرا راؤ افضل گوہر۔ رانا سعید دوشی اور ڈاکٹر ارشد معراج ہم جولی ہم مکتب ہیں۔ ان کی طبع جولانی میں ایک عمودی پرواز ہے‘ خیال کی ندرت ہے اور فکر کی اٹھان ہے۔ وہ اپنی شاعری میں بکھرے ہوئے زرد پتوں کی طرح ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اپنی راہیں نہیں بدلتے بلکہ اس موسم سے کھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ اپنے کلام میں خود کو ایک بہتے دریا کی مانند محسوس کرتے ہیں اور دونوں کناروں کے درمیان اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مگر ہمت نہیں ہارتے۔ افضل گوہر راؤ کو اپنی اساس سے گہرا لگاؤ ہے وہ اپنی رگوں میں دوڑتے خون سے بغاوت نہیں کرتے بلکہ اپنی غیرت وحمیت کے مطابق دنیاوی محرکات کو اپنے تابع رکھتے ہیں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے پاؤں بھی ٹوٹ سکتے ہیں
ٹھوکروں سے نہ اُچھال مجھے

زمین کے دکھ سناتے ہیں زمیں کی بات کرتے ہیں
کبھی اپنے لیے اے آسماں ہم کچھ نہیں کہتے

164

اے پری زاد کچھ سہولت دے
عشق تجھ سے نیا نیا ہے مرا

اے مجھ میں آئی ہوئی رات تجھ کو جلدی ہے
تو کیا چراغ بجھادوں کلام گم کردوں

طاق میں بجھ گئی رات مگر
جل رہا ہے مرا دیا مرے ساتھ

وصل کے دن عجیب ہوتے ہیں
سال کم پڑ گیا مہینے میں

میں نے یہ اینٹ یونہی سر کے تلے رکھی ہے
ورنہ ایسی بھی کہاں خواہشیں پسند مجھے

☆

میں کیسے بھلا خواب سے باہر نکل آؤں
یہ رات تری زلف سے زنجیر ہوئی ہے

افضل گوہر کے کلام میں آپ کو دادرسی، کوہ کن کا حوصلہ، حسن وعشق‘ محبوب کا انتظار اور امید کی روشن کرن ان کے ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہے۔

☆...... رانا سعید دوشی (۴ اپریل ۱۹۶۵ء)

’’آپ کا تعلق ایک سپاہ گر خاندان سے ہے ۴ اپریل ۱۹۶۵ء کو پھلروان سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پھلروان اور حسن ابدال سے حاصل کی۔ ۱۹۸۴ء میں بسلسلہ روزگار لاہور ہجرت کی‘ بی اے ایم اے ایل ایل بی پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ لاہور میں شاعری بھی کی اور فلمی گیت بھی لکھے بعد ازاں راولپنڈی تشریف لے گئے۔ آج کل ایف بی آر میں بطور آفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ راؤ افضل گوہر، رانا سعید دوشی اور ڈاکٹر ارشد معراج ہم جماعت ہیں۔ رانا سعید دوشی شاعری کے سلسلے میں بیرون ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ آپ

اپنے عہد کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں دوشی کی غزل اور نظم کی بُنت کاری میں ایسے موتی جڑے ہیں کہ ایک خوشگوار حیرت انگشت بدنداں نظر آتی ہے ملاحظہ ہو

عشق کے نام پہ خیرات بھی لے سکتے ہیں
یہ وہ صدقہ ہے جو سادات بھی لے سکتے ہیں

رانا سعید دوشی حسن و جمال کی بات کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں پھر وہ عہد حاضر کی شعبدہ بازیوں پر بھی گہری نظر ڈالتے ہیں اور عصرِ حاضر کی شعری طبع آزمائیوں اور قارئین اور شاعر کی رسہ کشی کو ذیل کے انداز میں بیان کرتے ہیں:

میں شاعر سے مداری ہوگیا ہوں
مجھے کرتب دکھانے پڑ رہے ہیں

افتخار عارف نے رانا سعید دوشی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''رانا سعید دوشی نئی نسل کے ایسے منتخب شعر کہنے والوں میں بہت نمایاں ہیں جو اپنے تخلیقی وجود کو منوانے اور اپنی شناخت کو مستحکم کرنے میں کامیاب رہے ہیں وہ مکمل طور پر اور ہمہ دم زندگی شاعری کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔'' سلیم کوثر کے مطابق ''وہ کھرا اور کھردرا شاعر ہے کھرے اور کھردرے پن میں کہیں اس کی شعری لغت ترتیب پا رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں ہمیشہ اپنے لہجے کی پاسداری کے ساتھ چاک و چوبند نظر آئے وہ اپنی شاعری میں ''دوشی'' نہیں سرخرو دکھائی دیتا ہے اللہ اس پر اعلیٰ شاعری کی سچائیوں کے در کھلے رکھے۔ آمین''

احمد ندیم قاسمی نے اپنی رائے کا اظہار ذیل کے پیرائے میں کیا ہے:

''سعید دوشی آپ کی غزل عمدہ اور نظم شاہکار ہے ہم دونوں بابا بیٹی آپ کی شاعری میں کھری انفرادیت کی ابھرتی ہوئی لہر دیکھ کر بہت خوش ہیں آپ کی نظمیں غزلیں سبھی کی تحسین کرتا ہوں۔'' رانا سعید دوشی کا انداز سخن ملاحظہ کیجیے:

واپس آنے میں صدیاں لگ جائیں گی
اتنی دور گیا ہوں میں اک لمحے میں

☆

سانس کی آنچ سے مجھ کو گلِ حکمت کر دے
کوزہ گر! اب مجھے برسات سے ڈر لگتا ہے
میرا بیٹا بھی تو میری ہی طرح سوچتا ہے
اس کے پیچیدہ سوالات سے ڈر لگتا ہے
دو چار قدم چاند مرے ساتھ جو چل پڑتا ہے
شہر کا شہر تعاقب میں نکل پڑتا ہے

☆

کسی کے کام آنے سے رہا میں
مجھے اپنی پریشانی بہت ہے

☆

سینے پہ یونہی سانپ لوٹ رہے تھے
اک راز مرے دل میں خزانے کی طرح تھا

رانا سعید دوشی جیسے سچے کھرے شاعر حقیقت اور فطرت سے بھرپور خیالات سے اردو غزل کو مزید سنواریں گے اور اپنے جدید خیالات سے اپنی شعری منزل کو نئے امکانات سے ہمکنار کرنے کے لیے ہمہ وقت سرگرداں رہیں گے ایسا ہی ایک رنگ دوشی کی غزل میں نظر آ رہا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں:

آج نہ جانے دوں گا تجھ کو اپنی آنکھ سے باہر
دھاڑیں مار سمندر چاہے ٹھاٹھیں مار سمندر

رانا سعید دوشی کا خود شناسی کا عنصر ان کی ایک خداداد صلاحیت ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے بلاشبہ رانا سعید دوشی میدانِ ادب کا ایسا تازہ دم شہسوار ہے جو ہمہ وقت سفر میں رہتا ہے اور نہیں تھکتا......رانا سعید دوشی کے دو شعر جو ان کی شناخت بن چکے ہیں

میں چپ رہا تو مجھے مار دے گا میرا ضمیر
گواہی دی عدالت میں تو مارا جاؤں گا
میں مارا جاؤں گا پہلے کسی فسانے میں
پھر اس کے بعد حقیقت میں مارا جاؤں گا

☆...... فراست رضوی (۱۰ جولائی ۱۹۵۴ء)

سید فراست حسن رضوی المتخلص فراستؔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ ۱۹۶۹ء میں پاکستان آ گئے اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور، شاعر اور نقاد ہیں ایم اے اردو ادبیات ایم اے فلسفہ اور قانون کی ڈگری ایل ایل بی حاصل کی آپ حکومت پاکستان کے سیلز اینڈ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ پاکستان کے ادبی منظر نامے کے ایک اہم شاعر، دانشور اور نقاد ہیں دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے آپ طویل اور وسیع مضامین کو اپنے کمال ہنر سے چند سطروں میں بیان کر دیتے ہیں اس عمل سے ان کے وسیع النظر مطالعہ اور علم وفن پر دسترس ظاہر ہوتی ہے آپ کی تصانیف میں درد کی قندیل (رباعیات) زمستان کا چاند (غزلیں) کہر میں ڈوبی شام (شاعری) کتاب رفتہ (شاعری) آیات محبت (منقبت سلام نوحے) سلام فلسطین (نظمیں) شامل ہیں فراست رضوی اور ان کی ہم سفر نسیم نازش دونوں اپنی بساط کے مطابق عصرِ حاضر میں اردو ادب کی سنگلاخ زمینوں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ فراست رضوی کا اندازِ سخن ملاحظہ ہو:

گریہ میں بھی رکھو سلیقہ
آواز کسی کے گھر نہ جائے
بہت سے رشتوں کی زنجیر ہے یہ گھر ورنہ
ہم اس قفس سے کبھی کے نکل گئے ہوتے
زیست کرنے کا ہنر آخر مجھے آ بھی گیا
ایک چہرہ اپنی خاطر اک زمانے کے لیے

166

☆

کچھ دل بھی بجھ گیا ستمِ روزگار سے
کچھ اس نگاہ کا بھی اشارہ نہیں رہا
چلتے رہنا ہے مجھ کو
جب تک یہ دَم باقی ہے
آنکھیں جہاں ہوں بند اندھیرا وہیں سے ہے
جاگے ہیں ہم جہاں سے سویرا وہیں سے ہے

☆

محفلِ دوستاں سے کب اٹھنے کو چاہتا ہے دل
سوچ رہا ہوں جاؤں گھر رات بہت گذر گئی ہے

☆...... نسیم نازش (۱۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

نسیم فاطمہ نام اور تخلص نازش ہے ایم اے اردو کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ آپ کی پیدائش لاہور کی ہے نواب شاہ میں بھی قیام رہا۔ پاکستان کے ادبی منظر نامے میں آپ کا شمار ایک سمجھ دار، ذی وقار شاعرہ کے طور پر ہوتا ہے۔ شاعری کا آغاز بچپن ہی سے کیا۔ اولین والد صاحب نوازش حسین زیدی سے اور بعد ازاں مکرم لکھنوی سے اصلاح لی۔

آپ کے دو شعری مجموعے ہیں محبت روشنی ہے (غزلیہ) اور ابھی سورج نہیں نکلا (نظموں کا مجموعہ) آپ کے دونوں شعری مجموعے یونائٹڈ بینک لٹریری ایوارڈ یافتہ ہیں۔ آپ کی شادی مشہور شاعر اور نقاد جناب فراست رضوی سے ہوئی ہے نسیم نازش کا اندازِ سخن ملاحظہ فرمائیے

علیؑ کا نام لیا میں نے جس گھڑی نازش
ہجومِ یاس کے طوفان سے نکل آئی

☆

میں دیکھ لوں گی تمہیں دل کی آنکھ سے جاناں
نقابِ وقت اٹھاؤ کہ رات بھیگ چلی

☆

ترے خال و خد روح پر چھا گئے
تصور میں تیرے سوا کچھ نہیں

☆

برے تھے یا کہ بھلے تھے گذر گئے وہ دن
سو اب یہ سود و زیاں کا حساب کیا رکھنا
کس نے پوچھا ہے نازش
آنکھیں تیری نم کیوں ہیں؟

نسیم نازش کی شاعری روایت سے جڑی ہوئی شاعری ہے مگر عصرِ حاضر کی رواں شعری لوازمات سے بے بہرہ نہیں۔معاشرے کی ناہمواری۔عورت کا دکھ اور مسائل سب پر نسیم نازش کی گہری نظر ہے:

آ رہا ہے بہار کا موسم
رُت بدلنے لگی چلے آؤ
ملنا نہیں روز اچھا
عادت سی پڑ جاتی ہے

نسیم نازش کی شاعری عام فہم اور سادگی لیے ہوئے ہے جو سامعین وقارئین کے دل میں اتر جاتی ہے۔

☆...... نوشی گیلانی (۱۴مارچ ۱۹۶۴ء)

سیدہ نشاط بنت مسعود احمد گیلانی ۱۴/مارچ ۱۹۶۴ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئیں۔نوشی گیلانی نے گھر کا ماحول ادبی پایا ہے۔ پاکستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کی پہلے مزاحیہ اور بعد میں سنجیدہ شاعری کرنے لگیں صوفیانہ شاعری سے بھی لگاؤ ہے اپنی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔نوشی پنجابی زبان میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں۔آپ کے شعری خزانوں میں 'محبتیں جب شمار کرنا' 'اداس ہونے دن نہیں ہیں' 'پہلا لفظ محبت لکھا' 'ہوا چپکے سے کہتی ہے'۔نوشی گیلانی کی

شاعری میں عورت کے دکھ کا اظہار بلکہ ذاتی دکھ کا اظہار نمایاں ہے۔نوشی نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کمال کی لکھی ہیں۔۲۰۰۸ء میں آسٹریلیا میں مقیم شاعر سعید خان سے دوسری شادی کی اور اب آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔نوشی گیلانی کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انہیں خواتین معاصر شاعرات کے ساتھ دیگر شعراء کے درمیان انفرادیت کا حامل بناتی ہیں:

وفاؤں کے تسلسل سے محبت روٹھ جاتی ہے
کہانی میں ذرا سی بے وفائی مانگتے رہنا

☆

میں کہاں سراپائے ناز تھی مجھے یاد ہے شب تیرگی
وہ کسی کے لمس کا معجزہ جو میرے شباب میں رہ گیا

☆

تجھ سے اب اور محبت نہیں کی جاسکتی
خود کو اتنی بھی اذیت نہیں دی جاسکتی

☆

تیرے روکے سے وہ بد عہد کہاں رکتا ہے
پاؤں چھونے سے تو بہتر ہے اسے جانے دے
میں بد دعا تو نہیں دے رہی ہوں اس کو مگر
دعا یہی ہے اسے مجھ سا اب کوئی نہ ملے

☆

مرقدِ عشق پہ اب اور نہ رویا جائے
رات کا پچھلا پہر ہے چلو سویا جائے

نوشی گیلانی کا شعری سفر اپنی رفتار سے جاری ہے اب وہ آسٹریلیا میں بھی اردو شاعری کو مقبول عام کر رہی ہیں دعا ہے کہ ۲۰۰۸ء سے شروع ہونے والا نیا سفر انہیں دائمی خوشیاں عطا کرے۔

☆...... ذکیہ غزل (۲۰اکتوبر۱۹۶۳ء)

ذکیہ غزل کا نام ذکیہ سلطانہ ہے آپ تخلص غزل کرتی ہیں آپ کی پیدائش کراچی کی ہے ایم اے نفسیات ہیں آپ کا شمار خواتین شاعرات میں ایک منفرد لب و لہجے اور غنایت آمیز اشعار کہنے والی شاعرہ میں ہوتا ہے' آپ کو دنیا میں خواتین کی نمائندہ شاعر تسلیم کیا گیا ہے غزل' ہائیکو' دوہے پر کمال کی دسترس رکھتی ہیں' ریڈیو پاکستان ورلڈ سروس سے چھ سال تک وابستہ رہیں اس طرح سے ایک اضافی خوبی براڈ کاسٹر کی بھی ہے۔ آپ نے نوعمری ہی میں نویں جماعت میں ایک نظم کہی ذکیہ غزل کہتی ہیں کہ ''شاعری انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔'' آپ کہتی ہیں کہ علم عروض سیکھے بغیر بھی شاعری کی جاسکتی ہے'' اس انداز تکلم سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ ذکیہ غزل ایک پر اعتماد شاعرہ ہیں آپ کے شعری مجموعوں میں' بادل گیت ہوا اور میں' اور تعبیریں شامل ہیں۔ آپ کی شاعری کا اختصاص یہ ہے کہ ذکیہ غزل نے صنف نازک کے جذبات و احساسات کی ترجمانی احسن انداز میں کی ہے۔ وہ اپنے اندازِ سخن میں کبھی باغیانہ، خطیبانہ اور حکیمانہ لہجہ اختیار کرتی ہیں انداز سخن ملاحظہ ہو:

بے کفن امیدوں کی سر بریدہ لاشوں کو
دفن کر کے لوٹ آئے راستی کے راہی کیا
یہ کون روزنِ زنداں سے جھانکتا ہے غزل
یہ کون قید ہوا بیڑیاں بناتے ہوئے
یوں کدورت یہ دلوں کی نہیں مٹ پاتی ہے
اب تو دیوار یہ آنگن کی گرادی جائے
یہ کیسا عیب ہے میرے شہر کے لوگوں میں
دیے جلا نہ سکے تو بجھانے آئے ہیں

ڈاکٹر شاداب احسانی کہتے ہیں کہ ''ان کی شاعری میں سلاست اور روانی ہے جب بھی وہ کراچی

آئیں گی انہیں اہمیت حاصل رہے گی اردو زبان اور اردو شاعری آگے بڑھ رہی ہے۔''

ذکیہ غزل دوہے بھی کہتی ہیں اور سناتی ہیں اپنے مترنم لہجے میں ملاحظہ ہو:

پہلے پہلے پیار کی ساجن پہلی ہے برسات
تم تو شان سے نکلے تھے لے ہاتھ میں میرا ہاتھ
اوڑھ کے لیٹی یاد تری اور جاگ کے کاٹی رات
ڈر کر دنیا والوں سے کیوں چھوڑ دیا ہے ساتھ

ذکیہ غزل دیارِ غیر میں رہ کر بھی اردو اور اردو شاعری کی خدمت کر رہی ہیں خدا انہیں سلامت رکھے۔

☆...... مقبول زیدی (۱۵اپریل ۱۹۶۰)

آپ ۱۵ اپریل ۱۹۶۰ میں خیر پور میرس میں پیدا ہوئے' آپ کے جد امجد کا تعلق سہارنپور سے ہے۔ قیام پاکستان کے موقع پر آپ کا خاندان ہجرت کر کے خیر پور میں آباد ہوا' خیر پور کا شمار علم و ادب کے حوالے سے ایک مردم خیز خطے کے طور پر ہوتا ہے۔ خیر پور کے والیٔ ریاست علم پرور حکمران رہے ہیں۔ مقبول زیدی نے اپنے کلام میں عصرِ حاضر کے مضامین کے ساتھ ساتھ تغزل کو بھی اپنایا ہے مقبول زیدی نے جس انداز سخن کو اپنایا ہے وہ کسی کے مقلد نہیں ہیں بلکہ ان کا اپنا انداز' اپنی راہیں ہیں۔ آپ منصور ملتانی سے اصلاح سخن لیتے رہے ذیل کے اشعار میں مقبول زیدی کا رنگ سخن نمایاں ہے:

عادتاً مقبول آوارہ پھرا کرتے ہو تم
ہم ہوا کرتے ہیں پیہم در بدر بارش کے بعد

☆

تنہائی کی چیخوں نے جگایا مجھے اکثر
راس آیا نہ اک روز بھی بن باس کا بستر

مقبول زیدی ادبی گزار فورم انٹرنیشنل کے بانی ہیں جو شبانہ روز رثائی ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہیں تین سالوں پر محیط پڑھے گئے سلام کو ضبط تحریر میں لانے کے بعد ''حرف

زیارت گذار‘‘ کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے جبکہ مزید تین سالوں کا کلام زیر اشاعت ہے بہت جلد انشاء اللہ۔

مقبول زیدی کی شاعری میں تازہ پھول اور پیار کی مہک ساتھ ساتھ سفر کرتی نظر آتی ہے جس برملا اظہار یوں ہوتا ہے:

مہک رہی ہے تیری چاہتوں سے میری غزل
میں سب سے چھپ کے بھلا تجھ سے پیار کیسے کروں

اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے:

دستِ ہنر میں آ گئے ہتھیار کس لیے
کیا ہو گیا کتابِ خدا کون لے گیا

☆

وہ کاش سن نہ سکے داستانِ تاج محل
جو کہہ رہی ہے کہ چھوٹا سا گھر غنیمت ہے
وہ جھوٹ جس کو نبھا رہا ہوں میں اب تک
بنا گیا ہے مجھے معتبر غنیمت ہے

مقبول زیدی کا شعری مجموعہ ’ابھی کچھ پھول تازہ ہیں‘ ۲۰۱۶ء میں اشاعت پذیر ہو کر مقبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

☆......**ڈاکٹر نثار احمد نثار (۲ جنوری ۱۹۵۰ء)**

نثار احمد نثار المعروف نثار احمد ۲ جنوری ۱۹۵۰ء کو کراچی میں پیدا ہوئے آپ کا شعبہ درس و تدریس ہے محکمہ تعلیم سندھ سے گزیٹڈ سترہ گریڈ سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی تعلیم بی یو ایم ایس۔ ڈی ایچ۔ ایم۔ ایس۔ بی ایڈ۔ ایم اے اور ایم ایڈ ہے۔ آپ کی شعری تصانیف میں اولین نعتیہ مجموعہ ’’نور الہدیٰ محمدؐ‘‘ جبکہ غزلوں کا مجموعہ ’آئنوں کے درمیان‘ ہے آئنوں کے درمیان فروری ۲۰۱۹ء میں اشاعت پذیر ہوا دیگر تصانیف میں ’محبّ گلدستہ اردو برائے اول تا ہشتم

(طلبا و طالبات کی درسی کتاب) صبحِ نو (بچوں کی نظمیں شامل ہیں) آپ کراچی کی مشہور اور فعال ادبی تنظیم بزم یارانِ سخن کے روحِ رواں بانی و جنرل سیکریٹری ہیں جبکہ شعبہ صحافت میں روزنامہ جسارت کراچی سے بطور کلچرل رپورٹر منسلک ہیں۔ آپ کا یہ امتیاز ہے کہ کراچی میں ہونے والی چھوٹی بڑی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرتے ہیں۔ آپ کو حضرت راغب مراد آبادی کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ڈاکٹر شاداب احسانی نثار احمد نثار کی ادبی کاوشوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ’’ان کے ہاں فکر انگیزی، تنوع، جدّت پسندی اور خوش نما لفظیات کے ساتھ ساتھ غزل کے روایتی اور جدید ترین اسلوب نظر آتے ہیں ان کا لب و لہجہ دلنشیں اور دلفریب ہے‘‘ نثار احمد نثار کی شاعری میں روایت سے بغاوت نہیں ملتی ان کے روایت اور جدّت کا امتزاج ملتا ہے ان کی شاعری میں سماجی و معاشرتی شعور اور رومانی رنگ بھی ملتا ہے‘ اندازِ سخن:

میں زخم کھا کے زمیں بوس ہونے والا تھا
کسی نے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا مجھ کو

☆

بچے بڑے ہوئے تو بہت کچھ بدل گیا
لیکن میں اپنے گھر کا ابھی سرپرست ہوں
خوشبو کے سمندر میں ہر روز نہاتا ہوں
ساون کی طرح مجھ پر وہ روز برستا ہے

☆

اگر میں اپنے حریفوں سے ڈر گیا ہوتا
مجھے یقین ہے میں کب کا مر گیا ہوتا
سیڑھی سے کبھی قد میں اضافہ نہیں ہوتا
خیرات کی پوشاک سے عزت نہیں ملتی

خدا کا شکر ہے کہ نثار احمد نثار شاعری، درس وتدریس اور صحافت بڑی کامیابی اور حوصلہ سے چلا رہے ہیں اللہ انہیں صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

☆...... انیس جعفری (۵ر اپریل ۱۹۶۲ء)

سید انیس مہدی جعفری ولد سید فیض الحسن جعفری ۵ اپریل ۱۹۶۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئے گریجویشن کراچی یونیورسٹی سے کیا محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں بطور آفیسر خدمات انجام دیں کراچی کی ادبی فضاؤں کے ایک انتہائی متحرک شاعر ہیں۔غزل نظم نعت حمد وسلام منقبت میں طبع آزمائی کرتے ہیں اردو شاعری میں اذفر زیدی اور وفا کانپوری سے اصلاح سخن لی ان کا اولین مجموعہ حمد ونعت ''مودّت کے گلاب'' اشاعت پذیر ہو چکا ہے ہ آئینۂ دل میرا (غزلوں کا مجموعہ)۲۰۲۵ء میں شائع ہوا۔آپ اردو لٹریری ایسوسی ایشن انٹرنیشنل کے بانی رکن اور مرکزی صدر ہیں نیز ادبی رسالہ ادب وفن کے ایڈیٹر بھی ہیں۔نسیم نازش لکھتی ہیں کہ ''انیس جعفری کی نعتوں اور سلاموں میں حسنِ بیان کی کاوش قابل داد ہے ان کی منقبتیں محبت اور عقیدت کے ایسے پھول ہیں جو کبھی مرجھا نہیں سکتے۔'' کلام ملاحظہ ہو:

کنکروں کے لب پہ جاری ہوگیا ذکرِ رسولؐ
یہ مِرے سرکار کے کردار کی تاثیر ہے

☆

یہ راستہ کبھی بے نور ہو نہیں سکتا
کہ راہ میں روشن ہیں کربلا کے چراغ
بس ایک کربلا کا سفر راس آ گیا
ورنہ کیے ہیں زیست میں بے انتہا سفر

انیس جعفری کی غزل کے میدان میں بھی معیاری تخلیقات سامنے آئی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے جدید عہد میں اردو غزل کو آگے بڑھا رہے ہیں ان کے ہاں سادگی معنویت اور روانی پائی جاتی ہے:

ہر اک ٹھوکر انیس اب زندگی
مجھے جینے کے گر سکھلا رہی ہے

☆

انسانیت شناس نظر کون لے گیا
محنت کشوں کا خونِ جگر کون لے گیا
رقص شعلوں پہ یوں کیا دل نے
جیسے مقتول زیرِ خنجر تھا

☆

لہو کا تیل نہ شامل ہو گر چراغوں میں
بھی ہوا کے مقابل وہ جل نہیں سکتا

انیس جعفری اردو لٹریری ایسوسی ایشن انٹرنیشنل ادب وفن کے مدیر اور وائس چیئرمین لائبریری کمیٹی آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی حیثیت سے ادب کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں ہیں۔

☆...... ڈاکٹر توصیف تبسم (۳ر اگست ۱۹۲۸ء)

محمد احمد توصیف کی پیدائش ۳ اگست کو سہسوان (بدایوں۔ ہندوستان) میں ہوئی۔علمی وادبی حوالے سے بدایوں ایک مردم خیز خطہ ہے۔محمد احمد توصیف کا تعلق ایک معزز زمین دار اور علمی گھرانے سے ہے ابتدائی تعلیم بدایوں اور دہلی میں حاصل کی قیام پاکستان کے وقت پاکستان ہجرت کی بسلسلہ ملازمت کراچی میں مقیم رہے آپ نے ۱۹۶۲ء میں گورڈن ڈگری کالج سے ایم اے اردو پاس کیا اور اسی کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے محمد احمد توصیف نے منیر شکوہ آبادی پر کام کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ملازمت سے فارغ ہو کر آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں۔آپ کی طبع آزمائی میں غزل، نظم، قطعات شامل ہیں۔آپ کی تصانیف میں کوئی اور ستارہ (شعری مجموعہ)، جنگ آزادی ۱۹۵۷ء کا مجاہد شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی شامل ہیں۔شعری مجموعہ کوئی

اور ستارہ پر علامہ اقبال ہجرہ ایوارڈ عطا ہوا۔

اندازِ سخن:

کردیا شدتِ احساس نے پتھر توصیف
کوئی روتا ہے تو اب دل نہیں دکھتا میرا

☆

آئینہ خوف دلاتا ہے مجھے
اپنا چہرہ نظر آتا ہے مجھے

☆

لبوں پر پھر وہی نام آرہا ہے
کہیں خوشبو کا دروازہ کھلا ہے

☆

جو نیند آئے تو یہ پاگل ہوا سونے نہیں دیتی
عجب اک شور دروازے پہ پیہم دستکوں کا ہے

☆

سوچ سمجھ کر چلنا لوگو! قدم ذرا دھیرے رکھنا
پاؤں تلے کی اس مٹی میں ہوں گے راہ نورد بہت
مت بے دلی سے جھاڑیئے اب گردِ پیرہن
جو فاصلے بہت تھے وہ کم ہو چکے بہت

ڈاکٹر توصیف تبسم ماشاء اللہ ۹۲ سال کی عمر میں بھی اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ خدا اس مردِ قلندر کو مزید عمر صحت اور حوصلہ عطا فرمائے۔

☆...... پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر (۴ جنوری ۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر احسان اکبر ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو سیہور (بھوپال۔ ہندوستان) میں پیدا ہوئے آپ نے جس وقت ہوش سنبھالا یا شعری سفر شروع کیا' اس وقت برصغیر پاک و ہند میں ترقی پسند تحریک کا

دور دورہ تھا۔ جدید ادب کا شعور کروٹ لے رہا تھا آپ کی طبیعت نے کسی بھی تحریک کا اثر قبول نہ کیا ماسوائے دو قومی نظریے کے ادبی حوالے سے احسان اکبر نے روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا مگر نظم اور غزل میں جو طبع آزمائی کی ہے اس کی رو سے آپ کا شمار جدید شعراء میں ہوتا ہے آپ نے طویل نظمیں بھی لکھیں اور مختصر نظمیں بھی ان کا اسلوب ان کا اپنا اور منفرد ہے۔ انہوں نے اپنے حروف اپنے مصرعوں سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر کا اندازِ سخن:۔

آئنہ آئنہ کیوں کر دیکھے
اپنے ہی داغ نظر بھر دیکھے
زندگی بھر پڑھی تقدیر کی خفیہ تحریر
لوحِ مرقد سے پڑھوں گا آگے کا لکھا کیا ہے
کس اداسی سے مجھے اس نے مبارک دی ہے
جیسے اچھا نہ لگا ہو مرا اچھا ہونا
نہ تاج و تخت میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
وصلِ یار کی بھی قید سے رہا ہوا میں
ہوا تھا قیس کبھی ایک دوسرا ہوا میں

ڈاکٹر احسان اکبر ایک کثیر الجہتی ادیب ہیں آپ ایک استاد، مورخ، محقق' دانشو' ادیب' شاعر خط کمال کے موجود۔ تخلیقی خطاط۔ سفر نامہ نگار اور کالم نگار ہیں حکومت پاکستان نے ۲۰۱۵ میں آپ کو تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا آپ کی اہم تصانیف میں ہوا سے بات' ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ اور اقبال' آپ ایک کھرے اور سچے لکھاری اور استاد ہیں اپنا وقت مطالعہ کی نذر کرتے ہیں اور اپنا دکھ کسی سے نہیں کہتے ذیل ک اشعر اس بات کا مظہر ہے:

ہم اپنے درد ہواؤں سے بھی نہیں کہتے
اٹھائے پھرتے ہیں خود اپنے غم در و دیوار

فتح محمد ملک کے مطابق ''پروفیسر احسان اکبر آج کی اردو نظم کی آبرو ہیں انہوں نے اقبال، راشد اور ضیا کی روایت میں طویل فکری نظمیں لکھ کر آج کی اردو شاعری کو نئی تخلیقی زرخیزی سے بھی آشنا کیا ہے اور تازہ تر فکری رعنائی بھی عطا کی ہے۔''

☆...... جمیل یوسف (۲۲ دسمبر ۱۹۳۸ء)

جمیل یوسف کا تخلص جمیل ہے آپ کی پیدائش لانگہ ضلع چکوال کی ہے۔ آپ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام شیخ محمد یوسف ہے، آپ کی پہلی شعری کاوش ۱۹۵۲ء میں روزنامہ تعمیر پر اا کیڈمی میں شائع ہوئی، شاعری اور نثری طبع آزمائی اعلیٰ مقام کی ہیں آپ شاعر۔ نثر نگار' سفر نامہ نگار اور تنقید نگار ہیں پاکستان کے ادبی منظر نامے میں آپ ایک سلجھے ہوئے دیانت دار اور صاحب علم نقاد مانے جاتے ہیں' کچھ احباب آپ کو سفاک نقاد کہتے ہیں آپ کی تصانیف میں موج صدا' گریزاں (شعری مجموعے) غزل (شعری مجموعہ) جل پری کے دیس میں (سفر نامہ ڈنمارک) بابر سے ظفر تک (ایک نثری تصنیف۔ تاریخ کے متعلق) ایک کتاب مرتبہ ''خطوط بنام جمیل یوسف' ابتدائی تعلیم چکوال سے حاصل کی ایم اے کرنے کے بعد درس تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ اسی اثنا میں آپ نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور راولپنڈی میں رینٹ کنٹرولر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

ظفر اقبال کے مطابق ''جمیل یوسف ایک عمدہ شاعر تو ہیں ہی شاعری پر بھی گہری اور خصوصی نظر رکھتے ہیں 'ضمیر جعفری:''اس کا فن وسیع ہے خوش خرام ہے مگر بے سمت نہیں' اس کا نصب انسان کے فکر و شعور کی بالیدگی ہے......اس نے غزل کی تربیت کی ہے اس کو توڑا نہیں ہے۔''
پہلا شعر:

جام و مینا پھر سے کھنکے
نکلے ہیں ساقی بن ٹھن کے
☆
اب تو تیرے حسن کی ہر انجمن میں دھوم ہے
جس نے میرا حال دیکھا تیرا دیوانہ ہوا

☆
کیسے جیتا ہوں میں اس دور میں تو جانتا ہے
اے خدا! مجھ سے تیرا شکر ادا ہو کیسے
☆
حضرت واعظ تجھے میرا پتہ کیوں کر ملے
جسم کے کعبہ میں مانند خدا رہتا ہوں میں
☆
میں کم نظر میں بے ہنر میں بے خبر اور ایک تو
تو لامکاں تو بے نشاں تو بیکراں اور ایک میں
جس کو منظور نہ تھی میری رفاقت ہرگز
پوچھتا پھرتا ہے وہ میرا پتہ میرے بعد

ضمیر جعفری کہتے ہیں ''بری غزل اور اچھی غزل میں وہی فرق ہے جو خون خرابے میں اور جہاد میں ہوتا ہے۔ جمیل یوسف جہاد کرتا ہے۔''

☆...... رونق حیات (۱۴/جولائی ۱۹۵۴ء)

رونق حیات ۱۴ جولائی ۱۹۵۴ء کو کراچی میں پیدا ہوئے پرورش اور بود و باش لیاقت آباد المعروف لالوکھیت کراچی میں ہوئی' کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ رونق کراچی کے ادبی منظر نامے کی فعال شخصیت ہیں نظر انداز اہلِ قلم کی سرپرست تنظیم نیاز مندانِ کراچی کے بانی سرپرست اور روح رواں ہیں۔ آپ نے شاعری کی ابتدا ۱۹۷۱ء میں کی حضرت راغب مراد آبادی کے شاگرد بے بدل ہیں' صنفی اعتبار سے آپ کا شمار مقلدینِ جوش میں ہوتا ہے' آپ غزل نظم قطعات حمد نعت سلام اور ہائیکو میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فی البدیہہ ودیعت کے حامل ہیں' آپ کا شمار شعریت کی جذبات' احساسات' و رومان کی انتہائی حدوں کو چھو لینے والے نظم گو شاعر کے طور پر ہوتا ہے۔ دبستانِ کراچی میں آپ کی شہرت شاعرِ لمسیات کے طور پر ہوتی ہے۔ آپ کے نعتیہ کلام میں انتہائی عقیدت پائی جاتی ہے مگر اعراق وغلو سے مبرا ہے خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی نے اپنے تاثرات میں رونق حیات کی نعت گوئی اور شاعری کے

بارے میں اپنی رائے سے نوازتے ہوئے لکھا ہے کہ ''انہیں اپنی بات کہنے کا شاعرانہ سلیقہ آتا ہے ان کی تمام شاعری انسانی نفسیات' نازک جذبات، لطیف احساسات اور زندگی کے مشاہدات سے مصور ہے وہ ان شعراء میں سے ہیں جوفن شاعری پر دسترس رکھتے ہیں اور عروضی وفنی نکات سے صرف نظر نہیں کرتے۔ انتقادی تناظر میں ان کی شاعری کھری اور معتبر ہے۔ وہ عصرِ حاضر کے ممتاز اور جدید ذہن رکھنے والے قبیلہ شعراء میں سے ایک ہیں ان کی شاعری میں متحرک زندگی اوران کے سچے تجربات کا پورا چہرہ دکھائی دیتا ہے' رونق حیات نے بہت محتاط انداز میں نعتیں تخلیق کی ہیں۔ نعتوں کے لیے لفظوں کا چناؤ اوران کا برمحل استعمال ان کی قادر الکلامی کی شہادت ہے ان کی نعتوں کے موضوعات اوران کا تازہ رخ اسلوب' ان کی انفرادیت کا روشن ثبوت ہے''۔ آپ کی تصانیف میں ہجر کی کہکشاں' سورج کا گھر، قربتیں' دشت ہجر اشک رواں کا موسم اور نعتیہ کلام ''پاؤں چھونے کی طلب'' شامل ہیں جبکہ ایک محتاط اندازے کے مطابق زیرِ اشاعت وترتیب دس مجموعہ جات ہیں۔ رونق حیات کی شاہکار نظمیں جو حسیاتی ' لمسیاتی، جنسی اور معاشرتی تہذیبی مسائل پر لکھی گئی ہیں جو اس سے پہلے کم ہی ملتی ہیں۔

آپ کی نعت کا یہ شعر ایک شاہکار درجہ رکھتا ہے

بس یہی حدِ ادب ہے آقاؐ
پاؤں چھونے کی طلب ہے آقاؐ

آپ کا نعت لکھنے کا انداز جداگانہ ہے مگران کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں مطلع سے پہلے نعت کا ایک شعر تسلسل سے اپنی بہار رکھا رہا ہے ملاحظہ ہو:

رات رہ جائے گی گھر میں رت جگا رہ جائے
تم نہیں ہوگے تو میرے پاس کیا رہ جائے گا
جب نہیں کچھ بھی رہے گا میرے ہاتھوں میں تو پھر
دامنِ حضرت محمدؐ مصطفیٰ رہ جائے گا
پھر اس کے بعد مجھے کوئی جستجو نہ رہی
ہوئی ہے جب سے مدینے کی جستجو مجھ کو

173

☆

ہر زمانے پہ ہے کرم اُنؐ کا
ہر زمانہ مِرے حضورؐ کا ہے

☆

حیاتِ پاک نبی جب مِری نظر میں رہی
مِرے وجود میں اک روشنی سفر میں رہی

رونق حیات کی غزلیں اور نظمیں نیز قطعات کا آہنگ بڑا دلکش ہے جس میں حسن وعشق اور بے باک رومانی لہجہ ان کی پہچان بن چکا ہے وہ لفظوں کی جادوگری سے انسانی نفسیات' نازک جذبات' لطیف احساسات اور لمسیاتی عنصر کو اس انداز سے نمایاں کرتے ہیں کہ سامع اور قاری دونوں دم بخود رہ جاتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

دامن مری وفا کا جو اشکوں سے بھر گئے
اے چشم نم بتا! وہ کہاں اور کدھر گئے
جن سے ملے بغیر گذرتا نہیں تھا دن
اُن سے ملے بغیر زمانے گزر گئے

☆

وہی میری ایک خواہش جسے سب گناہ سمجھے
وہ گناہ مجھ سے رونق ، یونہی باربار ہوتا رہا

☆

جس رات تیرے دل نے مری دھڑکنیں سنیں
وہ یادگار رات تباہی کی زد میں ہے

☆

بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں
سوچا نہیں کہ ایک سمندر ہے سامنے

☆

جو محبت سے ملا کرتا ہے مل لیتے ہم
کون جانے کس گھڑی یہ رکھ رکھاؤ ختم ہو

☆

تجھ سے بچھڑے تو یوں لگا ہم کو
مدتوں بعد خواب سے نکلے

رونق حیات کی شاعری روایت، جدّت اور مابعد جدیدیت کے دور میں رومان پروری کے ساتھ لطیف جذبات احساسات اور لمسیات کا امتزاج لیے اردو شاعری میں قوس قزح کے رنگ بکھیر رہی ہے وہ اپنے احساسات جذبات کی ترجمانی نہایت سہل انداز میں اس طرح کرتے ہیں کہ بلا امتیاز عمر ہر ایک سامع و قاری خود کو جوان سمجھنے لگتا ہے۔

☆...... وصی شاہ (۲۱ جنوری ۱۹۷۳ء)

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کردو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کردو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کردو

سید وصی شاہ عہد حاضر کی رومان پرور شاعری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں آپ ۲۱ جنوری ۱۹۷۳ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے آپ کا شاعری کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن میزبان کے فرائض اور صحافی ذمے داری کالم نگاری کی صورت میں بھی ایک نام ہے۔کئی اخبارات میں کالم نگاری کرتے رہتے ہیں۔

وصی شاہ کی شاعری میں وہ نام دنیاوی الگ نمایاں ہیں جو زندگی کی ترنگ کے لیے ضروری ہیں جذبات کو چھو لینے والی منظر نگاری وصی شاہ کا خاصہ ہے۔ان کے کلام میں اثر آفرینی بھی ہے اور دردمندی بھی ہجر و فراق بھی ہے اور امید وصال بھی مگر وہ ہر حال میں خود کو مسرور رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے محبوب کے حضور اس طرح سے حاضر رہتے ہیں جیسے چاروں طرف گلاب اور موتیا

کے گجرے مہک رہے ہیں اور وہ محبوب کے تصور میں شام غم کو بھلانا چاہتے ہیں۔ وصی شاہ کا انداز سخن ملاحظہ کیجیے:

آج بھی وہ تقدس بھری رات مہکی ہوئی ہے وصی
میں کسی میں، کوئی مجھ میں ڈھلتا رہا، چاند جلتا رہا

☆

اب آیا ہے جب کام دکھا بھی گیا ساون، مرے ساجن
جب چارسو میرے لیے خوشیوں کا سماں تھا تو کہاں تھا
سوچتے ہیں تجھے وضو کرکے
یوں ترا احترام کرتے ہیں
اس نے یہ میری محبت کو نیا موڑ دیا ہے
آج میرے لیے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے

☆

ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

☆

باندھ لیں ہاتھ پہ سینے پہ سجالیں تم کو
جی میں آتا ہے کہ تعویذ بنالیں تم کو

☆

یہ جو پانی میں چلا آیا سنہری سا غرور
اس نے دریا میں کہیں پاؤں اتارا ہوگا

وصی شاہ کے شعری اثاثہ جات میں مجھے صندل کردو، مرے ہو کے رہو، آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، اور میرے خواب تمہاری آنکھیں، شامل ہیں وصی شاہ کچھ بھی لکھ دیں، کتنے دیوان لکھ دیں مگر اردو شاعری

کے دلدادہ وصی شاہ کو کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا کے حوالے سے سدا یاد رکھیں گے۔

☆...... اقبال خاور (۹/اگست ۱۹۶۴ء)

اقبال خاور ۹ اگست ۱۹۶۴ء میں سندھ کے مشہور شہر لاڑکانہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم لاڑکاہ سے حاصل کی بعد ازاں کراچی میں تعلیم مکمل کی۔ آپ کا تعلق کراچی شہر کے ادبی منظر نامے کے اہم شعراء کے ہراول دستے سے ہے' آج کل اے آر وائی چینل سے منسلک ہیں۔ اقبال خاور ایک تازہ کار شاعر ہیں گو کہ ان کا شمار ایک نظریہ رکھنے والے شعراء میں ہوتا ہے مگر وہ ہاؤ ہوان کی شاعری سے دور ہے وہ خالصتاً جمالیاتی حس کے شاعر ہیں جو روایت سے جڑے ہوئے ہیں مگر سماج کے بدلتے رویوں اور انسان کی بےبسی و بےحسی پر گہری نظر ہے اس طرح وہ مادی و معاشرتی طور پر اپنی اساس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اقبال خاور قدیم استعاروں علامتوں اور تشبیہات پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ وہ ارد گرد بکھرے ہوئے مضامین کو اپنے انداز میں نظم کرتے ہیں ان کے کلام میں سادگی روانی اور حسن و عشق کی جمالیات نظر آتی ہے وہ اپنے اندر کی گھٹن کو اپنی شاعری میں سمو کر اپنے دل کی آواز بنا کر غزل کو حسین بنا دیتے ہیں۔

کل اس طرح سے سمیٹے ہوئے تھا وہ پیرہن
جیسے کہ اس بدن سے عیاں ہو رہا تھا میں

☆

تو بھی دیکھے گا ذرا رنگ اتر لیں تیرے
ہم ہی رکھتے ہیں تجھے یاد کہ سب رکھتے ہیں

☆

گلاب میں نظر آئی نہ موتیے میں کبھی
کسی کے چہرے پہ ہم نے جو تازگی دیکھی

☆

نہ جانے بھیگ رہی ہیں ابھی سے کیوں آنکھیں
ابھی نہ شام ہوئی ہے نہ یاد آیا وہ

☆

سبک خرام تھا خاور وہ خوش ادا تھا بہت
جو میرے دھیان میں آتا ہے شور کرتا ہوا

☆

دل مرا ڈوبنے لگا صاحب
ہوگیا وقت اُس کے جانے کا

☆

تمہیں دکھاتا وہ مجھ سے ملا تھا کل کیسے
کہ ساتھ ہوتا جو تصویر کھینچنے والا

☆

نیند مت ڈھونڈ میری آنکھوں میں
سلوٹیں دیکھ میرے بستر کی

آپ کے شعری مجموعے جو حرف لکھا تھا تجھے یاد کیا اور 'رنگ بدل رہے ہیں خواب' اشاعت پذیر ہو کر قارئین سے قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

☆...... وفا چشتی (۱۷ جون ۱۹۵۳ء)

محمد رفیق وفا چشتی المعروف وفا چشتی ۱۷ جون ۱۹۵۳ء ڈیرہ نواب صاحب ضلع بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ اپنے اساس کے اعتبار سے اردو اور پنجابی سرائیکی میں شاعری فرماتے ہیں آپ کی سخن آرائی غزل' نظم' کافی' دوہڑے پر مشتمل ہے جبکہ نثر نگاری میں آپ کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں۔ بسلسلہ روزگار آپ اے جی پی آر سے منسلک رہے۔ ۲۰۱۲ء میں آپ کا شعری مجموعہ دریاب شائع ہوا جبکہ کثیر تعداد میں غیر مطبوعہ کلام اشاعت کا منتظر ہے گوشہ اَدب پاکستان کے بانی ہیں' آپ کے کلام میں صحرا، چاند اور چاندنی کا ذکر ملتا ہے۔ عشق محبت و فراق کی باتیں حقیقت سے قریب تر ہیں۔ خواجہ غلام فرید سے گہری عقیدت رکھتے ہیں جبکہ نعت حمد سلام اور منقبت میں اپنے

افکار کا اظہار بڑے قرینے سے کیا ہے‘ آپ کا شمار شاعر گریہ و فراق میں ہوتا ہے۔

کڑی سزاؤں نے چہرہ کچھ ایسا بدلا ہے
کہ آئینہ بھی مجھے حیرتوں سے تکتا ہے

☆

جو غریقِ ملال ہوتا ہے
آشنائے جمال ہوتا ہے

☆

پھول کے حُسن میں شعلے بھی نمو پاتے ہیں
راکھ بھی چہرہ نما رہتی ہے انگاروں میں

☆

سیڑھیاں چڑھ رہی ہے صدیوں سے
زندگی بام پر نہیں آئی

وفا چشتی کے نعت کے اشعار:

کرم ہوا جو مرے شہرِ یارِ مصطفیٰ کا
تو باریاب ہوئی دل کی جستجوئے رسولؐ

اسلام آباد کی ادبی فضاؤں میں ایک متحرک کردار کے حامل ہیں ڈاکٹر فرحت عباسی‘ جمیل یوسف‘ نسیم سحر کے قریبی ساتھیوں میں سے ہیں۔

وفا چشتی کا ایک شعر:

لہو لہو سی کوئی شے اداس آنکھوں میں
شفق ہے شام ہے کیا ہے اداس آنکھوں میں

وفا چشتی اپنے لہجے میں گریہ، فراق، حسن و عشق‘ انسانی اور سماجی رویوں سے کھیلتے ہوئے اپنے شعری سفر کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

☆...... سعد الدین سعد (۱۱ جنوری ۱۹۴۵)

سعد الدین سعد ۱۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو گلبرگہ حیدر آباد دکن انڈیا میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی سلسلہ معاش میں محکمہ ٹی اینڈ ٹی نیشنل بنک آف پاکستان اور حبیب بینک لمیٹڈ سے منسلک رہے بعد ازاں والد صاحب کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ شعر وسخن کے ساتھ موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ستار اور گھنگھرؤں کی آواز منہ سے نکالنے میں شہرت رکھتے ہیں کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے رکن ہیں جب کہ نظر انداز اہل قلم کی تنظیم نیاز مندان کراچی کے بانی رکن اور فعال و متحرک ساتھی ہیں۔ آپ مشاعرے میں ترنم کے ساتھ جب کلام پڑھتے ہیں تو سامعین پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں آپ کی شاعری روایت کی پاسدار ہے حسن و عشق، ہجر و فراق‘ کربِ تنہائی‘ حسرت و یاس جیسے مضامین شعری سفر کے ساتھی ہیں۔ غزل آپ کی محبوب صنف ہے سعد الدین سعد کا پہلا شعر ملاحظہ ہو جو اسکول کے دور میں موزوں کیا:

جستجوئے شوقِ منزل آج لے آئی کہاں
آستاں ہوتے ہیں پیدا سر جہاں رکھتا ہوں میں

دیگر اشعار میں انداز سخن ملاحظہ ہو:

تیرگی شب کی دیکھنے کے لیے
آج کچھ آفتاب آئے ہیں
اپنے چہرے پہ بھروسہ ہے تو کھل کر ہنسیے
ورنہ چہرے تو بدل جاتے ہیں شرمانے سے

☆

خواب پلکوں سے ڈھلے ہیں شاید
تیری آنکھوں کے کنارے چمکے

☆

اک آبنوسی شام میں اس نے کہا تھا سعد
تم ساتھ ہو ہم رنگ سفر دیکھ رہے ہیں

سعدالدین سعد نیاز مندان کراچی کے علاوہ شہر میں ہونے والی ادبی تقاریب میں شریک رہتے ہیں اور اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہیں امید ہے کہ ان کا غیر مطبوعہ کلام بہت جلد اربابِ اقتدار کی سرپرستی سے جلد اشاعت پذیر ہوگا۔

☆...... باقی احمد پوری (۱۲/مارچ ۱۹۵۰ء)

سید مقبول حسین بخاری المعروف باقی احمد پوری ۱۲ مارچ ۱۹۵۰ء کو احمد پور شرقیہ ضلع رحیم یار خان پاکستان میں پیدا ہوئے۔ احمد پور کی مناسبت سے تخلص باقی کے ساتھ احمد پوری کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں، غزل کے جدید اور مابعد جدید عہد کے ایک اہم ادیب کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزل، نظم، حمد، نعت، سلام، قطعات، رباعیات، مستزاد اور ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ابتدا میں پابند اور آزاد نظمیں بھی تخلیق کیں مگر اب غزل پر توجہ زیادہ رہتی ہے۔ باقی احمد پوری صحافت کے میدان میں بھی سرگرم عمل ہیں مختلف اخبارات و رسائل میں کالم نگاری کرتے رہتے ہیں آپ کے شعری اثاثہ جات میں باقیات، نقش باقی، صدر شک، غزالاں، اداسی کم نہیں ہوتی۔ غزل تم ہو۔ اگر آنکھیں چھلک جائیں، روانی، ہمارا کیا ہے اور والہانہ شامل ہیں آپ کا شمار زود گو مگر پر معنی اشعار کہنے والے شعراء میں ہوتا ہے۔ باقی احمد پوری کا اپنا منفرد انداز اپنا ایک مزاج ہے جو اُن کی شاعری میں خوب جھلکتا ہے آپ نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ترقی پسند، جدید شاعری اور مابعد جدید عہد میں مثبت انداز میں شاعری کی ہے۔ آپ شعری سفر میں علامہ ماہر القادری سے تلمیذ ہیں۔

میرا جواب کیا تھا، تجھے بھی خبر نہیں
یاد اب ترا سوال، مجھے بھی نہیں رہا

☆

خود وہ ڈھاتے ہیں قیامت پھر بھی
پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہے

☆

دوست ناراض ہوگئے کتنے
اک ذرا آئنہ دکھانے میں

☆

ساری بستی میں فقط میرا ہی گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتہ مل جائے گا

☆

کوئی کب ساتھ چلتا ہے کسی کے
غرض کی ہی رفاقت رہ گئی ہے

☆

تم نے محلوں کے علاوہ نہیں دیکھا کچھ بھی
ہم تو فٹ پاتھ پہ سولیں گے ہمارا کیا ہے
فقیہہِ شہر سے انصاف کون مانگے گا
فقیہِ شہر تو سر کاٹنے کو آتا ہے

آپ کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے جہاں آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پردیس میں ہوں یا لاہور میں احمد پور سے آپ کا تعلق قائم ہے، باقی احمد پوری کہتے ہیں کہ ''میں کوئی انقلابی یا ہنگامی قسم کا شاعر نہیں مگر انسانیت کے خلاف جو رویے معاشرے میں رواج پا رہے ہیں ان کے خلاف دھیمے لہجے میں ہی سہی آواز میں نے بھی اٹھائی ہے میری یہ آواز بلند بانگ نہیں مگر دوررس ضرور ہے۔'' ایسی ہی آواز ایک انقلاب کی نقیب ہوتی ہے۔

☆...... رئیس فروغ (۱۵فروری ۱۹۲۶ء تا ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء)

آپ کا نام محمد یونس حسن اور تخلص فروغ تھا۔ آپ ۱۵/فروری کو مرادآباد یوپی ہندوستان

میں سید محمد یوسف حسن کے گھر پیدا ہوئے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ٹھٹھہ بعد ازاں کراچی میں رہائش پذیر ہوگئے کراچی پورٹ ٹرسٹ اور ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے اردو جدید شاعری، جدید غزل میں رئیس فروغ ایک اہم اور غیر متنازعہ نام ہے۔ رات بہت ہوا چلی کے مطالعہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کا اسلوب شاعری اپنی اساس سے جڑا ہوا ہے اپنی جنم بھومی اور بود و باش نیز ماحول کا تذکرہ، دیہاتی اور قصباتی یادداشتیں اپنی جگہ موجود ہیں۔

اب کی رت میں جب دھرتی کو برکھا کی مہکار ملے
میرے بدن کی مٹی کو بھی رنگوں میں نہلا دینا
ہم بھی لے کو تیز کریں گے بوندوں کی بوچھار کے ساتھ
پہلا ساون جھولنے والو تم بھی پینگ بڑھا دینا

اردو غزل میں ایسے مضامین کم کم ملتے ہیں البتہ نظم کے میدان میں ایسے مضامین عمومی ہوتے ہیں رئیس فروغ ان مضامین کو بیان کرتے ہوئے ہندی اور انگریزی بھی استعمال کرتے ہیں ان کی نظمیں اور غزلیں منفرد انداز کی ہیں کہ ان کے اسلوب اور اندازِ سخن کو جدید شاعری کے میدان میں فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ آپ کی شعری تصانیف میں رات بہت ہوا چلی، اور ہم سورج چاند ستارے شامل ہیں۔ نیز رئیس فروغ نئی جہتیں (غزلوں کا انتخاب) شامل ہیں۔ خالد معین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''جدید اسلوب اور طرز بیان کے حامل رئیس فروغ یقیناً میرے پسندیدہ ترین شعراء کی فہرست میں شامل ہیں۔ وہ ایک حساس، گہرے، نازک مزاج، خوش نظر، خوش خیال عصری تقاضوں کے نبض شناس کلاسیکی شعور سے بہرہ مند اور جدید حسیت کے خلاقانہ برتاؤ کے ساتھ لفظوں کے شاعرانہ استعمال اور ان کی رمزیت پر نگاہ رکھنے والے شاعر ہیں۔ رئیس فروغ ستّر کی دہائی میں ادبی منظر نامے پر موجود تخلیقی نسل کے درمیان ایک جداگانہ انفرادیت کے ساتھ نمایاں ہوئے اور جلد ہی اپنے مخصوص لب و لہجے طرزِ ادا اور جمالیاتی شعور کی گہری انفرادیت کے باعث اپنے ہم عصروں میں جداگانہ مقام بناتے چلے گئے۔''

ڈاکٹر شاداب احسانی کے مطابق ''برصغیر میں جدید شاعری کا ذکر رئیس فروغ کے بغیر

ممکن نہیں ہے۔ رئیس فروغ کی شاعری تکنیکی لحاظ سے بہت مضبوط شاعری ہے ان کے خیالات کی اونچائی تک پہنچنا اور اسے سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔

رئیس فروغ کا اندازِ سخن:

میرے آنگن کی اداسی نہ گئی
روز مہمان بلائے میں نے

☆

اپنے حالات سے میں صلح تو کرلوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مرجائے گا

☆

حسن کو حُسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کرسکتے

☆

رات بہت ہوا چلی اور شجر بہت ڈرے
میں بھی ذرا ذرا ڈرا مجھے بھی نیند آ گئی
اپنے ہی شب و روز میں آباد رہا کر
ہم لوگ برے لوگ ہیں ہم سے نہ ملا کر

☆

غصے سے دوڑتے ہیں ٹرک بھی لدے ہوئے
میں بھی بھرا ہوا بہت انقام سے

☆

رفو گر چاند نکلا ہے نہ تارے ہیں نہ جگنو ہیں
رفو گر اپنے ہاتھوں کے اجالے میں رفو کرنا

☆

لوگ اچھے ہیں بہت دل میں اتر جاتے ہیں
اک برائی ہے تو بس یہ ہے کہ مر جاتے ہیں

رئیس فروغ کے مشن کو ان کے صاحبزادے طارق رئیس فروغ آگے بڑھا رہے ہیں۔ رات بہت ہوا چلی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی' اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طارق رئیس فروغ نے شائع کرنے کا اہتمام کیا اور رئیس فروغ کی مسترد شدہ غزلیں' رئیس فروغ' نئی جہتیں کا بھی اہتمام طارق کے حصے میں آیا۔ شام کے ڈھلتے سائے یا شب کے سائے میں جب گلوکارہ ریشماں کی آواز ''میری ہم جولیاں کچھ یہاں کچھ وہاں'' گونجتی ہے تو رئیس فروغ کا شعری وجدان سر چڑھ کر بولتا ہے۔ رئیس فروغ کے شعری مجموعے رات بہت ہوا چلی کو رائٹرز گلڈ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆...... اعتبار ساجد (یکم جولائی ۱۹۴۸ء)

سید اعتبار حسین جنہیں ادبی دنیا اعتبار ساجد کے نام سے جانتی ہے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ نوشکی' کوئٹہ' اسلام آباد اور لاہور میں پوسٹنگ رہی۔ ملتان میں مقیم ہیں۔ شعر و نثر دونوں میں تخلیقات موجود ہیں۔ ان کا ذکر خیر میرے استاد محترم جناب اذفر زیدی نے بھی فرمایا تھا۔ اعتبار ساجد کی شاعری روایات کی پاسداری ہے وہ شعری اقدار کو مقدم رکھتے ہیں اعتبار ساجد اردو ادب کے منظر نامے میں ایک اعتبار کی حیثیت سے ابھرے اور ادبی افق پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے کم و بیش ساٹھ (۶۰) تصانیف اس بات کا ثبوت ہیں۔ آپ کے شعری مجموعے دستک بند کواڑوں پر' آمد' وہی ایک زخم، گلاب سا، مجھے کوئی شام ادھار دو، یہ شام تمہارے نام، آخر شب کا انتظار، وہ دیا بھی نہیں رہا' جانم' سرخ گلابوں کا موسم' یہ موسم یونہی بیت گیا' پورے چاند کی رات' پذیرائی' ہم بھی کسی کے خواب تھے' تمہیں کتنا چاہتے ہیں، روز یاد کرتے ہو' وہ سنہری دھوپ کہاں گئی' بات مگر اظہار کی ہے' اجنبی گلیوں میں شام۔

نثری تخلیقات میں شاعری کیسے کریں' بھارت میں چند روز' دیارِ حبیب میں' میرے اجنبی میرے آشنا' قلم کی کہانی' ریت میں گلاب' سیتا پور کی آگ' بھونچال (افسانے)' گلوب پر

اجنبی' قلم کاریاں' مزید قلم کاریاں' کارستانیاں' جا بیل اُسے مار (کالموں کا مجموعہ)' راجو کی سر گذشت' آدم پور کا راجہ' سیلاب (بچوں کا ادب) اور دیگر تصانیف۔
رنگ سخن ملاحظہ کیجیے:

مسلسل گفتگو بھی اپنی وحشت کو بڑھاتی ہے
مسلسل چپ بھی کوئی ہم سفر اچھا نہیں لگتا

☆

گفتگو دیر سے جاری ہے نتیجے کے بغیر
سانس لینا بھی ہے دشوار کہیں اور چلیں

☆

ارادہ کرلیا ہے تم نے گر سچ مچ بچھڑنے کا
تو پھر اپنے سارے وعدہ و پیمان لے جانا

☆

اب تو خود اپنی ضرورت بھی نہیں ہے ہم کو
وہ بھی دن تھے کہ کبھی تیری ضرورت ہم تھے
گونجتے رہتے ہیں سنّاٹے اکیلے گھر میں
در و دیوار کو وہ ایسا دکھی چھوڑ گیا

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق لکھتی ہیں کہ ''اعتبار ساجد' بیانِ علم عروض' بیانِ شعر' بیانِ فصاحت' علم بیان' علم بدیع' صنائع لفظی اور ہر صنفِ سخن پر پوری قدرت رکھنے والا شاعر بے مثال ہے۔'' احسان دانش کہتے ہیں کہ ''اعتبار ساجد کے اشعار اس کی شاعرانہ عظمت کے اور ماہرانہ برتری کے ترجمان ہیں کیونکہ فن کار کی زندگی فن کی زبان سے اپنا تعارف کراتی ہے'' ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں ''مجھے اعتبار ساجد کی غزل میں بڑے امکانات دکھائی دیتے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اگر اس کی مٹی اسی طرح چاک کی گردش میں رہی تو ایک دن وہ ایک ایسے ظروف میں ڈھل جائے گا جس سے دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جایا کریں گی۔''

اسی بات کا اظہار اعتبار ساجد نے اپنی شعری قد و قامت کے بارے میں لکھا ہے کہ

کوئی قیس تھا تو ہوگا کوئی کوہ کن تھا ہوگا
میرے رنج مختلف ہیں مجھے اُن سے مت ملاؤ

اعتبار ساجد سچا اور کھرا شاعر ہے' آپ کہتے ہیں کہ ''میں تو جھوٹے لفظ لکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا' شعر کے سلسلے میں میرا ایقان ہے کہ زندگی میں جھوٹ چل سکتا ہے' شاعری میں جھوٹ نہیں چل سکتا۔''

کیا خبر لوٹ کے آئیں نہ مسافر تیرے
رات ڈھل جائے یہ دروازے کھلے رہ جائیں

☆...... حضرت رئیس امروہوی (۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء۔۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء)

کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں
ملبوسِ بہار سی رہا ہوں
(رئیس امروہوی)

پاکستان کے ادبی منظرنامے پر شہرت سے ہمکنار ہونے والے رئیس امروہوی کا نام سید محمد مہدی اور تخلص رئیس تھا' آپ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو امروہہ میں سید شفیق حسن ایلیا کے گھر پیدا ہوئے۔ امروہہ کا یہ سادات گھرانہ علمی و ادبی نعمتوں سے مالا مال تھا' جون ایلیا' سید محمد عباس اور سید محمد تقی آپ کے بھائی تھے۔ رئیس امروہوی کی ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ ۱۳ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ ایک شاعر' نثر نگار' دانشور' فلسفی' قطعہ نگار' کالم نگار' ماہر ہپناٹیزم اور ماہر یوگا مشہور ہیں۔ آپ کے موضوعات میں فلسفہ' سماجیات' سیاسیات' اخلاقیات' نفسیات' مابعد الطبیعات' یوگا' علم نجوم' علم فلکیات' ہپناٹزم' شمع بینی' مسمریزم و دیگر علوم شامل ہیں۔ آپ روزنامہ جنگ کراچی سے وابستہ رہے آپ کو اردو' انگریزی' عربی' فارسی پر عبور حاصل تھا۔ روزنامہ جنگ میں حالات حاضرہ پر روزانہ ایک قطعہ لکھتے رہے۔ شاید یہ سلسلہ ۴۱ برس تک جاری رہا آپ کی شعری و نثری تصانیف کی تعداد تین درجن سے

زیادہ ہے جن میں الف۔ پس غبار۔ حکایات نے' ملبوس بہار' قطعات' بحضرتِ یزداں' نجم السحر' آثار' انا من الحسین' آثار جبکہ نثری تصانیف میں نفسیات و مابعد نفسیات' عجائب نفس (چار جلدیں)' لے سانس بھی آہستہ' جنسیات' عالم برزخ' حاضرات ارواح' اچھے مرزا' آپ بیسویں صدی کے سب سے بڑے قطعہ نگار تھے۔ رئیس امروہوی کا شمار زود گو شعرا میں ہوتا ہے آپ ایک قادر الکلام شاعر تھے آپ کی زبان میں فصاحت و بلاغت' شعر گوئی میں سلاست' نظر میں وسعت اور کلام میں بلا کی روانی ہے۔ آپ کے قطعات انتہائی سادہ اور سلیس ہیں آپ کا ایک مصرعہ زبان زد عام رہا ہے:

''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''

رئیس امروہوی کے قطعات:

ہم لوگ ہیں واقعی عجوبہ
کیوں آپ میں مست ہیں نہ جانے
سنتے ہیں ہنوز بی بی سی سے
آل انڈیا ریڈیو سے گانے

جو لوگ اپنے قول کو قانون سمجھیں
وہ قائل ہو نہیں سکتے ابد تک
بہت سے لوگ یارانِ وطن میں
محقق ہیں مگر حقّے کی حد تک

رئیس امروہوی کا شعری انداز سخن ملاحظہ کیجیے:

آدمی کی تلاش میں ہے خدا
آدمی کو خدا نہیں ملتا

کس نے دیکھے ہیں تری روح کے رستے ہوئے زخم
کون اترا ہے ترے قلب کی گہرائی میں

اب دل کی یہ شکل ہوگئی ہے
جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے
میں تنہا جارہا ہوں سوئے منزل
یہ پرچھائیں کہاں سے آرہی ہے
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ
رہِ طلب میں مرے پیش رو جو چھوڑ گئے
برہنہ پا انہی کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں
یہ کون میرے قریب آرہا ہے
خود میرے ہی نقشِ پا پہ چل کر

حکومت پاکستان ۱۹۸۴ء میں آپ کی علمی ادبی وشعری خدمات کے اعتراف میں تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ رئیس امروہوی اپنے شعری سفر کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''شعر سے میرا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی ہے میں نے ہوش کی آنکھیں نہیں سر کی آنکھیں کھول کر اپنے گردوپیش شاعری اور شعر ہی کو جلوہ گر پایا'' اردو ادب کے عالمی افق کا یہ روشن ستارہ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایک نادیدہ اجل کا نشانہ بن گیا۔

☆...... عارف منصور (۲۳ جولائی ۱۹۵۰ء تا ے فروری ۲۰۱۶)

دوپہر تھی ستم کی تمازت بھری ظلم کی اڑتی پھرتی تھیں چنگاریاں
ہوگیا آپؐ کو حوضِ کوثر عطا' آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

محولہ بالا نعت کے خالق عارف منصور (تنویر عارف خان) ۲۳ جولائی ۱۹۵۰ء کو ملتان میں وزیر احمد خان کے گھر پیدا ہوئے آپ ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ آپ کی طبیعت میں سادگی اور منکسر المزاجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر انتظامی امور کے اعتبار سے بہت پابند تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ملتان سے لاہور چلے گئے چند جاسوسی ناول لکھے۔ ٹی وی پر بھی

181

قسمت آزمائی کی۔ ۱۹۷۶ء میں سول ایوی ایشن اتھارٹی میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سیکورٹی آفیسر منتخب ہوئے اسی شعبے میں مختلف شہروں میں رہ کر ۲۰۱۰ء میں فرائض منصبی سے بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

اولاً اردو شاعری میں منصور ملتانی کے نام سے پہچانے جاتے تھے بعد ازاں آپ نے اپنا قلمی نام منصور عارف رکھ لیا۔ ۱۹۸۹ء میں آپ کا پہلا غزلیہ مجموعہ ''سورج زمین پر'' شائع ہوا۔ حرمین شریفین کی زیارت کے بعد آپ کے خیالات میں تبدیلی آئی اور آپ کا دل اور قلم نعتِ رسولؐ کی جانب مائل ہوگیا اپنی آخری عمر تک نعت گوئی پر توجہ رہی مگر غزل کو بھی تھامے رکھا۔ آپ نے نبی پاکؐ کے ننانوے (۹۹) ناموں پر مشتمل ننانوے (۹۹) قطعات کہے (مُرسِل و مُرسَل)۔ آپ کے کلام میں سلاست' سادگی بے ساختہ پن اور قادر الکلامی کا عنصر نمایاں ہے۔ آپ نے غزل' نظم' قطعہ' رباعی میں کامیابی سے طبع آزمائی کی۔
آپ کا اندازِ سخن:

جو مجھ میں دوسرا ہے سب جسے منصور کہتے ہیں
مجھے بھی آج اس شوریدہ سر سے بات کرنی ہے
فاصلہ ہی جنوں میں کتنا ہے
اک قدم اختیار سے باہر
☆
ارتعاش آگہی کو اک نظر مطلوب ہے
جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کو کنکر چاہیے
☆
کہانی لکھتے چلے جارہے ہو قسطوں میں
اب اگلی قسط میں کس کس کا نام لکھو گے
☆
منصور جب ملی نہیں جائے اماں کوئی
بس باخبر نہیں ہوں میں اپنے مقام سے

☆

خود آ گئے ہو دار و رسن کی پناہ میں
ویسے تو کُل جہان ہے میری نگاہ میں

☆

کوئی سودا بھی مکمل نہیں ہونے دیتی
زندگی روز خریدار بدل دیتی ہے

نعت کا ایک اور رنگ

کاش اس بار ہم آئے ہوں حضوری کے لیے
آپؐ کے شہر میں رہ جانے کی قسمت لے کر

حقیقت میں فقط موجود تو ہے
مجھے خود اپنے ہونے کا گماں تھا

۷فروری ۲۰۱۶ء کو یہ سادہ دل مگر پروقار شاعر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔

☆...... حجاب عباسی (۱۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء)

حجاب عباسی کا اصلی نام حجاب بانو ہے وہ ۱۴ اکتوبر کو کراچی میں پیدا ہوئیں آپ کا تعلق ایک علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ علم و ادب کا گہوارہ بچپن ہی سے میسر آیا جس کی وجہ سے بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ فطری ہے آپ کا شعروسخن، ڈرامہ نگاری، افسانہ نگاری سے گہرا شغف ہے ایک ادبی سلسلہ ''ادب عالیہ'' کی مدیرہ ہیں ۔ مشاعرے کے ساتھ ریڈیو پر اناؤنسمنٹ، نیوز کمنٹری اور ڈاکیومنٹری پڑھتی رہی ہیں۔ ریڈیو پر کم و بیش سو (۱۰۰) ڈراموں اور فیچرز میں حصہ لیا آپ کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں تجدید ہجر (۲۰۰۶) تحریرِ ہجر (۲۰۱۱) ثباتِ ہجر (۲۰۱۳) اور عکس جلال و جمال (۲۰۱۶) شامل ہیں آپ کا شعری سفر تقریباً پانچ دہائیوں پر مشتمل ہے جو کامیابی سے جاری ہے حجاب عباسی نے یوں تو دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر غزل ان کا خاص رنگ ہے۔ آپ کی زندگی میں رکھ رکھاؤ، سچائی اور کھرا پن ہے اور یہی ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور روانی ہے

حجاب مشکل الفاظ، مشکل تشبیہات سے دامن بچا کر اپنی شاعری میں جاذبیت کا رنگ ابھارتی ہیں مگر سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔

حجاب عباسی کا نعت رنگ:

نعت جب لکھی ہے کاغذ پر
روشنی ہوگئی ہے کاغذ پر
مدینے کی ہوائیں جس کو چھو لیں
معطّر اس کے جان و دل ہمیشہ

غزل کا انداز:

میں جب دنیا میں آئی تھی وہ میری پہلی ہجرت تھی
اسی ہجرت میں قرطاس و قلم سامان میں آیا

☆

میرے کمرے سے آئینے ہٹادو
یہ عورت میرے پیچھے پڑ گئی ہے
دل و نظر میں جو بس جائے دل ربا ٹھہرے
کہ دل ربائی کوئی ذات تھوڑی ہے

☆

اب ہاتھ نہ پھیلائیں گے ہم غیر کے آگے
رکھتے ہیں حجاب ارض و سما اپنی نظر میں

☆

کبھی دولت کبھی چڑھتے سورج کی پوجا ہے
میں حیران ہوں تمہیں کتنے خداؤں کی ضرورت ہے
گئے وہ دن کہ جب آگے سبھی غدار ہوتے تھے
سواب اگلی صفوں میں رہنماؤں کی ضرورت ہے

حجاب عباسی اپنے خاندانی، علمی گھوارے کو مدنظر رکھ کر ادبی میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں خواتین شاعرات میں ایک مقام بنا چکی ہیں جبکہ شعری ونثری میدان میں مزید کامیابیوں کے لیے کوشاں ہیں۔ خدا انہیں مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔

☆...... شاعر علی شاعر (۲۰ جون ۱۹۶۶ء)

شاعر علی نام بھی ہے اور تخلص بھی شاعر علی شاعر ۲۰ جون ۱۹۶۶ کو مدینۃ الاولیا ملتان میں جناب فیاض دہلوی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان نے قیام پاکستان کے نتیجے میں ہجرت کی اور ملتان میں آباد ہوا۔ ایم اے (اردو) اور ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ شاعر علی شاعر کا شمار ان نابغہ رزگار ہستیوں میں ہوتا ہے کہ جن کا اوڑھنا بچھونا اردو ادب کی ترویج واشاعت بن چکا ہے' وہ شبانہ روز اس اہم مشن/ کارواں کو آگے بڑھا رہے ہیں اور دنیا کی نگاہوں سے محض ادباء اور شعراء کی تحقیقی وتخلیقی کاوشوں کو ادب کے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق شاعر علی شعر یہ کوئی منفعتی کام انجام نہیں دے رہے مگر وہ شاید یہ خسارہ اٹھا کر خوش ہیں مگر اس امر کی نشاندہی ہو رہی ہے کہ ابھی ایسے لوگ ہیں جو ادب کے لیے زندہ ہیں موجودہ حالات اور جدید تکنیکی دور میں کتب خریدنا اور کتب بینی کا شوق بہت کم ہوتا جارہا ہے ایسی صورت حال میں ان کا یہ کام بارآور تو ثابت ہوگا مگر ایسی صورت میں کہ تاریخ ادب ان کے نام کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گی۔

شاعر علی شاعر کے قائم کردہ ادبی وثقافتی ادارے ''رنگ ادب پبلی کیشنز'' کے زیر اہتمام ایک عرصے سے ادبی وشعراء کی نگارشات کو طباعت کے زیور سے آراستہ کرکے ادب کے دلدادہ قارئین کے ہاتھوں میں تک پہنچایا جارہا ہے اور یہ کاوش قبول عام کی سند بھی حاصل کرچکی ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ماضی اور عصرِ رواں کے شعراء کے مجموعہ کلام جو مارکیٹ سے نایاب ہوتے جارہے ہیں شاعر علی شاعر شبانہ روز محنت کرکے ان کو مجتمع کررہے ہیں' ان کو مکرر شائع کررہے ہیں بہت سے شعراء کی کلیات شائع کرچکے ہیں یہ ان کی بہت بڑی کاوش ہے تحقیق وتنقید کے حوالے سے بہت سی قابل قدر کتابیں شائع کرچکے ہیں جن میں بہت سے ادباء کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ جات بھی شامل ہیں یقیناً یہ اردو ادب کی اہم ترین خدمت ہے۔

شاعر علی شاعر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر غزل کے ساتھ نظم حمد نعت سلام' منقبت' ہائیکو' ترو ینی' ملی نغمات، بچوں کا ادب' نصابی تعلیم نیز افسانے اور ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے دنیائے شعروادب میں ایک اعلیٰ وارفع مقام کی جانب گامزن ہیں، ایک ہی بحر میں سو (۱۰۰) غزلیں کہنا کوئی آسان کام نہیں اس سفر میں اکثر شعراء مضامین غزل میں لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے یکسانیت کا شکار ہوجاتے ہیں اور بار بار ایک ہی خیال کو پیش کرتے ہوئے غزل کے حسن کو متاثر کر جاتے ہیں مگر شاعر علی شاعر کے یہاں ایسا نہیں ہے، وہ خود اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ لفظیات کا برمحل استعمال مناسب تشبیہات واستعارت کا استعمال' سادگی اور سلاست سے اپنا انداز سخن اس طرح رکھتے ہیں کہ یکسانیت اور تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔

شاعر علی شاعر کا یہی خاصہ ہے کہ وہ ان عیوب سے دامن کترا کر گزر جاتے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کی نگارشات ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں آپ کی شاعری میں سادگی اور زودگوئی کا عنصر نمایاں ہے۔ ملتان سے تعلق رکھنے کے حوالے سے آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی ملتا ہے شاعر علی شاعر کی شاعری اور فکر میں حزن ویاس بھی ہے' رنج وملال بھی ہے مگر وہ عصرِ دوراں سے مایوس نہیں ہیں بلکہ ایک روشن صبح کی امید لیے ہوئے ہیں:

جس میں ہونا ہے وصل اے گردش
وہ سہانی شام لے کے آ

☆

جانے کب وہ پلٹ کے آجائے
خود کو چوکھٹ پہ لائے بیٹھا ہوں

☆

مرے رفیق ! مرے ہم قدم بنو تو سہی
ملے گا نورِ سحر تھوڑی دور ساتھ چلو

شاعر علی شاعر کی شاعری میں خصوصی طور پر عصرِ رواں کی بے راہروی' انسانی اقدار کی شکستگی'

اخلاقی وتہذیبی اقدار کی بربادی، حسن وعشق کی روداد، ہجر ووصال کی باتیں، محبوب کی قربت، سرد راتوں کی فرقت، زلف ورخسار کی باتیں، حلاوت وشگفتگی جیسے مضامین شامل ہیں جو کہ روایتی منزل کی شان ہیں۔ جب آپ کسی حزن وملال کا ذکر کرتے ہیں تو بھرپور سوز وگداز اور پراثر اظہار یہ اپناتے ہیں اسی طرح جب آشوب کا ذکر کرتے ہیں تو آنکھ سے لہو ٹپکتا ہے اور دل کو تھامنا پڑتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کی فراوانی اور احساس اپنی شدت پر ہے۔ اور دردوغم کا اظہار مجازی نہیں حقیقی معلوم ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر علی شاعر کلاسیکیت و روایت سے جڑے ہوئے ہیں ان کے ہاں اردو غزل، مابعد جدید دور میں بھی ایک آہنگ کے ساتھ موجود ہے کہ عصری تقاضے بھی پورے پورے نظر آتے ہیں آپ نے اپنی غزلوں میں روایتی مضامین کے ساتھ سیاسی وسماجی مسائل کو بھی جگہ دی ہے ملاحظہ کیجیے شاعر علی شاعر کی شاعری کے رنگ:

دل جلانے میں جس کو آئے لطف
وہ ہی دیکھے گا انجمن کے رنگ
بارشیں، جام، یار کی قربت
کتنے پیارے ہیں یہ خمار کے دن
☆
جیتنے میں گیا تھا جس کا دھن
جمع پونجی بھی اس پہ وار آیا
☆
ہم کو معروف زمانے نے کیا ہے شاعر
ورنہ خواہش تھی کہ ہم یار میں گم ہو جائیں

شاعر نے اپنی زندگی میں بہت سی متضاد، منفی اور بے اعتبار تجربے کیے ہیں کہ یہ تجربات ایک متحرک انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اس سفر میں جبری ردوقبول کے سانحات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اگر ایک تخلیق کار کا اعتماد، اعتبار اور یقین اپنے وجدان سے متصادم ہوتا ہے تو اندھیرے، اجالے پسند ناپسند اور باطنی وظاہری قوتیں شعری سفر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ تجربہ

184

شاعر علی شاعر کے ہاں بھی ملتا ہے:

شعور و ہوش و خرد، عقل و دانش و افکار
یہی ہے زیست کا ڈھب اور ڈھب نہیں ہوتا
☆
کس قدر وہ پرسکوں ہے کر کے رسوا شہر میں
اب کسی انسان میں یارو بے حسی ایسی نہ ہو
میں ببولوں کو گل و لالہ کا کیسے دوں خطاب
آدمی نامعتبر کو معتبر کیسے کروں

جب ہم کلام غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسے اشعار سامنے آتے ہیں کہ عصرِ حاضر اور عصرِ رواں پہ صادق آتے ہیں جیسا کہ مرزا غالب کا یہ شعر تا قیامت اپنی اثر آفرینی برقرار رکھے گا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اور عصرِ رواں میں بشیر بدر کا شعر کرونا کے تناظر میں:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

عصرِ رواں میں شاعر علی شاعر کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے جو شاید انہوں نے اس عہد کے لیے کئی سال پہلے کہا تھا جو اب کرونا میں صادق آتا ہے:

ایسے حالاتِ نامساعد میں
خود کو رکھنا گھروں میں اچھا ہے

شاعر علی شاعر کی شاعری محبوب سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہے اسے ہم خود کلامی بھی کہہ سکتے ہیں یا اسے دل کی آواز بھی کہہ سکتے ہیں جو لاشعوری طور پر ادا ہو جاتی ہے جیسا کہ ذیل میں عیاں ہے:

بتاؤ اب کہاں لے جائیں خود کو
ہم اپنے آپ سے اُکتا گئے ہیں
☆

ہر اک رنجش بھلا دیں گے گلے مل کر محبت میں
فصیلیں سب گرائیں گے تمہارے واسطے جاناں

☆

تم کو بھولا نہیں ' یقین جانو
اب بھی دل میں دھڑک رہے ہو تم

شاعر علی شاعر کی شاعری میں محبوب کی پیکر تراشی یا محبوب کے ذکر کو بڑا دخل ہے وہ خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ ان کا محبوب ان کی سن بھی رہا ہے اور ان سے باتیں بھی کر رہا ہے یہاں یہ باتیں خواب میں ہوتی ہیں یا صرف خواہش کی حد تک اس کا جواب شاعر علی شاعر ہی دے سکتے ہیں بہر حال یہ اپنی بات کہنے اور پہنچانے کا ہنر جانتے ہیں۔ شاعر علی شاعر گو کہ غزل کے شاعر ہیں مگر سخن ہائے شاعری کی فہرست بہت طویل ہے' چیدہ چیدہ تصانیف درج ذیل ہیں۔

غزل میں بہار واب تو آ جاؤ' وہ چاند جیسا شخص' ترے پہلو میں' غزل پہلی محبت ہے' اعلانِ محبت' ہم کلامی' ایک بحر سو غزلیں' تقلید (احمد فراز کی زمینوں میں غزلیں) تر وینیاں اردو کے علاوہ پنجابی' سرائیکی' فارسی اور انگریزی زبانوں میں تر وینی کے تراجم۔ حمد و نعت کے حوالے سے ارمغانِ حمد' صاحبِ خیر کثیرؐ' الہام کی بارش' نور سے نور تک (کلیات حمد و نعت) صحافت کے میدان میں رنگ ادب پبلیکیشنز سہ ماہی رنگ ادب اور روز نامہ جرات کراچی کے ادبی صفحات اور ناول نگاری میں گہرا زخم' پانچ ناولٹ' جدید افسانے (کلیات افسانہ)' متعدد افسانے' قومی و ملی نغمے' بچوں کا ادب میں کثیر تصانیف۔ تعلیمی و نصابی کتب جبکہ لاتعداد مرتب کردہ نثری و شعری ادب عالمی رنگ ادب کے چھ سے زیادہ ادبی نمبرز غرض یہ کہ ایک لمبی فہرت ہے جو اس مختصر مضمون میں نہیں سما سکتی۔ شاعر علی شاعر نے حمد و نعت' سلام و منقبت' کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں نور سے نور تک (کلیات حمد و نعت) اس بات کا مظہر ہے

حمدیہ و نعتیہ اندازِ سخن:

ہیں تجھ سے التجائیں' سن لے میری دعائیں
اب تک نہ تیرے در پر شاعر نے حاضری دی
میں طوافِ خانہ کعبہ کروں امسال ہی
کوئی صورت ایسی پیدا تو کر پروردگار

نعت رنگ:

قرآن سے میں نے ہمیشہ نعت کے نکتے چُنے
میں نے سُنا اس نے کہا اچھے چُنے سچّے چُنے
اوصاف کروں کیا کیا سرکارؐ بیاں تیرے
ہر عطر سے بھی اچھی خوشبو ہے پسینے میں

رنگِ مناقب:

آپ یارِ غار ہیں اور جاں نثار مصطفیٰؐ
کم نہ جانے کوئی رُتبہ حضرتِ صدیقؓ کا
کئی انصاف کے قصے بہت مشہور ہیں ان کے
جہاں میں رتبہ اعلیٰ ہو گیا فاروق اعظمؓ کا
نیک لوگوں کے مناقب لکھنا میرا دین ہے
کیوں نہ لکھوں حق نما عثمان' عثمانؓ ہیں
حضرتِ شاعر کرو شیرِ خدا کی پیروی
راہ اُنؓ کی جو چلے منزل بنے' رہبر بنے
پیاسے ہوئے شہید جو مہمانِ کربلا
کوثر کا جام پا گئے جانانِ کربلا
کربلا میں سر جھکا کے سر کیے سب کے بلند
بس گئے قلب و نظر میں یہ ترے سجدے حسینؓ

ہائیکو کا رنگ'

کب ہے تو محدود
تیرا نور چمکتا ہے
ہر شے میں موجود

شاعر علی شاعر کا تر وینیاں دنیائے ادب میں تر وینی کا اوّلین مجموعہ ہے۔ تر وینی کا رنگ:

ایک کبوتر چھت پر میری
دانہ چگنے آ بیٹھا ہے
پیٹ کی خاطر جال نہ دیکھے

☆

کھڑکی کے شیشوں پہ اکثر
نام ہمارے لکھ دیتی ہے
ہلکی پھلکی بوندا باندی

☆

میری تزوینی کی خوشبو
پھیل رہی ہے گلشن گلشن
مالی سارے حیرت میں ہیں

شاعر علی شاعر کی شعری جہت کچھ زیادہ ہی وسیع ہے یہ شاعری میں نت نئے تجربات کرتے رہتے ہیں اور اپنے لیے نئی راہیں خود تلاش کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی طبع آزمائی وسخن اندازی پر کوئی چھاپ نہیں ہے یہی ان کی ہنرمندی ہے۔ ہم اس دور ترقی میں رہ رہے ہیں جہاں پر ایک عیب بھی ہنر میں شمار ہوتا ہے یہی ایک جینے کی راہ ہے اور عقل سے ماوراء اختراع۔ مگر یہ تجرباتی زندگی کی سچی تصویر ہے۔ جہاں پر لوگ زر و آسائش کی تلاش میں سرگراں ہیں وہاں یہ مرد قلندر ادب میں نت نئے زاویے تلاش کرتے نظر آتے ہیں شاعر علی شاعر نے اس شعری سفر میں کسی کی بھی نسبت کو پس پشت نہیں ڈالا بلکہ مفاد پرستی کو بالائے طاق رکھ کر ادب کی ترویج و اشاعت کو مقدم رکھا ہے ان کا یہ اقدام ایک شعوری فکر کا مرہون منت ہے جہاں ایک تخلیق کار اپنے تخلیقی وجدان میں کھو کر دوسروں یک لیے راہیں متعین کر جاتا ہے اور شاعر علی شاعر دوسروں کے لیے منزل کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مطابق ''شاعر علی شاعر نے اپنے افکار ونظریات سے اس عروس سخن کو سجانے اور سنوارنے کی حتی الوسع کاوش کی ہے'' جبکہ خیام العصر محسن اعظم محسن کے مطابق ''شاعر علی شاعر کے مشاہدے دور رس نظر آتے ہیں۔ وہ افتادہ خیالات کو بھی اپنے نادر اسلوبِ بیاں سے جان دار بنا دینے کے شاعرانہ ہنر سے واقف ہیں۔''

اعجاز رحمانی ''شاعر علی ایک زیرک، طبّاع اور زرخیز ذہن کے مالک ہیں ان کے اب تک ۱۶ شعری مجموعہ ہائے کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر نہ صرف جلوہ گر ہو چکے ہیں

بلکہ قارئین شعر وسخن ناقدین فن و ہنر اور شائقین اردو ادب سے داد وتحسین بھی وصول کر چکے ہیں''

پروفیسر شبنم صدیقی کے مطابق ''شاعر علی شاعر کے کلام میں یہ علامت بڑی خوش آئند ہے کہ انہوں احساس آفرینی اور کیفیت آفرینی کو اصل شاعری سمجھا ہے اور مضمون آفرینی کی حد سے بڑھتے ہوئے بکھیڑوں سے اپنی شاعرانہ توانائیوں کو ضائع نہیں کیا'' نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہنے والے شاعر علی شاعر نے اپنی شعری پگڈنڈی کو مختلف اصناف سے سجاتے ہوئے نئے امکانات کو تلاش کیا ہے اور ان کے ارتقائی سفر نے اب ایک شناخت بنالی ہے جسے ہم سفری زندگی کا ایک نیا صاحبِ اسلوب شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ امید ہے شاعر علی شاعر اپنے شعری سفر کی رفتار کو مزید تیز رکھیں گے اور نت نئے تجربات جاری رکھیں گے۔ بلاشبہ شاعر علی شاعر کا رنگ ادب اردو ادب کے لیے ایک عالمی ادب کا روشن ستارہ قرار پائے گا۔

☆...... ڈاکٹر نزہت عباسی (۲۷ جون ۱۹۷۱ء)

نزہت عباسی، ڈاکٹر ۲۷ جون ۱۹۷۱ء کو ایک علمی وادبی خاندان میں محمد حسین عباسی (ظفر انجمی) کے گھر کراچی میں پیدا ہوئیں۔ نزہت عباسی کو بچپن سے ہی علمی وادبی گہوارہ میسر آیا وہ ابتدا ہی سے شعر وسخن کے ماحول میں پلی بڑھیں اس ماحول نے ان کی صلاحیتوں کو نکھارا جو آگے چل کر تحقیقی و تخلیقی مزاج میں ڈھلتا چلا گیا اور نزہت کا یہ تحقیقی و تخلیقی سفر سکوت (۲۰۰۰) وقت کی دستک (۲۰۱۵ء) اردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب ولہجہ (پی ایچ ڈی کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ) اور نسخہ ہائے فکر (تنقیدی مضامین) ۲۰۱۹ء کی صورت میں اردو ادب کے عالمی افق پر اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔ نزہت کی شاعری میں روایت کی پاسداری ہے وہ عصرِ دوراں کے تقاضوں کے مطابق لفظیات، تشبیہات، واستعارات کا برمحل استعمال کرتی ہیں جس سے معنویت کھل کر سامنے آتی ہے وہ جو بات کہنا چاہتی ہیں سادگی سے کہہ جاتی ہیں بقول ڈاکٹر شاداب احسانی ''مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر نزہت عباسی اکیسویں صدی کی اہم شاعرہ ہیں ان کی شاعری میں کسی شاعرہ کا عکس نہیں پایا جاتا بلکہ وہ خود کو کھوجنے کے عمل سے گذرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہیں۔'' میری رائے میں ڈاکٹر شاداب احسانی کی یہ رائے ایک سند کا درجہ رکھی

ہے۔نزہت عباسی کا اندازِ سخن نہایت سہل اور عام فہم ہے بڑی سے بڑی بات کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ذیل کے اشعار میں ان کا رنگ سہل ممتنع ملاحظہ کیجیے:

علم، ہنر اور فن تو اب متروک ہوئے
کھوٹے سکے چلتے ہیں بازاروں میں

☆

تجھ کو جب اعتبار ہی نہ رہا
ہر گھڑی میں کروں وضاحت کیا

☆

اس نے نظریں کیا پھیریں
شب بھر آنکھ میں الجھا خوف

ذیل میں نزہت عباسی کا اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے جس سے ان کے بیان کا سماجی پہلو اور دھیما پن نظر آئے گا جو عام فہم بھی ہے اور اثر انگیز بھی:

ہماری سادہ دلی تھی تمہاری بات نہیں
ہمیں میں کوئی کمی تھی تمہاری بات نہیں
کبھی برسوں گذرنے پر کہیں بھی کچھ نہیں ہوتا
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لمحے مار دیتے ہیں

☆

گھر کی آگ میں راکھ ہوئے خواب، محبت، خوشیاں، دکھ
ہم بھی اس میں چھوڑ آئے اپنا سامان جلتا سب
سچ بھی کہنے سے اب نہیں ڈرتی
اتنی بے باک ہوگئی ہوں میں
لایا تھا جن کو صدیوں کی گردش کے بعد تو
اے وقت ہم نے لوگ وہ کمیاب کھودیئے

☆

خلش دل میں کوئی باقی ہے اب تک
کہ آنکھوں میں نمی سی رہ گئی ہے

☆

در تو کھلے ہوئے ہیں نہ مہماں نہ میزباں
گھبرا کے سوچتی ہوں کدھر جاؤں کیا کروں

پروفیسر سحر انصاری کی رائے میں ڈاکٹر نزہت عباسی نے بہت مستقل مزاجی اور ادبی رغبت کے ساتھ اپنا سفر طے کیا ہے اور یہ بڑی خوش دلی کے ساتھ جاری ہے، وہ ادبی سماجیات کو بھی پیش نظر رکھتی ہیں۔شائستگی اور احساس کی ندرت کے ساتھ اپنی شاعری کو نکھارتی جارہی ہیں بے شک نکھارتی جارہیں اور عالمی شعری افق پر چھاتی جارہی ہیں۔

☆...... سرور جاوید (۲۲ فروری ۱۹۴۷ء تا ۱۲ جون ۲۰۲۰ء)

سرور جاوید ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو سید ندیم برنی بلند شہر دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کی طبع آزمائی اور اندازِ سخن دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرور جاوید پیدائشی ادیب شاعر اور نقاد تھے۔عصرِ حاضر میں پر معنی اور سادگی سے شعر کہنے والے سرور جاوید کا انتقادیات میں بھی اہم مقام ہے۔وہ تنقید نگاری کے میدان میں اصولوں کو مقدم رکھتے تھے ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کی تنقید پر مکمل گرفت تھی کھرے اور سچے لکھاری تھے مصلحت آمیز رویہ نہیں رکھتے تھے، بات دو ٹوک کرتے تھے۔دوستی، تعلق داری کی پروا کیے بغیر اپنی رائے کا اظہار کھل کر کرتے تھے، نظریاتی طور پر این ایس ایف سے وابستگی رہی اور فکری اعتبار سے ترقی پسند تحریک کے ساتھی صرف ساتھی نہیں اصلاحی ساتھی جو کہ ''ترقی پسند ادب کے تقاضے'' میں عیاں ہے اس سوچ اور فکر کو سرور کے مزاج کی وحشت اور شخصیت میں منفی جنوں سازی کے شور سے تشبیہ دی گئی ہے۔سرور جاوید لکھتے ہیں کہ ''میں شعری اظہار کو فن کی طرح برتنے کا داعی ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ شعری جمالیات سے مزین شاعری جو فکر کی سطح پر بھی بلند ہوگی کبھی پرانی نہیں ہوسکتی''

سرور جاوید کی شاعری کا اپنا اسلوب ہے منفرد انداز جس میں تازگی جھلکتی ہے نہ کہ کسی شاعر کی تقلید۔ سلسلہ معاش میں صحافت اور درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے

وہ جس کی خاطر رفاقتوں کا جہان چھوڑا تھا میں نے یارو
دیارِ نو میں پہنچ کے میں نے اسے پکارا تو وہ نہیں تھا

اب آ گیا ہوں ترے پاس ہاتھ خالی ہیں
چلا تھا تیری طرف کائنات ساتھ لیے

تمہارے ساتھ سکھ کی منزلوں پہ ہم نہ ہوں گے
کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خسارا دیکھنا تھا

میں لوحِ دل پر لکھا فسانہ تلاش کرتے
تمہارے پاس آ گیا زمانہ تلاش کرتے

میں بھی اس دورِ خرابی کا نمائندہ ہوں
مجھ کو بھی صاحبِ کردار نہ سمجھا جائے

کون خیال وخواب کی خاطر ساری عمر گنوا سکتا ہے
مجھ کو دیکھو اور یہ سمجھو عشق کہاں تک جا سکتا ہے

میں بجھ بھی جاؤں تو کیا ہے کہ میری نظروں میں
بچھڑ کر اس سے عروج و زوال کچھ بھی نہیں

جسم کو روح کا آزار نہ سمجھا جائے
عشق کو جذبۂ بے کار نہ سمجھا جائے

ہے میرا عہد خود اپنے شجر سے یہ رشتہ
یہ راز آج کھلا ہے کہ بے نسب میں ہوں

آپ کے ادبی اثاثہ جات میں ہجر کے آدمی ہیں ہم' متاعِ نظر' اردو نظم کی عظیم روایت اور خواب بدل گئے میرے' شامل ہیں۔ سرور جاوید زندگی کے سفر میں مصائب آلام اور دکھوں کو سمیٹنے کا ہنر

جانتے تھے۔ آپ ۱۲ جون ۲۰۲۰ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

☆...... فیروز ناطق خسرو (۱۹ نومبر ۱۹۴۴ء)

تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بدایوں اپنی خصوصیات کے حوالے سے ایک مردم خیز خطہ ہے' جس نے تحریکِ آزادی کے مجاہدین' سرفروشانِ اسلام علمائے حق اور شاعر و ادیب پیدا کیے۔ خسرو پاشا نے جسے دنیائے ادب فیروز ناطق خسرو کے نام سے جانتی ہے ۱۹ نومبر ۱۹۴۴ء کو بدایوں میں ابوالحسنین ناطق بدایونی کے گھر جنم لیا' آپ کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے' آپ کے والد ابوالحسنین ناطق بدایونی دادا غلام حسنین میر بدایونی نانا حکیم راحت علی خان حاذق امروہوی اور تایا علامہ وامق بدایونی' حیدرآباد دکن کا شمار صاحبِ فہم و فراست اور سخن ورانِ بدایوں میں ہوتا ہے' جس شخص کو ایسا علمی و ادبی گہوارہ میسر آیا ہو وہ لفظوں کی جادوگری سے کیسے دور رہ سکتا ہے' لہٰذا خسرو پاشا سے فیروز ناطق خسرو کا سفر آپ کے سامنے ہے۔ سعادت مند فرزندوں نے والدِ محترم حضرت ناطق بدایونی کے کلام کو طباعت کے زیور سے آراستہ کر کے ادب کے افق پر امر کر دیا جو اس وقت انتخابِ کلامِ ناطق بدایونی کے عنوان سے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ قیامِ پاکستان کے نتیجے میں پہلی ہجرت بدایوں سے خیر پور میرس پاکستان کے لیے کی' فیروز خسرو نے اپنے بچپن میں ہی شعر موزوں کرنا شروع کر دئے تھے اور آج ماشاءاللہ اساتذہ کی صف میں ایک تناور درخت کی مانند ادبی میدان میں گہری چھاؤں لیے ہوئے ہیں۔ ادب کی سرپرستی' ادب دوستی اور ادب نوازی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ آپ نے ایم اے اردو۔ ایم اے اسلامک ہسٹری اور پاکستان ائیر فورس کی ملازمت کے دوران بی ایس سی (واراسٹڈیز) کیا ہے۔ پاکستان ائیر فورس میں اسکواڈرن لیڈر کی حیثیت سے فرائض کی انجام دہی کی اور ۱۹۹۹ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مختلف تعلیمی اداروں میں بطور پرنسپل اور ایڈمنسٹریٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ ادبی حوالے سے ہر ایک ادبی تنظیم سے تعاون فرماتے ہیں جبکہ بزم ناطق بدایونی کے تحت ادبی تقریبات و ماہانہ ادبی/شعری نشست بھی برپا کرتے ہیں۔ شعری حوالے

سے کسی کو با قاعدہ استاد نہیں مانتے ہاں البتہ والد محترم ناطق بدایونی کو رہبر مانتے ہیں۔ پہلا شعر جو موزوں کیا وہ ذیل کا ہے:

فضا میں یہ اڑتے پرندوں کے جھنڈ
کتنے آزاد ہیں کتنے مختار ہیں

فیروز ناطق خسرو نے اپنے والد سے جو مشورہ سخن کیا اسے ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے۔

حضرتِ ناطق سے لیتا ہوں میں اصلاحِ سخن
میں کہ ہوں فیروز خسرو ان کا ایک ادنیٰ غلام

فیروز خسرو نے اپنی شعری نگارشات تخلیق کر کے اپنے علمی و ادبی خانوادے سے جڑے رہنے کا ثبوت دیا ہے آپ کے شعری اثاثہ جات میں ۱۔انتخاب کلام ناطق (۲۰۱۰ء) ۲۔طلسم مٹی کا، غزلیہ مجموعہ (۲۰۱۶) ۳۔آنکھ کی تپلی میں زندہ عکس۔نظمیں (۲۰۱۷) ۴۔ستارے توڑ لائے ہیں نظمیں (۲۰۱۷ء) ۵۔آئینہ چہرہ ڈھونڈتا ہے۔غزلیں (۲۰۱۷) ۶۔فرصت یک نفس۔قطعات (۲۰۱۷) ۷۔ہزار آئینہ۔حمد نعت و منقبت (۲۰۱۷ء) ۸۔کند قلم کی چبھن، تبصرے مضامین، افسانے (۲۰۱۷ء) فیروز خسرو کی نگارشات زمانے کی نظروں سے نہاں تھیں شاید یہ مسلسل مصروفیت کی وجہ سے ممکن نہیں تھا کہ وہ تخلیقات کو شائع کرتے مگر سال ۲۰۱۷ء ان نگارشات کا منظر عام پر آنے کا سال ہے اس سال ان کی چھ تصانیف منظر عام پر آئیں۔

فیروز ناطق خسرو کی شاعری، غزل، نظم، قطعات، حمد، نعت، سلام، مناقب پر مشتمل ہے۔ ان کے انداز سخن میں ایک فکر، ایک امنگ ہے جو روایتی پہلے سے دوستی رکھتے ہوئے جدیدیت کے دور میں اپنا اثر دکھا رہی ہے وہ اپنی سچائی کو بے اعتمادی کی فضا سے دور رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسرت و یاس، فریادی لہجہ نہیں ہے وہ اعتماد سے بات کرتے ہیں اور ہر وقت امید، روشنی، عطا کا دامن تھامے نظر آتے ہیں۔ مفروضات کے بجائے حقیقت پسند ہیں اور زندگی کے آئینے کو گرد آلود ہونے سے بچاتے ہوئے ہر لمحہ آئینے کی جانب اپنی توجہ مبذول رکھتے ہیں کہ یہ خود احتسابی کے لیے بہت ضروری ہے۔ فیروز ناطق خسرو اپنی شاعری میں سماجی معاشرتی،

کائناتی موضوعات کو زیرِ سخن لائے ہیں۔ نیچرل شاعری کی طرف توجہ دی ہے۔ لفظ و بیان کو اہمیت دی ہے۔ اپنی فکر و عمل کو متصادم ہونے سے بچایا ہے۔ ماحولیاتی گھٹن، ذاتی تجربات، خوش رنگ موسم کا انداز، شعری لہجے میں غنائیت و چاشنی لیے ہوئے، ان کی شاعری میں جو تجربات، مشاہدات بیان کیے گئے ہیں، وہ ان کے شعوری جذبوں کی آواز ہے، آگہی کا ہنر ہے۔ ذیل کے اشعار میں فیروز ناطق خسرو کا اندازِ سخن ملاحظہ کیجیے۔

ربِ کائنات کے حضور:

جو چاہے جس کو چاہے عطا جس طرح کرے
تُو جانتا ہے کب کسے، کس طرح کیا ملے
لکھی جو حمد، چشمِ بصیرت ملی مجھے
محسوس یہ ہوا کہ یہ دل جامِ جم ہوا

نعتیہ اشعار:

توہین گوارا نہیں محبوبِ خدا کی
تعظیم سے لیتا ہے خدا نامِ محمدؐ
ایک نام جو بن جائے شفاعت کا وسیلہ
اندر سے مِرے آئی صدا نامِ محمدؐ

مناقب و سلام:

ہر ذرہ دشتِ ریگ بلا کا ہے آئینہ
ہر آئینے میں ضم ہیں بہتّر کے آئینے
بدر و حنین و خیبر و خندق ہو یا احد
مولا علی ولی تھے نیابت کے واسطے
کربلا کا ہے مدینے سے سفر اب درپیش
دیکھ اپنے لیے خسرو، مِرے غمخوار جگہ

فیروز ناطق خسرو کی شاعری میں انسانی جذبوں، امید اور خواب، ذاتی تجربات، سچائی اور کھرے جذبات، انسانی رشتے، ناتے اور ان کی سچائی ایک خوبصورت تراش میں ملتی ہے۔

سمٹا ہوا تھا حسن بھی کل اپنے روبرو
شرما رہا تھا خود بھی شبِ وصل آئینہ

میں مر بھی جاؤں تو زندہ رہے گا میرا سخن
زبانِ خلق کرے گی کلام دیکھنا تم

جو شخص ڈوب رہا ہے اسے بھی غور سے سن
گہر ہے اس کا ہر لفظ، بات دریا ہے

قلم سے، انگلیوں سے، نوکِ مژگاں کے حوالے سے
جو سچ ہے میں اسے ہر حال میں تحریر کرتا ہوں

بند ہیں اپنے دل کے دروازے
آج بھی گھر کی بات گھر میں ہے

کیا کہیں دور ہے یہ کرامات ہے
راہزن تھے ابھی راہ نما بن گئے

جستجوئے حیات میں خسرو
ایک لمحہ صدی برابر ہے

اترتی جارہی ہے رات کالی
گھنا رستے میں جنگل آرہا ہے

کیا خبر تھی کہ بدل جائے گا اک دن سب کچھ
میکدہ ہے نہ وہ ساقی نہ وہ ساغر نہ سبو

ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

قانون ہے دنیا کا برسوں سے مرے پیارو!
ہو ذات اگر اونچی، کم ذات نہیں ٹھہری

دہلیز پہ جس در کی غربت نے قدم رکھا
اس در پہ کسی بیٹی کی بارات نہیں ٹھہری

فیروز ناطق خسرو کی نظموں میں فطرت کے مناظر کی عکاسی، سماجی رویے، عصرِ رواں کے موضوعات، بے ساختگی نمایاں ہے اور ان موضوعات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ مسلم شمیم کہتے ہیں ''خسرو کی نظموں میں اسلوب کی تازہ کاری کے ساتھ ہم عصر زندگی کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اس مجموعے کا کینوس بہت وسیع اور متنوع ہے۔ یہ مجموعہ تمام تر فنی محاسن اور شعری جمالیات جلو میں لیے اپنے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔'' بلاشبہ فیروز خسرو معنویت اور سچائی کے ترجمان ہیں۔

☆...... نثار ترابی (۱۰/اکتوبر ۱۹۶۱ء)

اردو شاعری کے حوالے سے عام تاثر لکھنؤ، دہلی، لاہور کا ملتا ہے مگر ماضی کے کیمبل پور اور عصرِ حاضر میں اٹک سے تعلق رکھنے والے نثار ترابی نے ادبی سرمایہ میں اپنا حصہ ایک ایسے علاقے سے ڈالا ہے جو دشوار گزار، سنگلاخ علاقوں پر مشتمل ہے۔ اردو ادب کا یہ روشن ستارہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو مورگاہ راولپنڈی میں غلام مصطفیٰ کے گھر پیدا ہوئے آپ کے والدین کا تعلق اٹک سے ہے۔ آپ کی طبع آزمائی اردو کے ساتھ پنجابی زبان میں بھی ہے آپ ماہرِ تعلیم، شاعر، نقاد اور محقق ہیں آپ کے تحقیقی موضوعات ''حضرت شاہ مراد خانپوری۔ حیات و فن''، ایم فل کے لیے جبکہ ''اردو غزل کے عصری رویے'' پی ایچ ڈی کے لیے ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ نثار ترابی پاکستان ٹیلی ویژن کے میزبان اور کمپیئر بھی رہے آپ کو شعری و ادبی خدمات کے حوالے سے گولڈن جوبلی ایوارڈ، وارث شاہ ایوارڈ، نوائے سحر اور چکوال شاہ مراد کلچرل سوسائٹی ایوارڈ (شعبہ تحقیق) سے نوازا گیا ہے۔ جاذب قریشی کی رائے کے مطابق ''نثار ترابی کی ذات میں علمی و ذاتی تجرباتی و تخلیقی پہچان کے حوالے سے وہ بہت کچھ موجود ہے جو کسی اہم شخص کو پہلا اعتماد دیتا ہے۔ انسانی احترام اور حوصلہ مند سچائیوں کے ساتھ اعلیٰ اقدار کا اجلا پن اس کے مزاج کے بنیادی رنگوں میں شامل ہے۔ نثار ترابی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کے اندازِ سخن میں کلاسیکی روایت کے ساتھ عصرِ حاضر کی جدیدیت نمایاں ہے۔

بچھڑ کے جیسے دوبارہ بھی آ ملا ہوں اسے
کچھ اس ادا سے مجھے زندگی نے دیکھا ہے
تم نے دیکھا نہیں کردار ہوا کا شاید
پل میں خوشبو کو یہ آوارہ بنادیتی ہے
یوں دیکھنے کو جہاں میں کہاں نہیں ہیں ہم
جہاں پہ ہونا تھا ہم کو وہاں نہیں ہیں ہم
ہوا کی کوئی بھی سازش بجھا نہیں سکتی
چراغ جلنے پہ آئے تو جل بھی سکتا ہے
ہم اپنے نام کی منزل تلاش کرلیں گے
قدم بھی ساتھ ہیں اور راستہ بھی رکھتے ہیں
رائگاں اک پل بھی میرا یہ سفر ہونے نہ دے
وہ اگر چاہے تو مجھ کو در بدر ہونے نہ دے

بلاشبہ نثار ترابی ایک عزم اور ایک جرات کے شاعر ہیں وہ جو کہتے ہیں اپنے پورے پن سے کہتے ہیں اور انہیں اپنی جنم بھومی وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے یہ پہچان ان کے کھرے پن کی ہے۔

''نثار ترابی اپنی غزل کے ساتھ نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں'' (جاذب قریشی)

☆...... الحاج نجمی (۱۱راگست ۱۹۵۵ء)

الحاج نجمی کا پورا نام محمد ناظم الدین ولد محمد فصیح الدین ہے۔ آپ ۱۱ راگست ۱۹۵۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئے شاعری سے شغف بچپن ہی سے ہے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اسکول میگزین ماہنامہ کرن کے چیف ایڈیٹر اور چیف پریفکیٹ رہے' غیر نصابی سرگرمیوں بشمول تقاریر' مضمون نگاری' ٹیبل ٹینس' فٹبال اور باکسنگ میں سند یافتہ ہیں اسکول کی تقاریب کی نظامت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک سید طاہر حسین رضوی کے اخبار ہفت روزہ الطاہر کراچی میں سب ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے۔ آپ دو صفحات قلمی دوستی اور جیون ساتھی کے انچارج تھے۔ سلسلۂ معاش میں پاکستان ائیر فورس سے بھی وابستہ رہے اور سعودی عربیہ میں بھی خدمات انجام دیں۔ شہرِ کراچی کے ادبی منظر نامے کے ایک فعال شاعر ہیں علمِ عروض

191

پر خاص دسترس ہے زود گو شاعر ہیں۔ ایک جرات منداور بیباک انداز اپنایا ہے جس کا ذیل کے شعر میں نمایاں اظہار ہے:

جو اپنی ذات میں ایک انجمن سجاتا ہو
وہ آئے آپ کے دربار میں ہو نہیں سکتا
جو بات دل میں ہو کہنا ہے برملا نجمی
پھر اپنی بات سے انکار ہو نہیں سکتا

اپنے دوستوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ''سچے دوست ناراض تو ہوتے ہیں مگر نہ کبھی رشتہ ختم کرتے ہیں اور نہ نقصان پہنچاتے ہیں'' یہ تحریر ایک مثبت اور تعمیری سوچ کی عکاس ہے پاسبان دبستانِ کراچی کے بانی و سرپرست ہیں' آپ کی شاعری میں سلاست و روانی کے ساتھ روایتی اور خطیبانہ انداز ملتا ہے تشبیہ و استعارت کا استعمال احسن طریقے سے کرتے ہیں۔ غزل کے شاعر ہیں حسن' عشق' جمال۔ ملی شاعری' مزاحمتی شاعری میں کھل کر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو سامنے بٹھا کر شاعری کر رہے ہوں اور محبوب ابھی بول پڑے گا الحاج نجمی کا اندازِ سخن:

زُلفوں کا حسیں بادل شانوں پہ مچلتا ہے
بانہوں میں اسے اپنی لے لوں جو اجازت ہو
☆
اڑتا ہوا آنچل وہ نگاہوں میں تغافل
بے تابی دل' شوخی لب سب وہ کہاں ہیں
☆
کب دیکھ سکا وہ مرے ہمزاد کی صورت
سورج نے ہر اک سمت سے کوشش تو بہت کی
☆
غضب کا درد میں ڈوبا ہوا جھناکا ہے
کوئی ہے جام گرا چھوٹ کر مرے دل میں

الحاج نجمی غزل۔نظم۔قطعات۔حمد۔نعت۔سلام ومنقبت پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

نام نجمی ہے مگر ذات میں اک سورج ہوں
میں یہاں ڈوب کے اُبھروں گا نئی دنیا میں

☆...... حامد علی سید

حامد علی سیّد نام ٗحامدؔ تخلص اور قلمی نام حامد علی سید ہے۔۳ ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو لیاقت آباد کراچی میں پیدا ہوئے۔والد گرامی کا نام عبدالحفیظ ہے جو پاکستان پوسٹ میں ملازمت کرتے تھے۔حامد علی سید 'سن کوٹا' پر پاکستان پوسٹ میں ملازم ہوئے۔(۱۵۷)۔ڈرامہ،موسیقی،شاعری،تقریری مقابلوں اور مضمون نویسی سے شغف رکھتے ہیں۔عصرِ رواں میں کراچی ادبی منظر نامے کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔۱۹۷۴ء سے ''سائبان اکیڈمی'' کے مشاعروں سے شاعری کا آغاز کیا۔پہلا شعری مجموعہ ''اُبھرتا ڈوبتا سورج'' ۱۹۹۶ء اور دوسرا شعری مجموعہ ''شکستہ آئینہ خانے'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔نعتیہ مجموعہ' روشنی کو چراغ لکھا ہے' جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔'محراب' حمد،نعت سلام ومنقبت (۲۰۲۲ء) رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی نے شائع کیا۔حامد علی سید کلاسیکی ادب کے ساتھ جدیدیت اور جدید اسلوب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہیں لہٰذا شعروں میں مزاحمتی رنگ بھی جھلکتا ہے۔دھیمے لہجے کے شاعر ہیں۔نمونہ کلام:

حیات،جہدِ مسلسل ہے اُن کو کیا معلوم
سمٹ کے بیٹھ گئے ہیں جو خانقاہوں میں
گھر سے نکلے تھے بیچنے، اخبار
بچے تختی، کتاب کیا لاتے
میں نے آواز اُٹھائی ہے جہالت کے خلاف
تم بھی ہر حال میں قائم یہ روایت رکھنا
گھر سے نکلیں بھی تو کہاں جائیں
ہرطرف خون ہے جہاں جائیں

☆......کنور ممتاز علی خان ممتاز برنیؔ

ہندوستان کے زمیندار راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔اپنی سکونت پذیر ضلع بلند شہر کے موضع نرائن پور چونڈہ مہرہ کہا کرتے تھے اور یہی اپنے بارے میں اپنے مجموعہ غزل میں رقم کیا ہے۔درس نظامیہ کے تحت اور دیگر علوم میں ہدایہ تک تعلیم پائی دان پور ضلع بلند شہر کے مدرسے وزیر العلوم سے۔پھر میرٹھ اندرکوٹ مدرسہ اسلامیہ میں زیرِ تعلیم رہ کر الہٰ آباد یونیورسٹی سے عالم کی سند حاصل کی۔عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔پاکستان ہجرت کر کے کراچی میں رہے۔سعود آباد ملیر ہی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

کنور ممتاز انتہائی زود گو' غزل کی روایت کے تازہ کار شاعر تھے تقسیم ہند سے قبل کا بیشتر کلام ہجرت اور ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔سال ۸۸۔۱۹۸۹ء میں غالباً طباعت کے لیے ''فانوسِ غزل'' کے نام سے غزلوں کا مجموعہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔کنور ممتاز برنی سیدھے سادے' کسی ادبی حلقے اور لابی سے دور رہنے والے شاعر تھے جو نام ونمود اور شہرت کے حصول میں کبھی بھی آگے نہیں بڑھے۔غزل میں جذبات واحساسات کا اظہار و بیان اور اثر پذیری، معاملاتِ قلبی اور عشقیہ مضامین کی دل آفرینی اپنا ہی ایک رنگ اور لطف رکھتی ہے اور کنور ممتاز برنی کے کلام میں اردو غزل کا حقیقی رنگ اور مزاج پوری آب وتاب کے ساتھ ملتا ہے۔

ذیل میں ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کچھ تو غموں کی دھوپ نے جھلسا دیئے بدن
کچھ ہم کو انقلاب نے بھی در بدر کیا

☆

روتے روتے زندگی کی شب کٹی
رات کے جاگے ہوئے تھے سو گئے

☆

یہاں کوئی اپنا بھی نہیں
یہ محشر ہے کس سے کہیں حال ہم

☆

بیچ ڈالیں نہ گلستاں کا گلستاں سارا
گل فروشوں کے لیے فصلِ بہار آئی ہے

☆

بستیاں جو چھوڑ آئے انقلاب آنے کے بعد
یاد کرتے ہیں انہیں صحرا میں دیوانے بہت

☆

اس جوانی پہ گزرتا ہے قیامت کا گماں
جس میں شامل ہو کسی شوخ کی انگڑائی بھی

☆

سب یہاں مرے آنے کا پوچھتے کیا ہو
ادھر سے گزرا تھا سوچا سلام کرتا چلوں

☆.....تنویر سخن (تاریخ پیدائش......۲۹مئی ۲۰۲۱ء)

تنویر حسین سخؔن کا قلمی نام تنویر سخن ہے۔والد کا نام محمد یاسین خان (مرحوم) دہلی سے تعلق ہے،آ با کا تعلق افغانستان سے ہے شیرانی پٹھان۔ والدہ میرٹھ سے جائے پیدائش بدین اور جملہ تعلیمی استعداد بدین سے ہی حاصل شدہ ہے بی کام۔ایل ایل بی، ماسٹرز اسلامی کلچر اور اکنامکس میں۔

کتب بینی اور شعر و ادب سے دلچسپی ساتویں کلاس سے رہی میٹرک میں پہلا شعر کہا

ان سے جب بھی نظر ملائی ہے
اک نئی چوٹ دل پہ کھائی ہے

اسلامیہ کالج بدین میں ''بزم ادب'' کی بنیاد رکھی پرنسپل خالد وہاب کی سربراہی میں جس کے

صدر لیکچر (اردو) عبدالرشید نسیم اور جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ہر جمعرات کو آخری پیریڈ میں تنقیدی نشستوں کا اہتمام کیا۔شہر بدین میں بزم علم و ادب کی اور ہر ماہ باقاعدگی سے شعری نشستیں اور سندھی، اردو مشاعروں کا انعقاد سال ۱۹۳۲ء سے ۱۹۸۷ء تک جاری رکھا۔حیدر آباد سے نکلنے والے ادبی رسالے ''نئی قدریں'' جو کہ اختر انصاری جاری کرتے تھے اس میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔۱۹۸۳ء میں کراچی ملازمت کی غرض سے سکونت اختیار کر لی کمرشل آڈٹ میں بہ حیثیت سینئر آڈیٹر' جو تا حال جاری ہے۔بدین میں ذاتی کوششوں سے ''مکتبہ اسلامیہ دارالحکمت بدین'' کے نام سے لائبریری قائم کی جو کراچی آنے سے قبل ڈاکٹر عبدالحفیظ سموں کے حوالے کی۔مطالعہ کے شوق نے اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد کو ساڑھے چار ہزار تک پہنچا دیا۔شاعری میں لیلائے غزل نے اسیر زلف و عارض کیے رکھا۔کراچی کی مختلف ادبی تنظیموں اور ادبی محافل میں ایک تسلسل سے رابطے ہیں۔سوشل میڈیا پر ادبی تقریبات کی عکاسی اور رپورٹنگ کو ایک نئی جہت دی۔۱۹۹۰ء میں ''کارِ سخن'' کے عنوان سے مجموعہ کلام مرتب کیا مگر وسائل کی کمی کے سبب اشاعت کی جرأت نہ ہو سکی۔اور اب کچھ عرصہ سے ''تنہائی کے جنگل میں'' کے عنوان سے مجموعہ کلام اشاعت کی راہ تک رہا ہے مگر معاملہ پہلے جیسا ہی ہے۔

سخؔن کی غزلوں سے چند اشعار پیش خدمت ہیں

آئے گی مری یاد انہیں موسمِ گل میں
پوچھیں گے خردمندوں سے دیوانہ کہاں ہے

☆

میں یہ سمجھا مجھے پھولوں سے نوازا اس نے
اس کی جانب سے مری سمت جب آئے پتھر

☆

اک تُو خدا سے بھی بغاوت پہ تلی تھی
بزدل تھا زمانے سے بھی ٹکرا نہ سکا میں

☆

بڑھنے لگا اصرار مرے دستِ طلب کا
جب اس کی طرف سے ہوا انکار مسلسل

☆

نہ وقار کی ہے مجھے طلب نہ غرض ہے دولت و مال سے
جسے میں نے کھودیا اے سخن مجھے اس بھرم کی تلاش ہے

☆...... نظر فاطمی

نام سید نظر الدین احمد فاطمی، قلمی نام نظر فاطمی ۔ والد گرامی کا نام سید ذوالفقار احمد بخشی ہے۔آپ آٹھ نومبر انیس سوچوّن کو لیاقت آباد کراچی میں پیدا ہوئے۔گریجویشن کراچی سے کیا۔آپ کا شمار استاد اعجاز رحمانی کے تلمیذِ خاص کے طور پر ہوتا ہے۔سلسلہ معاش، گورنمنٹ رجسٹریشن آفس (نادرا) میں بیس سال ملازمت کی فی الوقت ایڈورٹائزنگ اور خطاطی سے وابستہ ہیں۔

شاعری میں لفظوں کا دروبست کا ہنر جانتے ہیں۔روایت سے جڑے ہوئے نئے قوافی کے متلاشی رہتے ہیں۔ایسے قوافی کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا کہ جنہیں لوگ بھول چکے ہیں۔

آپ کا اہم شعبہ نظامت بھی ہے ۔ بزم شمیم ادب، کھتری ادبی سوسائٹی ، انجمن بہارِ ادب، بزم تقدیس ادب، بزم قمر کراچی، انجمن بزم رضا، بزم یاران سخن کراچی، بسمل آرٹس کونسل اورانجمن تسکین ذوق کے مشاعروں کی نظامت کرتے رہے ہیں

نمونہ کلام:

اپنے چہرے پہ کبھی دکھ کو نہ کیجیے تحریر
وقت کے پاس نہ آنکھیں ہیں، نہ احساس، نہ دل

☆

ہمارے دم سے امیری فقط ہے اس گھر میں
ہمارے بعد یہ سُونا مکان ڈسے گا تمہیں

☆

نظر نظر میں تبسم دلوں میں پیار بسے
ہماری زیست رہے خلد آشنا ہر دم

☆

نظر جو حسن و محبت کا استعارہ ہے
نظر نظر سے ملاؤ، نظر کی بات کرو

☆...... نسیم شیخ

نسیم شیخ کا اصل نام نسیم احمد ہے تخلص ’’نسیم‘‘اور قلمی نام نسیم شیخ ہے والدِ گرامی کا نام محمد اختر تھا۔نسیم شیخ ۱۰ فروری ۱۹۶۵ء کو دادو میں پیدا ہوئے۔محکمہ تعلیم سندھ میں ملازمت کی، ادب کے سرپرست اوردلدادہ ہیں۔ زبان و بیان اورعروض پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔عروضِ شاعری پر مبنی گوہر نایاب ’’موجِ سخن‘‘شعری ریاضت پر دال ہے۔بچوں کے لیے ’’گلدستۂ نظم‘‘’انوارِ تجلّی‘ منتشر سوچیں‘ درد بولتا ہے۔موجِ نسیمی۔ ’’قصص الانبیاء‘‘۔’’کوثر کے والی‘‘۔چراغِ دل ’آوازِ دل‘بابِ رحمت، وحشتیں (غزلیں) اندھیرا اُجالا (سیاسی نغمے اور نظمیں)۔خودفریبی (غزلیات)، دیارِدل (غزلیات)، آہ سے واہ تک (غزلیات) ودیگر لاتعداد کتب منتظر اشاعت ہیں۔’کرونا‘ کے عہد میں بھی اُردو شاعری کے فروغ میں آن لائن مشاعرے کرتے رہے۔تادمِ تحریر مشاعروں کی تعداد پانچ سو سے زائد ہوچکی ہے۔نسیم شیخ نے اندرونِ سندھ دادو سے کراچی ہجرت کی اور ہجرت کے کرب سے بخوبی واقف ہیں۔والدین ہندوستان سے لُٹ پِٹ کر اور اپنے عزیزوں کی قربانی دے کر پاکستان پہنچے اور پھر کراچی ہجرت کی۔علاقائی نفرت وطبقاتی تعصب کے دُکھ۔فرزندِ زمین؟ نسیم شیخ اپنے وطن کی مٹی سے محبت کرتے ہیں اوراس محبت میں وہ پیکرِ خلوص

نظر آتے ہیں۔اندازِ سخن ملاحظہ ہو:

کچھ دیر کے لیے مجھے آنکھیں اُدھار دو
یہ دیکھنا ہے مجھ کو کہ مجھ میں کمی کیا ہے

☆

اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا جسے میں نے
ہائے قسمت وہ میرے خون کا پیاسا نکلا

☆

ہجرتوں کی بیڑیاں پیروں میں ڈالے زندگی
بس گھسیٹے جا رہی ہے جیسے میں سالار ہوں

☆

یہ ہجرتوں کی کہانی ہے سانس لینے دو
اِسے سنایا کہاں جائے گا روانی میں

ملک عرفان خانی،سرپرست عالمی ادب اکادمی لکھتے ہیں کہ

نسیم شیخ علم سے وابستہ ہے اور میں کہوں گا کہ ادب موجِ نسیمی سے وابستہ ہے اور موجِ نسیمی روایت،جدّت اور مابعد جدّت سے وابستہ ہے اور یہی وابستگی اس کو دوسرے شعراء سے جداگانہ سلوب پر استوار کرتی ہے۔

سعید الظفر صدیقی لکھتے ہیں کہ

نسیم شیخ اپنی شاعری بڑی دلبستگی اور وارفتگی کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں ۔ایسی شاعری وہی کر سکتا ہے جو جس میں زندگی کا صحیح شعور اور ادراک موجود ہو۔موصوف کے اندر ایک رجائیت پائی جاتی ہے اشعار میں لطیف جذبات کی چاشنی بھی کم نہیں۔لگتا ہے دماغ سے نہیں دل سے شعر کہنے کے عادی ہیں......

علمِ عروض پر ان کی دسترس اور اس سے ملحق دیگر موشگافیوں سے واقفیت نے ان کے اشعار کو شاعری کے حقیقی رنگ سے مزین کر دیا ہے۔

نئے موضوعات اور سادہ لفظیات کو اپنی ندرتِ فکر سے سنوار کر پیش کرنے کا ہنر نسیم شیخ کے ہاں کثرت سے ملتا ہے۔ہجرت،ناہمواری اور معاشرتی کشمکش نے نسیم شیخ کی شاعری نے کچھ زیادہ جگہ بنائی ہے۔

☆......☆